خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

کہنی سُننی

ہمارے نام

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

ناول

افسانے

حمیدہ بانو نے جاوید پریس سے چھپوا کر شائع کیا

سچی کہانیاں

میں کبھی نہ بھولوں گی

رنگا رنگ پھول

خواتین کی محفل

نظمیں غزلیں

میری بیاض سے

نفسیات

بیوٹی بکس

پتہ: خواتین ڈائجسٹ
اردو بازار کراچی

کہنی سُنی

بہنوں کی خدمت میں خواتین ڈائجسٹ کے آٹھویں سال کا پہلا شمارہ پیش خدمت ہے۔
اس سے پہلا شمارہ ساتواں سالگرہ نمبر تھا۔ اس سالگرہ نمبر میں ملک کی مشہور و معروف ادیب بہنوں کے افسانوں کہانیوں کے ساتھ ساتھ نئی لکھنے والی بہنوں کے افسانے بھی تھے۔ خواتین ڈائجسٹ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے بے شمار نئی لکھنے والی بہنوں کو متعارف کرایا۔ اور پرانی لکھنے والی بہنوں سے زیادہ سے زیادہ لکھوا کر بہنوں تک پہنچایا۔
سالگرہ نمبر میں ۲۱۔ افسانے تھے جن میں ۱۹ کو منتخب افسانے کا انعام دینا قرار پایا۔
سالگرہ نمبر کی تعریف میں ملک کے گوشے گوشے سے تعریفی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اور اب تک خطوط کا سلسلہ جاری ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ بہنیں خواتین ڈائجسٹ کو پسند کرتی ہیں۔ اس سے محبت کرتی ہیں اُسے دل سے عزیز رکھتی ہیں۔ اس کی فائلیں رکھتی ہیں۔ تحفے کے طور پر دیتی ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کے سالگرہ نمبر کا جس طرح بہنوں نے استقبال کیا جس طرح یہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس کی کوئی مثال نہیں ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اب بھی مانگ جاری ہے۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ اُسے دوبارہ طبع کروا سکیں۔ اگر انتظامات ہو گئے تو ہم اسے دوبارہ چھاپیں گے تاکہ وہ بہنیں جو اس سے محروم رہ گئی ہیں اُسے حاصل کر سکیں۔
اگر آپ کا شمار بھی ان بہنوں میں ہے جو سالگرہ نمبر نہیں حاصل کر سکیں تو آپ فوری طور پر دفتر کو خط لکھ کر اپنی کاپی محفوظ کروالیں۔

⊚⊚

نیا ناول

اس شمارے سے ہم نے ایک نئے ناول کا آغاز کرنا تھا اب یہ ناول جون کے شمارے سے شروع ہوگا۔

انعامات کی روانگی

جن بہنوں کے افسانوں نے سالگرہ نمبر میں منتخب افسانے کا انعام حاصل کیا ہے۔ ان میں سے بعض بہنوں کے پتے دفتر کے پاس نہیں ہیں لہٰذا ایسی تمام بہنیں فوری طور پر اپنے پتوں سے دفتر کو آگاہ کر دیں۔

حمیدہ بانو

شاہکار
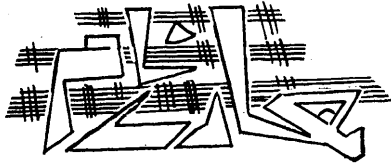
نادرہ خاتون

ناصرہ طیبہ بٹ۔ کوٹری

نادرہ ڈیئر! آداب

"سالگرہ نمبر" اپنی تمام تر لطافتوں، رعنائیوں اور خوبصورتی کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ بہترین کاوش ہے۔ افسانے عظمیٰ ناز صاحبہ ناہید شاد، رضیہ جمیل، فرزانہ علی صاحبہ کی کاوشیں خاص طور پر بے حد پسند آئیں بہرحال اچھی چیز کو اچھا کہا جائے گا۔" آپ سے کیا پردہ" وہ واحد سلسلہ ہے جو تمام قارئین ذوق و شوق سے پسند کرتے ہیں۔ ان سا لکھنے والا اب کہاں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ غزلیں ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے پڑھنے کو دیں۔ تو بے حد شکریہ!

شازیہ تاج۔ ایبٹ آباد

آپی جی! نیاز و تسلیم

سالگرہ نمبر کے آخری اوراق ابھی ختم کیے ہیں۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ ایک افسانے کے اختتام کی لذتیں کم نہیں ہوتی تھیں کہ دوسرے افسانے کی ابتدا میں دلچسپی کا سامان تھا۔ میں نے لگاتار سارے افسانے پڑھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کون افسانہ کس سے کم تھا۔ اتنا دلچسپ سالگرہ نمبر نکالنے پر دلی مبارک باد قبول کریں۔ اور ہاں انعام یافتہ خواتین کو میری طرف سے داد ضرور دیجیے گا۔

ثمینہ سحر۔ روہڑی

سویٹ نادرہ آپا! تسلیمات

طویل انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، ایک اور جگمگاتی ہوئی صبح کو وہ شاہکار ہمارے ہاتھوں میں تھا جس کا ہمیں بے چینی سے انتظار تھا یعنی چاند کی مانند چمک دمک لیے ہمارا اپنا خواتین کا سالگرہ نمبر اس قدر خوبصورت سالگرہ نمبر نکالنے پر ہماری جانب سے ڈھیروں مبارکباد قبول فرمائیں۔

حسین سرورق، خوبصورت افسانے، عظیم قلمکار بہنوں نے سجایا۔ مشرف تمیز کا ناول، غزلیں اور سب سے بڑھ کر انشا جی کا "آپ سے کیا پردہ" غرض کہ وہ تمام چیزیں موجود تھیں کہ جس نے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ خواتین ڈائجسٹ وہ منفرد رسالہ ہے جس کو پڑھ کر تشنگی کا احساس باقی نہیں رہتا ہے۔ اور ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اس نے سابقہ ریکارڈ قائم رکھا۔

آپا آپ سے ایک درخواست ہے کہ ہمیں عدنان بھائی کی کتاب "ہاتھ کے بھید" بھیج دیں۔ شکریہ۔ دعا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ اسی طرح ترقی کرتا رہے۔ اور آپ جیسی عظیم ہستیاں ہمیشہ خوش، پرسکون اور شاد آباد رہیں اور ہمارے لیے اسی طرح بہترین رسالہ نکالتی رہیں۔ اجازت چاہوں گی۔

روبینہ مریم۔ شورکوٹ شہر

سویٹ نادرہ دیدی ـــــ مسکراؤ سدا پھولوں کی طرح!

خلوص بیکراں!

اس ماہ کا خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر میرے سامنے ہے۔ اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ سوچ رہی ہوں کہ اس کی تعریف کہاں سے شروع کروں۔

کسی خوبصورت اور من پسند چیز کی تعریف کے لیے خوبصورت الفاظ کا چناؤ ایک تکلیف دہ مرحلہ ہے کہ حسن کے سامنے ہر لفظ چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ اور پھر حسن بھی ایسا کہ رنگوں اور شوخیوں کا امتزاج۔ سب سے پہلے سالگرہ نمبر کی مبارک باد۔ سالگرہ نمبر بہت خوب رہا۔ انسانی معاشرہ اپنے تمام کرداروں سمیت سمٹ کر ان تین سو بائیس صفحات میں قید ہو گیا تو انسانی جذبے اپنی تمام لطافتوں سمیت ہر صفحے پر چھائے رہے۔ نبیہ نقوی کا "تحفہ" بہت پسند آیا۔ رضیہ جمیل شکیلہ رفیق۔ لبنیٰ غزل صاحبہ کے افسانے بہت اچھے رہے ـ بلکہ بہت ہی اچھے۔ انہیں ہماری طرف سے اتنے اچھے افسانے لکھنے پر مبارک باد پہنچا دیں۔

خاتون کی ڈائری اور خواتین کی محفل کی کمی بری طرح محسوس ہوا۔ انشا جی بھی خوب رہے۔ "رنگا رنگ پھول" اور "آپ کی بیاض سے" میرے پسندیدہ مستقل سلسلے ہیں۔

میری دعا ہے کہ خدا کرے یہ خوبصورت ماہنامہ ہر ماہ اپنی روشنی سے ہمارے دلوں کو منور کرتا رہے۔ اور ہم ہمیشہ اس کی ترقی اور سلامتی کے لیے دعا گو ہیں۔

علینہ طفیل۔ کراچی

ڈیئر نادرہ آپی! آداب

واہ! آپی مزہ آگیا اتنا خوبصورت سالگرہ نمبر تھا کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ ہر تحریر جاذب نظر تھی فہرست میں اتنا خوبصورت لکھنے والی مصنفات کا نام دیکھ کر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پہلے کونسا افسانہ پڑھا جائے۔ آخر فیصلہ اس پر ہوا کہ پہلے ناول پڑھا جائے۔ مشرف تمیز کا ناول آہستہ آہستہ دلچسپ انداز میں بڑھ رہا ہے۔ نئے ناول کا بیتابی سے انتظار رہے۔ افسانوں میں نئے قلمکاروں کے افسانے بھی اچھے تھے خاص طور پر "پنجرہ" پسند آیا، اس کے علاوہ جو افسانے پسند آئے۔ ان میں "ساحل کے گھروندے" "سفید چاندنی" "ایک بار کہو تم میری ہو" "چہرہ دھواں دھواں" اور "تحفہ" شامل ہیں۔ سبھی کہانیوں نے بھی متاثر کیا۔

شاہینہ عباسی۔ راولپنڈی

ڈیئر نادرہ آپی! اسلام خلوص!

پچھلے ماہ طویل غیر حاضری کے بعد خط ارسال کیے تھے۔ لیکن شاید آپ کی طبع نازک پر گراں گذرے اور آپ نے انھیں جگہ نہ دی۔ بہرکیف اس دفعہ بے انتہا خوبصورت سالگرہ نمبر نکالنے پر ڈھیروں مبارک باد۔ "آواز کا جادو" "غبار راہ بن کر" "تقدیر کا عنوان" بن گیا۔ سرد آگ کی وجہ سے "چہرہ دھواں دھواں" ہو کر دل کی زبان بن گیا۔ "سفید چاندنی" میں ہم نے "ساحل کے گھروندے" تیار کیے۔ لیکن وہ تو کانچ کے گھروندے ثابت ہوئے۔ میں نے تو اپنے دل کو "دل درد آشنا" سمجھتی رہی۔ لیکن "تجھ سے بچھڑ کے" یہ دل جو کہ پتھر تھا "غبار راہ بن کر" رہ گیا۔ "تیرہ شبوں کے ساتھی" "سائبان" "مجھے یہ پنجرہ" "تحفہ" دے گیا جسے میں نے تمہاری امانت سمجھ کر حفاظت میں رکھ لیا۔ دوسرے تمام سلسلے بے حد خوبصورت تھے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پرستار۔

خورشید ناز۔ سانگھڑ (سندھ)

پیاری نادرہ آپی! پرخلوص آداب!

عرصہ دراز کے بعد پھر ایک مرتبہ آپکی محفل میں شریک ہو رہی ہوں اتنے عرصہ میں پابندی سے اس کا مطالعہ کرتی رہی ہوں۔

اپریل کا سالگرہ نمبر تمام رنگینیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر چند قابل داد تحسین و تعریف کے لائق ہے تمام افسانے بہترین اور معیاری تھے۔ خاص طور پر مشرف تمیز کا "اک بار کہو تم میری ہو" "کانچ کے گھروندے" "تقدیر کا عنوان" "تجھ سے بچھڑ کے" "پتھر" وغیرہ بہت پسند آیا۔ آپ کا "دل تنہا" بے حد پسند آیا۔ آپکے افسانے کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی تو ہماری خواہشیں پوری کریں۔

مشرف تمیز کا ناول "نگاہ التفات" بے حد اچھا جا رہا ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔

اور تمام موضوعات بھی اپنے اندر رنگینیاں سمیٹے ہوئے ہیں۔ "نفسیات" کا کالم بہت عمدہ ہے جس انداز میں عدنان بھیا مسائل حل کرتے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ بھیا ابن انشا کا کالم بھی خوب تھا، اسے جاری رکھے گا۔ غرض کہ ہمیں خوبصورت تحریروں اور رنگوں سے سجا سجایا یہ سالگرہ بے حد پسند آیا۔

آخر میں میری طرف سے خواتین ڈائجسٹ کے تمام اراکین کی نذ[illegible] میں بہترین سالگرہ نمبر پیش کرنے پر دلی مبارک باد۔ میری د[illegible] ہے کہ ہمارا پیارا ڈائجسٹ ہمیشہ مانند کہکشاں رہے۔ اور خدا آپ[illegible] ہمت دے جو اتنی خوش اسلوبی سے اتنا پیارا رسالہ ہمارے [illegible] نکالتی ہیں (آمین)

شمیم مصطفیٰ قریشی۔ کراچی

سوئٹ نادرہ آپی! گلہائے عقیدت!

میں بہت ہی پرانی خواتین ڈائجسٹ کی قاری ہوں۔ اس [illegible] پہلے بھی میں نے خط لکھنے کی جسارت کی تھی لیکن شاید آپ نے پ[illegible] نہیں کیا۔ اس کے باوجود پھر ایک اور جسارت کر رہی ہوں کہ [illegible] سالگرہ نمبر کی خوشی میں شریک محفل کر لیں۔ سالگرہ نمبر کا ٹائیٹل نہایت دیدہ زیب تھا۔ تمام افسانے پسند آئے۔ خاص طور پر "کشتیاں جلا ڈا[illegible]" "کانچ کے گھروندے" "تحفہ" "آواز کا جادو" وغیرہ بہت پسند آئے۔ دونوں سبھی کہانیاں بہت شاندار تھیں۔ "نگاہ التفات" ایک اچھے پر آتا جا رہا ہے۔

مستقل سلسلے بھی بہت پسند آئے۔ خاص طور پر انشا جی کا "[illegible] سے کیا پردہ" تو بہت ہی اچھا تھا غرض کہ سالگرہ نمبر اپنی تمامتر جل[illegible] سامانیوں سے جلوہ افروز ہوا۔ خدا کرے اسی طرح یہ اپنی عمر طے [illegible] رہے۔ (آمین)

رخسانہ ہارون۔ میرپورخاص (سندھ)

نادرہ آپی! سدا خوش رہیں!

جب اپریل کا شمارہ دیکھا تو سرورق کی تصویر دیکھ کر ہی دل خو[illegible] ہو گیا۔ مشرف تمیز کے ناول "نگاہ التفات" کی قسط پڑھی بہت ہی [illegible] تھی اس کے علاوہ کانچ کے گھروندے "تحفہ" "آواز کا جادو" "سائبان" بہت ہی پسند آئے۔ باقی تمام سلسلے دلچسپ تھے میری اللہ تعالیٰ [illegible] دعا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔

ساجدہ جبیں۔ جھڈو

محترمہ مدیرہ صاحبہ! آداب!

خواتین ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر ملا، اور پڑھا۔ اپنی توقعات [illegible] بڑھ کر پایا۔ اس قدر ضخیم نمبر نکالنے پر میری اور ہم سب کی جانب [illegible] دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ تمام افسانے درخشاں ستاروں کی مانند [illegible] تمام افسانہ نگاروں کو دلی مبارک باد۔ خواتین ڈائجسٹ کے ادار[illegible] تمام اراکین واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ ضخیم نمبر بلاشبہ ان ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ خدا کرے خواتین ڈائجسٹ کا معیار ہمیشہ بلند [illegible] اور یونہی مقبولیت کے منازل طے کرتا رہے (آمین)

ابنِ انشا

آپ سے کیا پردہ

پرانے زمانے میں آج سے تیس ۳۰ چالیس ۴۰ برس پہلے اگر کوئی آدمی بیمار ہوتا تھا تو ڈاکٹر کے پاس جاتا تھا ڈاکٹر اسے دیکھتا تھا، اس کا معائنہ کرتا تھا۔ اُسے بتاتا تھا کہ تمہیں کیا بیماری ہے اُسے دوا دیتا تھا او ہدایت کرتا تھا کہ جاکر بستر میں لیٹ جاؤ آرام کرو مریض بستر میں جاکر لیٹتا تھا آرام کرتا دوا پیتا تھا۔ یا تو صحت یاب ہوجاتا تھا یا پھر صحت یاب نہیں ہوتا تھا۔

لیکن یہ سب پرانی باتیں ہیں خوشی کی بات ہے کہ سائنس اور طب کی ترقی کے ساتھ یہ صورت حال نہیں رہی ... اب یہ ہوتا ہے کہ پہلے مریض ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے جو کنسلٹنگ ڈاکٹر کہلاتا ہے۔ ماہر یا مشیر کہہ لیجئے وہ اُسے دیکھ کر ہوں ہاں کرتا ہے اور اُسکے دل کا معائنہ کرنے کے لئے ماہر امراض قلب کے پاس بھیجتا ہے وہاں سے واپسی پر خون کا معائنہ کرنے کے لئے خون کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔ پیشاب کا معائنہ کرنے کے لئے پیشاب کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔

مریض اتنے میں جھنجلا جائے تو اس کے دماغ کا معائنہ کرنے کے لئے ماہر دماغ یا ماہر نفسیات کی طرف ہانک دیتا ہے اس کے بعد اگر اس کے آپریشن کی ضرورت ہو تو ایک ماہر اُسے انجکشن دے کر یا کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کرتا ہے اور سرجن اس کا آپریشن کرتا ہے اور اس کے بعد زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مریض صورِ اسرافیل کی آواز سن کر اُٹھ بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ فرشتے اس کا حساب کتاب لینے کے لئے رجسٹر لئے کھڑے ہیں۔

یہ سب تو ہوا.... ہم سوچتے کہ اگر دوسرے پیشوں میں بھی یہی خصوصی ماہرین کی ریل پیل ہوگئی تو کیا ہوگا۔ یہ لیجئے یہ اللہ دِتہ صاحب ہیں۔ یہ دو گھنٹے سے "ڈاکٹر بالِ جبریل" ماہر مویات یعنی بالوں کے اسپیشلسٹ ہیں انکے کلینک میں بیٹھے باری کا انتظار کررہے ہیں۔ آخر ایک چوبدار آواز لگاتا ہے "مسٹر آلو شوربہ"!

اللہ دِتہ صاحب احتجاج کرتے اُٹھتے ہیں اور چوبدار کو بتلاتے ہیں کہ میرا نام آلو شوربہ نہیں ہے اللہ دتہ جنجوعہ ہے۔

اب مریض یا جو کچھ بھی آپ اُسے کہیں ڈاکٹر بالِ جبریل کے حضور پیش ہوتا ہے اُن کے نام کے ساتھ ڈگریوں کی ایک لمبی فہرست ہے کاغذ ختم ہوجاتا ہے۔ ڈگریاں ختم نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر ایک نظر مریض کے چہرے پر ڈالتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کچھ بال مریض کے چہرے پر نکل آتے ہیں۔ کچھ نکلنے کی کوشش کررہے ہیں۔ تاہم وہ اس سے سوالات کرتا ہے

اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں اس کے والدین کے بارے
اس کی اولاد کے بارے میں کہ بچے کہاں کہاں پڑھتے ہیں اس
پیشے کے بارے میں تاکہ اس کی آمدنی کا اندازہ ہوسکے، عادا
کے بارے میں، اپسند کے بارے میں پھر ایک محدب شیشہ
کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتا ہے۔ پھر سنجیدہ ہوجاتا ہے او
ہے سمجھ گیا، سمجھ گیا، آپ نے کب سے شیو نہیں کی۔

مریض بتاتا ہے کہ دو دن سے نہیں کی۔"

ڈاکٹر کہتا ہے میرا اندازہ صحیح نکلا۔ آپ کو شیو کرانے کی
ہے۔

مریض کا چہرہ لٹک جاتا ہے اُسے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کا
اُسے اس کے مرض سے آگاہ کرنا ہے خواہ وہ حقیقت کتنی ہی
کیوں نہ ہو اُسے خود بھی اپنے بارے میں یہی شبہ یا گمان تھا۔ بیو
نے بھی یہی بتایا تھا لیکن وہ تو عورت ذات ہے دل میں دبد
کہ شاید ڈاکٹر کچھ اور بتلائے۔ کچھ اور تشخیص کردے شاید اُسے
دے دے اور اُسے حقیقت کا سامنا فوراً نہ کرنا پڑے مر
ممیاتا ہے اور ڈاکٹر سے پوچھتا ہے ڈاکٹر صاحب کیا اُسے ا
دن کے لئے ملتوی کرسکتا ہوں۔ آج کل دفتر میں کام زیادہ
فرصت نہیں۔

اسپیشلسٹ سختی سے کہتا ہے: میں نے کہہ دیا نہ کہ
شیو کی ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اُسے ملتوی کردو۔ لیکن پھر

ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔"

مریض نے ایک لمبی آہ کھینچی "اچھا اگر یہی بات ہے تو میں تیار ہوں، کر دیجئے میری شیو۔"

ڈاکٹر بال ماہر موئیات مسکرایا اس نے کہا جناب میں شیو نہیں کرتا میں تو صرف بالوں کا ماہر ہوں۔ میں تو تشخیص کرتا ہوں۔ اب آپ کو ماہر ریش و بروت ڈاکٹر سلمانی کے پاس بھیجتا ہوں۔" اس نے گھنٹی بجائی اس کی سیکرٹری دوڑی دوڑی آئی۔

"مس زلف دراز۔ ان صاحب کے نام کا کارڈ بنا دو شیونگ روم کے لئے اگر ڈاکٹر سلمان ہوں تو ان سے کہو ان کے چہرے پر موزبائی کا عمل بذریعہ مقراض و تیغ کریں اور مشاطگی کے لئے شانہ صد دندانہ کا استعمال کریں۔"

مسٹر اللہ دتہ اور تو کچھ نہ سمجھے تیغ کے نام پر گھبرائے انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ استرے کا اصطلاحی نام ہے۔ تاہم چپ رہے کہ اب جو چاہو سو ہو۔ اتنا ضرور پوچھا کہ کیا اس کے لئے مجھے بے ہوش کیا جائے گا۔ کلوروفارم سنگھایا جائے گا؟

ڈاکٹر نے پھر تبسم کیا اور کہا میری دانست میں اس کی ضرورت نہیں لیکن زیادہ صحیح ڈاکٹر سلمانی ہی بتا سکتے ہیں میرے خیال میں مس زلف دراز۔۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجنے سے پہلے انہیں ماہر صابنیات کے پاس لے جاؤ وہ ان کے چہرے پر صابن لگائیں ماہر تولیات ان کے گلے میں تولیہ باندھیں۔

سیکرٹری نے کچھ ڈاکٹر صاحب کے کان میں کہا انہوں نے فکر مند ہو کر کہا۔ یہ تو افسوس کی بات ہے کہ ماہر صابنیات گھنٹہ بھر بعد ملیں گے وہ تو ایک مریض کے ساتھ مصروف گفتگو ہیں بڑا سنگین کیس ہے پوری داڑھی صاف کرنی ہے اور ہاں مس زلف دراز ڈاکٹر سلمانی تو داڑھی مونڈیں گے کان کے اوپر کے بال صاف کرنے کے ماہر ڈاکٹر دراز گوش بھی ہیں یا آج نہیں آتے۔

مریض نے کہا کیا اس کے لئے علیحدہ اسپیشلسٹ ہے داڑھی مونڈنے والا کانوں کے آس پاس کے بال صاف نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر بال جبریل نے کہا بعض لوگ کر لیتے ہیں لیکن خطرہ رہتا ہے کہ قینچی سے کان کی لو نہ کٹ جائے تم جانو آج کل کی سائنس بھی کافی ترقی کر گئی ہے۔

"اچھی بات ہے" مریض راضی برضا ہو کر کہا۔

اس کے بعد ان کو ماہر شیمپوئیات کے پاس جانا ہو گا لیکن اس سے پہلے امراض قلب کے ماہر کے پاس ہو آئیں یا شاید اس کی ضرورت نہ ہو آپ ہٹے کٹے معلوم ہوتے ہیں بعض لوگ دوسری طرح کے ہوتے ہیں ان کا شیمپو کیا جائے تو بے ہوش ہو جاتے ہیں اور چمپی کی جائے تو بعض اوقات جانبر نہیں ہوتے اور اس سارے عمل کے بعد میرے خیال میں جلائے پاپوش کی ضرورت بھی پڑے گی۔"

مریض کے کان کھڑے ہوئے لیکن سیکرٹری صاحبہ نے دلاسا دیا کہ مطلب بوٹ پالش سے ہے۔

اب مریض نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب مشورے کی فیس؟"

ڈاکٹر نے سیر چشمی سے کہا اس کی آپ فکر نہ کریں سیکرٹری صاحبہ وصول کر کے ہی آپ کو جانے دیں گی۔ ایمرجنسی کے لئے دروازے پر دو پہلوان بھی آپ نے دیکھے ہوں گے اچھا خدا حافظ اگلے آدمی کو آواز دو۔"

اور جب بیچارے اللہ دتہ صاحب ان سارے مراحل سے فارغ ہو گئے داڑھی گھٹوا چکے اور چمپی کرا چکے تو "جلائے پاپوش" کے شعبے میں آئے۔ وہاں ایک لڑکا بوٹ پالش۔ برش اور صافی وغیرہ لئے بیٹھا تھا۔ مسٹر اللہ دتہ نے اطمینان کی سانس لی کہ ایک کام تو ایسا ہے کہ جس میں ماہر کی ضرورت نہیں پرانی چال پر چل رہا ہے۔

"کون سے پاؤں پر پالش کروں صاحب" لڑکے نے پوچھا

"بھئی اس سے کیا فرق پڑتا ہے اچھا داہنے پاؤں سے شروع کرو۔"

وہ بولا "جناب اس کے لئے آپ کو دوسرے کمرے میں جانا پڑے گا میں صرف بائیں پاؤں کے جوتے پر پالش کرتا ہوں۔ وہ بھی صرف بوٹ پر۔ چپل اور سینڈل کی پالش کے ماہر دوسرے ہیں۔" (بشکریہ لی کاک)

خاتون کی ڈائری

عظمیٰ ناز

دلشاد نسیم کی ڈائری سے

زرد چہرہ
نیلگوں ہونٹ
میرے کاندھوں پر جھکتی گردن
ویران آنکھوں کے خواب
جلتے صحراؤں کے خواب
دیکھیں میری جلتی
دیکھیں میری جلتی بجھتی قندیلیں
جیسے
سرخ و سفید گلاب
میرے آنگن میں کھل رہے ہیں
میرے جوڑے میں سج رہے ہیں
مگر یہ خواب
بکھر رہے ہیں
جاگتی آنکھیں دیکھ رہی ہیں
زرد چہرہ
نیلگوں ہونٹ
کاندھوں پر جھکتی گردن

فہمیدہ مومی کی ڈائری سے

یہ مانگ اجڑی ہے
کلائی سونی
یہ ہاتھ رنگ حنا سے خالی
تم ایک شب کی دلہن
سلامت رہے تمہارا سہاگ
آؤ تمہیں سجاؤں
وہ بھیگی بھیگی پلکیں اٹھا کے بولی
سنگھار اپنا کسے دکھاؤں؟

نینا شیخ کی ڈائری سے

مجھے اپنی ڈائری کا
کا لکھا یہ ورق با
کیوں پسند ہے

خواب تو نہیں مرتے
خواب نہ دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانس کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں
خواب تو نور ہیں
تو پھر بھلا تمہارے جھٹکنے سے میرے خوابوں کو
کو کیا فرق پڑے گا ذرا سوچو تو؟

امیہ خلیل سبحانی کی ڈائری سے

مجھے اپنی ڈائری
ہوئی مصطفےٰ زیا
یہ خوبصورت تخلیق
پسند ہے اور اکثر
اسے بار بار پڑھتی ہوں۔

آخری بار ملو ایسے کہ جلتے ہوئے دل راکھ ہو
مگر کوئی شکایت

چاک داماں نہ سلے زخم تمنا نہ کھلے
سانس ہموار رہے شمع کی لو تک نہ ہلے
اس ملاقات کا اس بار کوئی وہم نہیں
جس سے ایک اور ملاقات کی صورت نکلے
باتیں بس اتنی کہ لمحے آکر انہیں گن جائیں
آنکھ اٹھائے کوئی امید تو آنکھیں چھن جائیں
اب سے پہلے تم سے الگ جان کے کسی رشتے
اب کے گر ہوگا اسے کونسا رشتہ کہیے
اب نہ مہکیں گے کبھی عارض و رخسار ملو
ماتمی ہیں دم رخصت در و دیوار ملو
آخری بار ملو

امتہ النصیر سیال

کی ڈائری سے

اپنی ڈائری میں بکھرے ہوئے یہ الفاظ مجھے بے حد پسند ہیں اور میں انہیں ایک مرتبہ نہیں بلکہ لاکھوں مرتبہ دہرا چکی ہوں۔

دنیا کی مثال ایک شیشہ گر دکان کی سی ہے۔ جس میں ہر طرف شیشے لگے ہوئے ہیں۔ میاں ذرا احتیاط سے قدم رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی شیشۂ دل کو ٹھیس پہنچے اگر ایسا ہوا تو اس بے احتیاطی کا خمیازہ شیشے کے ٹوٹنے کے ساتھ تم کو بھی اٹھانا پڑے گا اور تمہارے تلوے زخمی ہو جائیں گے

سیما کاظمی

کی ڈائری سے

آسمان پر جب بھی آوارہ بادل اپنا بسیرہ کر لیتے ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں ہیں تو چاروں طرف اسقدر ویرانیت اور اداسی چھا جاتی ہے۔ یہ موسم نہ جانے کیوں اتنا اداس ہو جاتا ہے جیسے یہ سب کے سب رنگ برنگے پھول، یہ سبزہ، یہ اونچے اونچے تناور درخت سب مل کر رو رہے ہوں، یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ اڑتے بادلوں چلے جاؤ، اے ہواؤ تم کیوں ہمیں بے چین کئے دے رہی ہو۔ اور پھر جب ہوا کے تیز تھپیڑے ان بادلوں کو اڑا لے جاتے ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج بھی ڈوبنے لگتا ہے، سارے آوارہ پنچھی اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس جانے کے لئے آسمان پر اڑتے ہیں تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے انکا بھی کچھ کھو گیا ہے۔ یہ اسی کی تلاش میں صحرا صحرا بھٹک رہے ہیں۔ اور آوازیں دے رہے ہیں مگر ان کی آواز صرف تھوڑی ہی دور جاتی ہے اور خلا سے ٹکرا کر وہیں سے واپس آجاتی ہے۔

شعر

دل کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا ہے اب اوئے کہاں جانا ہوگا
ہم ہونگے اور وحشت ہوگی اور یہی ویرانہ ہوگا

شازیہ تاج

کی ڈائری سے

آواز —— جس کے بغیر دنیا کا ہر روپ ادھورا ہے ہر رنگ پھیکا ہے اس دنیا کی تمام رنگینیاں بھی آواز کی محتاج ہیں۔ کائنات میں پھیلی ہوئی فضا میں کچھ آوازیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے دل کے نازک اور حساس جذبات ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ آج —— میں بھی ایک ایسی ہی آواز کو ذہن اور دل کے ویران گوشوں میں سمیٹ چکی ہوں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں وہ ہستی کتنی خوبصورت اور پیاری ہوگی جس کے نازک ہونٹوں نے اس آواز کو جنم دیا۔

کاش میں گذرتی زندگی کے کسی لمحہ میں ان شاداب ہونٹوں کو چوم سکتی۔

سیدہ ناز ہمدانی

کی ڈائری سے

ہمارے تمہارے درمیان تو برسوں کے فاصلے ہیں —— مگر میری یادوں کی دنیا تم سے آباد رہی —— بڑی تکلیف دیتی ہیں تمہاری یادیں مگر تمہیں بھلانے کا تصور بھی تو نہیں کر سکتی۔ تمہیں بھول جانے کا جب بھی سوچا۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں زندگی سے بالکل خالی ہو گئی ہوں۔ میری زندگی کا کوئی جواز نہیں لگتا۔ پھر گھبرا کر تمہاری یادوں میں پناہ لیتی ہوں —— اور میری کونسی پناہ گاہ ہے —— کونسی ہے میری پناہ گاہ —— تم فقط اتنا ہی بتا دو تو میں تجھے بھول جاؤں۔ میرے چاروں طرف تنہائیاں —— خاموشیاں —— اداسیاں اور آہیں ہیں۔ نہ جینا اپنے بس میں نہ مرنا —— نہ منزل کا نشان نہ کوئی سہارا نہ کوئی گوشۂ عافیت —— ہاں —— مگر تم تو لاحاصل ہو —— لاحاصل ہو —— دور ہی رہو تو اچھا ہے۔

بس۔

تم اپنی یاد سے کہہ دو کہ بار بار آئے
کیونکہ میں تیری یاد کے سہارے ہی تو جی رہی ہوں

قسط۔ ۵

مُشرّف تمین

تمھیں کیسے پتہ ؟"

"میں جانتا ہوں آپ صاحب کو بہت چاہتی ہیں اور انھیں ایسا رکھا پھیکا جواب بھجوانا پسند نہیں کریں گی۔"

لاجواب سی ہوکر فیری صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"اچھا۔۔ زیادہ بحث مت کرو۔"

علی نے کہا۔

"میں چپ ہوا جاتا ہوں لیکن آپ تو وہاں پہنچ جائیے گا۔ کیونکہ گوشی میاں صاحب کے پاس چلے گئے ہیں۔"

فیری نے گردن گھما کر دیکھا۔ گوشی سچ مچ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ فیری کو اس پر بھی غصہ آگیا۔ مذاق اس نے کیا اور پھنس گئی فیری۔

علی نے ایک نظر دادی اماں پر ڈالی۔ وہ بگڑی ہوئی بیٹھی تھیں اور تیزی سے منہ میں پان چبا رہی تھیں جس سے ان کا ذہنی انتشار واضح تھا۔

علی کو ان پر بھی ترس آگیا۔ ان کے قریب جاکر بولا۔

"بیگم صاحب۔ یہ تو سب بچے ہیں۔ چھوٹے اور ناسمجھ۔ آپ انھیں معاف بھی کردیجئے اور گلے بھی لگا لیجئے۔ آئیے ڈاکٹر صاحب۔"

اس نے فیری کو دادی اماں کی طرف بلانا چاہا لیکن فیری بجائے ان کی طرف بڑھنے کے کمرے سے نکل گئی۔

"مجھے نہیں چاہیئے دادی اماں کی تفرت کی محبت۔"

اور دادی اماں بھی ابل پڑیں۔

"ہاں ہاں۔ مجھے کیوں چاہیئے لگی میری محبت ۔۔ نامراد ۔۔ جس گھر میں جائے گی ۔۔ وہ اپنی قسمت کو روئے گا۔ پیٹے گا۔"

علی گویا ایک مصیبت میں پھنس گیا۔ جلدی سے ان کا غصہ کم کرنے کو بولا۔

"نہیں بیگم صاحب ایسا نہ کہیئے۔۔ آخر تو یہ آپ کے بچے ہیں۔ ان کی خوشی اور آرام آپ کا آرام اور خوشی ہے۔ انھیں بددعا نہ دیا کیجئے۔۔ اور دعا کیا کیجئے کہ خدا ان کو صحیح راستے پر چلائے ۔۔ اسی طرح آپ کو بھی سکون مل سکتا ہے اور اس گھر کا بھی سکون قائم رہ سکتا ہے۔"

دادی اماں کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ ٹھنڈی سی سانس بھر کر بولیں۔

"ہاں بچے۔۔ تو کہے تو ٹھیک ۔۔ یہاں تو وہی عالم ہے کہ ایک انڈا سو وہ بھی گندا۔"

"آپ انھیں گندا مت سمجھئے ۔۔ آپ نہیں جانتیں ۔۔ آجکل کا زمانہ کتنا نازک ہے۔ گھر سے باہر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس قدر گندگی اور غلاظت میں لوگ پل رہے ہیں ۔۔ بڑھ رہے ہیں۔ آپ کے یہ بچے تو ہزاروں سے بہتر ہیں بس صرف تھوڑی سی آپ کی محبت انھیں اور حاصل ہوجائے ۔۔ تو ۔۔"

اس نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

دادی اماں چمک کر بولیں

"اے ہے تو کیا میں ان نگوڑوں سے محبت نہیں کرتی ۔۔؟"

"محبت تو آپ بلاشبہ کرتی ہیں ۔۔ مگر ۔۔ مگر ۔۔ صرف ۔۔ گوشی سے۔"

علی نے جھجکتے ہوئے آخر حقیقت بیان کر ہی دی۔

"اوئی"۔ دادی اماں نے اس طرح سے کہا جیسے انھیں کوئی سخت دھکا لگا ہو۔ "تو اب تو بھی کھڑا ہوگیا الٹی گنگا بہانے" علی نے بڑے ادب سے ان کے آگے تھوڑی سی گردن خم کی اور بولا۔

"بیگم صاحبہ ۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑی سی عرض اور کردوں۔"

"اے ہے — برابر تو بولے جارہا ہے اور کہے کہ اجازت دیں۔ لے اور کیا کہنا چاہیے تو اجازت مانگ کے؟"

"مجھے صرف یہ کہنا ہے دادی اماں — کہ آپ کی شفقت اور محبت ان بچوں کے لیے بڑی ضروری ہے۔ آپ محبت تو بہت کرتی ہیں ان سے مگر ان سے دور رہ کر۔ خاص طور پر فیری کے ساتھ آپ کو بہت قریب ہونا چاہیئے — وہ ایک بے ماں کی لڑکی ہے۔ کبھی آپ کو خیال آیا اس بات کا؟ اس گھر میں نہ اس کی ماں ہے نہ بہن۔ تبھی تو وہ گھر سے بیگانہ ہو گئی ہے۔"

"اے ہے کہہ تو رہا ہے مجھے دادی آماں — اور بنا کھڑا ہے خود میرا دادا۔"

علی نے معذرت کی۔

"بیگم صاحبہ — معافی چاہتا ہوں۔ بے خیالی میں منہ سے دادی آماں نکل گیا — دراصل — میری دادی اماں بھی — آپ کی ہی طرح بڑی نیک — سادہ اور محبت کرنے والی تھیں۔"

"اے تو کیا اب وہ زندہ ناہیں —؟"

"جی نہیں۔" علی نے ایک سرد آہ بھری — "اب تو کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔"

علی کے دکھ بھرے انداز سے دادی آماں کا دل پگھل سا گیا۔ جلدی سے بولیں

"تو چل — آج سے میں تیری دادی آماں ہوں۔ خبردار جو اب تو نے مجھے بیگم صاحبہ بیگم صاحبہ کہا۔"

"بیگم صاحبہ — یہ تو بڑا مشکل ہے — بیشک میں سمجھوں گا آپ کو دادی اماں ہی — لیکن کہوں گا تو بیگم صاحبہ۔"

"اے — وہ کیوں؟ — یہ کیا فلسفہ ہے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔"

علی ہنسنے لگا۔

"کوئی فلسفہ نہیں۔ صرف احتیاط کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے — آپ کے بچوں کو یہ بات ناپسند ہو — وہ کہیں گے کہ ہماری برابری کرتا ہے۔"

دادی اماں نے سر پہ ہاتھ مار کر کہا۔

"لو اور سنو۔ اس بچے کی جو بات ہے دنیا سے نرالی ہے — اے کیا میں انھیں نہیں بتا سکتی کہ میں نے علی کو اجازت دی —"

"چھوڑیئے دادی آماں۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے لئے مسئلہ پیدا کرتی ہیں — میں تو آپ سے عرض کر رہا تھا کہ آپ ان بچوں کے ساتھ ایسی دوستانہ اور نرم پالیسی اختیار کیجیے کہ وہ آپ سے اپنا ہر دکھ درد بیان کر سکیں — آپ پر انھیں پورا بھروسہ ہو — وہ کوئی بات آپ سے نہ چھپائیں۔"

دادی آماں اس سے امپریس سی ہو گئیں۔ آنکھیں جھپکا کر بولیں۔

"ارے لڑکے کہاں سے سیکھیں تو نے یہ باتیں —؟"

"کہیں سے نہیں دادی آماں — اپنے تجربے نے یہ سب بتایا ہے۔ بعض اوقات دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسا سینہ مل جائے جس میں گھس کر اپنا ہر دکھ اور اپنا ہر درد چھپا لوں — انڈیل دوں — اور — دادی آماں — وہ سینہ — صرف ماں اور باپ کا ہی ہو سکتا ہے — یا پھر آپ جیسی ہستیوں کا جن کا مقام ماں باپ کے برابر ہوتا ہے۔"

دادی اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔

علی نے گھبرا کر پوچھا —

"دادی اماں آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئیں۔ کہ چھوٹا منہ بڑی بات کہہ رہا ہوں میں۔ اگر ایسا ہے تو میں آپ سے ہر طرح معافی چاہتا ہوں۔"

"توبہ ہے لڑکے — حرفوں کا بنا ہوا ہے تو بھی — چت بھی اپنی چاہے پٹ بھی اپنی۔"

"جی — جی — کیا مطلب — میں سمجھا نہیں —؟"

"اے میں کہوں کہ — تو سب کچھ کہہ بھی جاوے — اور پھر کہنے سے انکار بھی کرے ہے — آخر تو ہے کیا —؟"

علی سٹپٹا گیا۔

"میں — جی — بس — کچھ نہیں — وہی ہوں جو آپ کو نظر آ رہا ہوں — ایک معمولی ڈرائیور۔"
"میں نہ مانوں کہ — یہ ایک ڈرائیور کی باتیں۔"
"تو — آپ کو یہ کس کی باتیں معلوم ہو رہی ہیں۔"
"ایک پڑھے لکھے — منچلے جوان کی سی باتیں لگیں مجھے تو — اے لڑکے — تو مجھے سچ سچ بتا — کس کا بیٹا تو — کیا کرے تھا تیرا باپ — ؟"
"مجھے چھوڑیئے دادی اماں — میری کہانی بڑی لمبی ہے۔ کبھی سناؤں گا آپ کو — ہاں — آپ نے آج مجھے دادی اماں کہنے کی اجازت دے کر آج میرا دل ضرور خوش کر دیا۔"
"اچھا چل — جا — زیادہ خوشامد نہ کر — اور کل صبح کالج جانے سے پہلے میرے سے سودے کی فہرست ضرور لے جیو۔ کل سارا سامان آ جانا چاہیئے میرا۔"
"ضرور دادی اماں — مگر ایک شرط ہے میری۔"
"اے ہے — اب تو بھی شرطیں لگا کے کام کیا کرے گا۔"
"بس صرف اس بار لگا رہا ہوں شرط۔"
"ہاں بول — کیا شرط ہے تیری میں بھی تو سنوں۔"
"میں کہہ رہا تھا کہ آپ اپنے بچوں کے ساتھ وہی پالیسی اختیار کریں گی جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔"
"اے چل — دفع ہو یہاں سے — بڑا آیا میرا دادا بن کر۔"
دادی اماں نے جھڑک کر کہا — مگر —
مگر ان کا انداز بڑا شفقت آمیز تھا۔
اور علی کو تھوڑی سی اُمید بندھ گئی کہ شاید دادی اماں اپنا رویہ تبدیل کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

O

علی کو اس گھر میں آئے خاصے دن گزر گئے تھے۔ وہ ایک ڈرائیور کے روپ میں اپنی حیثیت سے بہت گر کر — نیچے ہو کر زندگی بسر کر رہا تھا۔
ابتدا میں تو اسے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کب فارده اس سے ناراض ہو کر سیٹھ اور زیب سے اس کی چھٹی کرا دے۔ مگر اب وہ ذرا مطمئن ہو گیا تھا۔
فاردہ کا انداز حوصلہ افزا نہ سہی — مگر تھوڑا سا گزارے والا ضرور تھا۔ شاید اس نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ بوڑھے فضلو کا کا کی جگہ یہ بندہ چھوکرا سیدھا سادا اور بے وقوف ہے۔
وہ بس فاردہ کی جی حضوری میں لگا رہتا تھا۔
فیری اسے "ڈرائیور" کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور —
اور —
وہ فیری کو "صاحب" کہتا تھا۔
"گاڑی چلاؤں صاحب؟"
"میں جاؤں صاحب؟"
"کدھر چلنا ہے صاحب؟"
ایک روز فاردہ بگڑ گئی۔
"یہ تم مجھے صاحب صاحب کیوں کہتے ہو؟"
"اور کیا کہوں؟ بے بی؟؟ بی بی؟؟؟"

ناگوار لمحے

سلمہ کے پاس بہت سے نئے لباس ہیں چونکہ ہم دونوں کا قد اور جسامت ایک سا ہے، ہم اکثر ایک دوسرے کا لباس پہن لیتے ہیں۔

کیا بات ہے نجمہ؟ کیا تمہیں میرا نیا قیص پسند نہیں آیا؟

نہیں سلمہ نہیں، اپنے بغل کے بالوں کی وجہ سے بغیر آستین کا قیص نہیں پہن سکتی

تو پھر تم ان کو صاف کیوں نہیں کر لیتیں

میں نے شیو کیا تھا جس کی وجہ سے زخم آ گئے اور روآں بھی رہ گیا۔

کمال ہے! شیو کی کیا ضرورت؟ این فرینچ غیر ضروری بالوں کو آسانی سے صاف کرتا ہے۔

سلمہ نے سچ کہا این فرینچ بے مثال ہے۔

کس قدر آسانی سے بال صاف ہو گئے

گلاب اور یمین کی خوشبوؤں کا انتخاب

hair remover

این فرینچ

غیر ضروری بالوں کو دور کرنے کا نسوانی طریقہ

اب میں اپنی پسند کا ہر لباس پہن سکتی ہوں

BOND

AFHP-1-77

فاروہ اور جل گئی۔
"ایڈیٹ"
"جی ؟ ایڈیٹ کہوں ؟ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟"
"او یو فول۔ خاموش رہو۔"
"بہت بہتر جناب ۔ لیکن آپ اپنی پسند بتا دیتیں تو بہتر ہوتا۔"
فیری نے کوئی جواب نہ دیا۔
البتہ اس دن کے بعد علی نے اسے صاحب کہنا چھوڑ دیا۔ اب وہ اسے ڈاکٹر صاحب کہنے لگا تھا اور فیری نے بھی اس کے ایسا کہنے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔
وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بات پر فیری کو اس سے خفا ہونے یا اس کی شکایت کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ اکثر وہ اس کی تند مزاجی کو بھی نرم خوئی سے برداشت کر لیتا تھا۔ حالانکہ ایسا کرتے وقت اسے خود بڑی مشکل سے قابو رہتا تھا۔
خاص طور پر ناصر کا انداز گفتگو اس قدر گھٹیا اور بے باک ہوتا تھا کہ علی کو خواہ مخواہ ہی تاؤ آنے لگتا تھا ۔ مگر ۔ وہ ان کے معاملات میں کبھی کچھ نہ بولا۔ اورنگ زیب کی نصیحت اور حکم یہی تھا۔ پھر یہ بھی کہ ناصر اور فاردہ انگریزی میں بات چیت کرتے تھے ۔ جسے علی سننے اور سمجھنے کے باوجود مجبور تھا کہ اپنے چہرے پر قطعی لاعلمی اور جہالت کے تاثرات قائم رکھے۔
ایک بار تو خود ناصر نے علی کی تعریف اس انداز میں کی۔
"ڈارلنگ فیری ۔۔ یہ اُلو تم نے اچھا پالا ہے ۔ کمبخت اس بڈھے فضلو سے ہزار درجہ بہتر ہے ۔ وہ تو ایسا کمینہ تھا کہ انگریزی نہیں سمجھتا تھا تو اشاروں کی شکایتیں ہی تمھارے ابو کو پہنچاتا رہتا تھا۔"
فیری ہنسنے لگی۔
ناصر نے پھر کہا۔
"میں سچ کہتا ہوں ۔۔ اس گھامڑ کو کہیں نہ جانے دینا۔"
اور یہ بات سن کر علی کا ہاتھ اس کے چہرے پہ پڑتے پڑتے بڑی مشکل سے رُکا۔
مگر ۔
وہ جسے فطرت کہتے ہیں اسے بھلا کون بدل سکتا ہے۔
بہت جلد ایک دن ایسا بھی آ گیا جب علی اپنے اٹھتے ہوئے ہاتھ کو نہ روک سکا۔
ہوا یہ کہ ایک روز کالج سے واپسی پر فیری نے ناصر کے ساتھ شاپنگ پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔
علی انھیں گاڑی میں لے جا رہا تھا کہ مخالف سمت سے سیٹھ اورنگ زیب کی گاڑی آتی دکھائی دی ۔ ناصر اور فیری نے اپنی باتوں میں لگے ہونے کے سبب انھیں نہ دیکھا لیکن علی نے انھیں دیکھ لیا تھا خود سیٹھ اورنگ زیب نے بھی انھیں دیکھ لیا تھا۔ اور شاید گھر پہنچ کر انھوں نے فاردہ کو کچھ سرزنش بھی کی۔ تب ہی اگلے دن فاردہ کا موڈ سخت خراب رہا۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ علی نے سیٹھ اورنگ زیب سے اس کی شکایت کی ہے۔
ناصر نے فاردہ سے اس کی اُداسی اور سنجیدگی کا سبب پوچھا تو فاردہ نے صاف بتا دیا کہ کل اسے باپ کی ڈانٹ سہنی پڑی۔
ناصر نے پوچھا
"انھیں کیسے پتہ لگا ؟"
فاردہ بولی
"کہہ رہے تھے کہ انھوں نے ہمیں کار میں دیکھا تھا ۔۔ ہم نے تو انھیں دیکھا نہیں تھا۔
ناصر بولا
"کہیں اس ڈرائیور نے تو فضلو کی شاگردی اختیار نہیں کر لی۔"

"کیسی شاگردی" وہ دونوں انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔
ناصر نے جواب دیا۔
"یہی لگائی بجھائی کی باتیں۔۔۔!"
"کیا پتہ ہے۔ ویسے ابو بتا رہے تھے کہ اس نے اُن کے پوچھنے پہ بتایا تھا۔ از خود کچھ نہیں کہا تھا۔"
ناصر نے سمجھایا
"پھر بھی۔ تم اس کو ڈانٹ دیتیں۔ کہو تو میں ٹھیک کروں سالے کو۔"
"نہیں بھئی۔ جب ابو کہتے ہیں اس نے کچھ بتایا ہی نہیں تو میں اسے کیا کہوں۔ ویسے تنبیہ تو کر دی ہے میں نے اسے۔"
ناصر بولا
"اچھا کیا۔ ان کمینوں کو شروع سے ہی دبا کر رکھنا چاہیے۔ ورنہ سر چڑھ جاتے ہیں۔ ٹھہرو۔ میں بھی سالے کو دھمکا نو دوں"
پھر ناصر اردو میں بات چیت کرنے لگا۔
علی سمجھ گیا کہ اب بات اس سے کی جانے والی ہے۔
اور سچ مچ تھا پھر اکر ناصر نے علی کو مخاطب کر لیا۔
"کیوں بے۔ کل کیا بکواس کی تو نے سیٹھ صاحب سے۔"
علی نے ایک قہر آلود نظر ناصر پہ ڈالی اور بولا۔
"آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کچھ۔۔۔؟"
"جی ہاں میرے شہزادے۔ میں حضور ہی سے مخاطب ہوں۔"
"معاف کیجئے۔ میں اس قسم کی طرز گفتگو کا عادی نہیں ہوں۔"
"ابے جا بہت دیکھے ہیں تجھ سے۔ بڑا آیا کہیں سے طرز گفتگو اختیار کرنے والا۔ بول جلدی۔ کیا کہہ چکا ہے تو ہمارے متعلق۔۔۔؟"
"آپ کی فضول باتوں کا جواب دینا میں بے کار سمجھتا ہوں۔"
اب ناصر نے فیری سے شکایت کی
"سن رہی ہو فیری۔ کس قدر گستاخ اور بدتمیز ہو چلا ہے یہ۔ یہ سب پیسے کا نشہ ہے یا فضلو کمینے کی صحبت رنگ دکھا رہی ہے۔" فیری نے علی کو ٹوکا۔
"علی۔ زیادہ معتبر بننے کی کوشش نہ کرو۔"
"میں نہ معتبر ہوں۔ نہ بننا چاہتا ہوں۔ یہ صاحب خود ہی مجھے معتبر بنانے پہ تلے ہوئے ہیں۔"
"تو۔ تم سچ سچ بتا دو ناکہ تم نے کیا کہا ہے ابو سے۔"
"میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ میں نے اپنی طرف سے انھیں کچھ نہیں کہا تھا۔ اور۔۔۔ اگر کچھ کہا بھی ہو تو آپ لوگوں کو فکر کی کیا ضرورت ہے۔ میرے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میری اوقات ہی کیا ہے۔۔۔؟ ایک معمولی سا ڈرائیور ہوں اس گھر میں۔"
فیری نے سنگدلی سے کہا۔
"ہاں یہی میں بھی کہتی ہوں۔ اپنی اوقات یاد رکھو۔"
"مجھے خوب یاد ہے۔"
ناصر گرجا۔
"برابری سے مقابلہ کر رہا ہے۔ بند کر اپنی بکواس۔"
علی بھنا کر بولا

"آپ کو مجھ سے اس طرح بولنے کا کوئی حق نہیں۔ ناصر صاحب۔"
اب فاردہ نے دخل اندازی اور بھی ضروری سمجھی۔
"علی۔ تمیز سے بات کرو۔ جانتے نہیں۔ تم کس سے بول رہے ہو؟"
علی نے بڑے یقین اور اطمینان سے جواب دیا۔
"جانتا ہوں! نہ اپنے آقا سے بات کر رہا ہوں!! ۔۔۔ اور ۔۔۔ نہ ان کی صاحبزادی سے!!!"
"کیا مطلب ہے بے تیرا۔؟" ناصر غرایا۔
"مطلب یہی ہے کہ میں آپ کا نوکر نہیں ہوں۔"
فیری نے پھر مداخلت کی۔
"علی۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ میں تمہاری یہ بے ادبی بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔ میں آج ہی ابوّ سے تمہاری شکایت کروں گی۔"
"آپ نے آج تک شکایت کے علاوہ اور کیا کیا ہے؟"
علی کی آواز میں بڑا شکوہ تھا۔
اور جب۔ ناصر نے محسوس کیا کہ علی کسی صورت آج ہار نہیں مان رہا ہے تو۔
اس نے خود ہی بات کا رخ بدل دیا
ایک بار پھر وہ فاردہ کے ساتھ انگریزی میں بات چیت کرنے لگا۔
اب وہ فاردہ سے کوئی ٹریٹ مانگ رہا تھا۔ فاردہ نے پچھلے ہفتے ایک دبیٹ میں اوّل انعام حاصل کیا تھا۔ ناصر کا اصرار تھا کہ آج فاردہ اسے ٹریٹ دے
فاردہ نے خوش ہو کر جواب دیا۔
"بالکل جناب۔ جب تم کہیں گے اور جو کہیں گے پیش کیا جائے گا۔"
"وعدہ۔؟"
"وعدہ۔!"
"اچھا تو گاڑی مڑواؤ۔"
اور گاڑی ناصر کے اشارے پر چلنے لگی۔
مگر جب۔ ناصر نے چاہا کہ گاڑی اسی کے اشارے پر رک بھی جائے تو علی روک نہ سکا۔
"روکو بھئی۔ روکو۔ ناصر چلایا
اب علی کو بولنا پڑا۔
"یہ کہاں رکوا رہے ہیں آپ۔؟ میرے صاحب کی گاڑی کو؟"
اور چونک کر فاردہ نے بھی نظر اٹھائی۔
"ارے۔ ناصر۔ یہ تو "بار" ہے۔"
"جی ہاں جناب۔ یہ بار ہے۔ مگر آپ کو وعدہ پورا کرنا ہو گا۔"
ناصر بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔
گھبرا کر فاردہ نے پھر کہا۔
"لیکن ناصر۔ میں نے تو کبھی شراب کو۔ قریب سے دیکھا تک نہیں۔ میں۔ میں۔"
"ارے چھوڑو پرانی باتیں۔ دقیانوسی خیالات۔ اترو۔ آج۔ میں۔ تمہیں ہی نہیں تمہارے اس بد دماغ ڈرائیور،
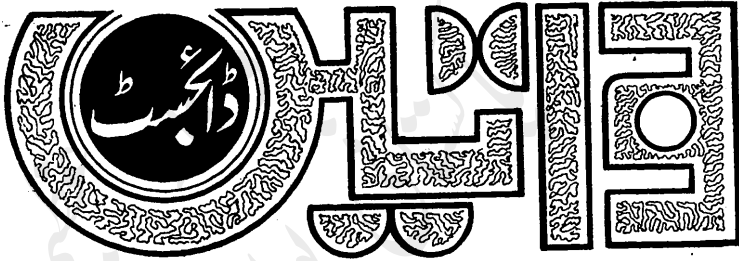
کو بھی اس لذت سے آشنا کرادوں گا۔صرف تمہاری جیت کی خوشی میں۔آج ۔میں تمہارا میزبان۔اور۔تم دونوں میرے مہمان ۔کیوں بے ۔پئے گا ۔چل ۔اتر ۔عیش کر ۔تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

علی نے جواب دیا۔

"ایک بار پھر ۔مجھے یاد دلانا پڑے گا کہ میں ۔اس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں ہوں۔"

ناصر بولا۔

"ابے چل ۔زیادہ نخرے مت کر ۔آؤ۔فیری ڈارلنگ تم بھی اترو۔"

ناصر نے اپنا ہاتھ فیری کی طرف بڑھایا۔

اور۔

اور اس کے ساتھ ہی جھپٹ کر علی گاڑی سے اتر گیا۔

"ناصر صاحب ۔میرے آقا کی صاحبزادی اس مقام پر قدم رکھ کر اپنے والد کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتیں۔"

"ابے ۔ہٹ ایک طرف ۔بڑا آیا مُلا کہیں کا ۔خوشامدی۔"

علی نے کہا

"مُلا نہیں ،صرف مسلمان ہوں ۔مسلمان ۔ویسے مسلمان تو تم بھی ہو ۔لیکن اس وقت تمھیں یاد نہیں۔"

اب ناصر کو غصہ آگیا۔

"فیری ۔تم اپنے اس ڈرائیور کو باز رکھو۔اس کی گھٹیا حرکتوں سے ۔ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

فیری نے علی کو آواز دی

"علی ۔تم واپس آکر بیٹھو گاڑی میں۔"

"ٹھیک ہے ۔میں واپس آجاتا ہوں ۔لیکن صاحبزادی ۔آپ یہاں نہیں اتریں گی۔"

ناصر نے پھر علی کو ڈانٹا۔

"تو کون ہوتا ہے بے ۔منع کرنے والا ۔؟"

"میرے آقا نے مجھے ۔کسی ایسی جگہ گاڑی لے جانے یا صاحبزادی کو لے کر جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔"

"ابے ہٹ پرے ۔بہت دیکھے ہیں ۔تیرے جیسے فرمانبردار۔خبردار جو اب ایک قدم آگے بڑھایا۔"

ناصر نے علی کو دھمکی دینے کے ساتھ ہی ساتھ فارده کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا چاہا۔

"مگر ناصر ۔بات تو سنو ۔تمھیں یہ کیا شوق ہو رہا ہے آج۔" فارده نے گاڑی سے اترتے ہوئے ناصر کو منع کیا۔

"ارے جان ۔شوق تو یہ میرا پرانا ہے ۔ذرا آج تمھارے اس کٹھ مُلا ڈرائیور کے سامنے پیا کروں گا ۔تاکہ اس کا غرور بھی خاک میں ملے ۔بڑا بیچارہ سمجھتا ہے ۔کہ اس سے زیادہ معتبر کوئی ہے ہی نہیں دنیا میں۔"

"ناصر صاحب ۔آپ خود کچھ بھی کریں ۔میرے آقا کی صاحبزادی کو ورغلانے کی کوشش مت کیجیے۔"

"تو ایسے باز نہیں آئے گا ۔لے یہ لے۔"

ایک زناٹے دار تھپڑ ناصر نے علی کے منہ پر لگایا۔

اور

فوراً ہی ۔اس سے دس گنی طاقت کا تھپڑ ۔علی نے بھی ناصر کے منہ پر دے مارا۔

ایک لمحے کو ناصر کے حواس شل سے ہو گئے ۔علی کی جرأت اور اس کے تھپڑ کی بھرپور چوٹ نے اس کا دماغ ہلا کر رکھ دیا۔ غم و غصہ سے دیوانہ ہوتے ہوئے اس نے سارا غصہ فارده پر نکالا۔

ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ اس نے فارده کو گاڑی کی طرف دھکا دیدیا۔

"دفع ہو جاؤ ۔تم بھی۔"

اور۔۔۔ خود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بار کے اندر گھس گیا۔
تلملا کر فارہ نے بھی اپنا خوبصورت اور حسین ہاتھ علی کے گال پہ جما دیا۔
علی خاموشی سے اسے تکتا رہا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"بدتمیز۔۔۔ کمینے۔"
دہکتے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ علی گاڑی دوڑاتا ہوا گھر آگیا۔
مگر۔۔۔ آج اس پہ زبردست چوٹ پڑی تھی۔
وہ جس لڑکی کی پوجا کر رہا ہے۔
جسے اپنے نہاں خانہ دل میں چھپائے بیٹھا ہے۔
جسے عبادت کے لائق سمجھتا ہے۔
اس کا
کردار۔۔۔ اتنا کمزور ہے۔۔؟
وہ ایک لاابالی ۔۔۔ بدمعاش ۔۔۔ اور رالچی انسان کو نہیں پہچان سکتی۔
وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کی بالکل اہلیت نہیں رکھتی۔۔؟
وہ ناصر۔ جو آج اسے شراب خانے تک لے گیا۔ کل اسے۔
بالاخانے پر بھی پہنچا سکتا ہے۔۔۔؟ کتنی گھٹیا پسند ہے اس کی؟
کیسا اندھا اعتماد ہے اس کا۔۔؟!!
اور۔۔۔
میں میں کیسا پاگل ہوں۔
ساری دنیا کی لڑکیوں کو بھلا کر۔۔۔ نظر انداز کر کے۔۔۔ اگر کسی کو دل دیا بھی۔
تو۔۔۔
ایک ایسی لاپروا لڑکی کو۔
جو۔۔۔
میرے خلوص کی قدر تو کیا کرتی۔
میری محبت و عقیدت کو پہچانتی تک نہیں۔۔۔!
بلکہ وہ۔۔۔ الٹا میری نیت پر شک کرتی ہے۔
مجھے طعنے دیتی ہے۔
اور۔۔۔
اس نے اتنی آسانی سے مجھے تھپڑ دے مارا۔
"لعنت ہے۔ لعنت ہے مجھ پر۔
جسے محبت کرنی بھی نہ آئی۔
اور۔۔۔ محبت کرانی بھی نہ آئی۔
ڈوب مرنا چاہیئے مجھے۔
وہ رات بھر پڑا خود کو لعنت ملامت کرتا رہا۔
مگر
دل کی جلن جیسے ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

بلکہ
ایک آگ سی تھی۔ جو سارے سینے میں پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ وہ۔ جلتا رہا۔ جلتا رہا۔ اور۔ جلتا رہا۔
پھر۔ اس جلن کو ختم کرنے کے لئے۔ رات کے جانے کون سے پہر وہ تاروں کی کھلی چھاؤں میں جا کر لیٹ گیا۔
اس امید پر کہ شاید شبنم کی نمی اسے کچھ ٹھنڈک پہنچا سکے۔
وہ۔ کب تک وہاں لیٹا رہا۔ اور کب وہاں سے اٹھا۔
اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔
البتہ۔
جب اس کی آنکھ کھلی تو۔ وہ ہسپتال کے ایک کمرے میں پڑا تھا۔
سینہ۔ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔
اور۔
وہ۔ اس کے قریب جھکی ہوئی کھڑی تھی۔
وہ۔ آنکھیں جھپکا جھپکا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔
"میں۔ کہاں ہوں۔؟"
نفرت آمیز لہجے میں فیڑی نے جواب دیا۔
"ہسپتال کی پہچان نہیں ہو رہی ہے تمہیں۔؟"
"اوہ۔ میں یہاں کیسے آ گیا۔؟ کیا۔ میرا۔ سینہ پھٹ گیا ہے۔؟"
"اسے نمونیہ کہتے ہیں جو۔ تم جیسے احمقوں کو سردی کی رات گھاس کا بستر بنانے کے انعام میں ملتا ہے۔ کہو۔ مزا آ رہا ہے نا۔"
دکھتے ہوئے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر بمشکل وہ پھر بولا۔
"آپ بہت۔ خوش معلوم ہوتی ہیں۔ میری تکلیف سے؟"
"ہاں۔ بہت!"
"حالانکہ۔ آپ تو ایک ڈاکٹر بھی ہیں۔ اور پھر"
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
فیڑی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
علی کہہ رہا تھا۔
"آپ میری تکلیف پر خوش ہیں تو خود کیوں تکلیف اٹھا رہی ہیں آپ۔ بجائے ہسپتال کے۔ مجھے گھر سے باہر بھی پھنکوا سکتی تھیں۔ لیجئے۔ میں چلا جاتا ہوں۔"
فیڑی نے غصے سے کہا
"چلے بھی جانا۔ پہلے اپنے نمونیہ کی تو خبر لو۔ ڈبل نمونیہ ہوا ہے تمہیں۔"
"آپ کی بلا سے۔ میں مروں یا جیوں۔"
وہ اٹھ کر جانے کو تیار ہو گیا۔
اس کا چہرہ بخار کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اور جسم جیسے تھر تھرا رہا تھا۔
"احمق لیٹے رہو۔ مر جاؤ گے۔"
علی نے اسی انداز میں جواب دیا
"میں مرنا ہی چاہتا ہوں۔"

فیئری نے کہا
"تو مر جانا۔۔۔ مگر دوسروں کو کیوں بن موت مارنا چاہتے ہو۔"
وہ سرخ سرخ آنکھوں سے فیئری کو تکنے لگا۔
"دوسروں کو۔۔۔ ؟ دوسرے کون ؟"
جل کر فیئری نے جواب دیا۔
"اب یہ بھی میں ہی بتاؤں ؟ اتنا یاد رکھو کہ۔ میں خوب سمجھتی ہوں! ۔ تم یہ بیماری کا ناٹک کس لیئے رچا رہے ہو ؟"
اب تو علی بالکل ہی برافروختہ ہو گیا۔
"یہ ۔۔۔ یہ بیماری ناٹک ہے ؟۔۔۔ اگر۔۔۔ یہ ۔۔۔ ناٹک ہے تو ۔۔۔ پھر تو ۔۔۔ لعنت ہے ۔۔۔ مجھ پر ۔۔۔ جو ۔۔۔ ایک لمحہ بھی مزید یہاں رکوں ۔۔۔ اور ۔۔۔ آپ کی نوکری کروں ۔"
وہ یکبارگی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
اس کا سینہ کھلا ہوا تھا۔
بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔
اور چہرہ بخار کی حدت سے تمتما رہا تھا۔
وہ ۔۔۔
تیزی کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف بھاگا۔
مگر ۔۔۔
نہ صرف اس کے قویٰ شل ہو گئے۔ بلکہ مارے درد کے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا بھی چھا گیا۔
تیورا کر وہ وہیں چوکھٹ پر گر پڑا۔
دروازے کی کنڈی اس کے ماتھے سے لگی۔
اور ۔۔۔
ایک بار پھر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا
اس بار جب اسے ہوش آیا تو اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس مقرر کی جا چکی تھی۔
ہسپتال کا سارا عملہ ہی اس کا خیال کر رہا تھا۔۔۔ کچھ تو سیٹھ اورنگ زیب کا ملازم ہونے کی حیثیت سے اور ۔۔۔ کچھ فیئری کا ڈرائیور ہونے کی وجہ سے۔
وہ کوئی ایک ہفتہ ہسپتال میں رہا۔ اس دوران میں سیٹھ اورنگ زیب کئی بار اسے دیکھنے آئے۔ فضلو تو اکثر آتا ہی رہتا تھا۔ گو شمسی بھی دن میں ایک آدھ چکر ضرور لگا لیتا تھا ۔۔۔ البتہ ۔۔۔ رویہ فیئری کا بڑا عجیب تھا۔ ان دنوں ۔۔۔ !
وہ اپنے کالج کے دیگر طلباء و طالبات کے ساتھ ہسپتال کی ڈیوٹی پر آتی تھی ۔۔۔ راؤنڈ کے دوران علی کی بھی خیریت پوچھ لیتی تھی ۔ مگر ۔۔۔ بگڑے بگڑے انداز میں۔
لیکن ۔۔۔ جس روز علی کو ہسپتال سے ڈسچارج ہونا تھا۔ اس دن خود بخود ہی فیئری کا موڈ بہت اچھا ہو گیا۔
"چلو۔ علی ۔ میرے ساتھ ہی چلو ۔ گھر ۔"
"آپ آج کل کیسے آتی جاتی ہیں ۔۔۔ گھر سے ۔۔۔ ؟"
"فضلو کاکا نے اپنی پرانی ڈیوٹی سنبھال رکھی ہے ۔"
"چلیئے ۔ اچھا ہوا۔ فضلو چاچا کو تو ویسے بھی اب یہ کام کرنا ہی تھا ۔"
"وہ کیوں ؟"
"میں جو جا رہا ہوں ۔"

"تمھیں جانے کی اجازت کس نے دی ہے؟"
اُس سے پیشتر کہ مجھے نوکری سے نکالا جائے میں خود ہی یہاں سے چلے جانا چاہتا ہوں۔"
"احمق ہو تم۔۔ ابو تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ کیوں جانا چاہتے ہو؟"
"تو۔؟ یہ کونسا مسئلہ ہے۔ مجھ سے پہلے آپ ان کو بتا چکی ہوں گی کہ آپ مجھ سے ناخوش ہیں۔"
"میری بات جانے دو۔ فی الحال مسئلہ ناصر کا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ناصر پر کوئی بات نہ آئے۔ تم سمجھ رہے ہونا۔"
علی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نگاہ اٹھا کر فبیری کو دیکھا۔
"آپ کیا سمجھانا چاہتی ہیں مجھے۔"
"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ۔۔ تم۔۔ اس دن کا قصہ بالکل بھول جاؤ۔ خود ناصر بھی اپنے رویّہ پر شرمندہ ہے۔ وہ دراصل مذاق کر رہا تھا۔۔ اور تم سنجیدہ ہو گئے۔۔ ناصر اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔۔ اس نے خود کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وا توصرف۔۔ تمھیں آزما رہا تھا۔"
"اچھی آزمائش تھی یہ۔۔ بھی۔"
"ہاں۔۔ وہ۔۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمھیں کہاں تک اپنے آپ پر قابو ہے۔"
علی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"میرا خیال ہے کہ تھوڑا بہت تو میرا چہرہ بھی بولتا ہے۔۔ ناصر صاحب نے خواہ مخواہ۔۔ آزمائش اتنی لمبی کر دی۔"
"بہرحال۔ علی۔۔ اب تم فضلو کا کا یا ابو سے کسی قسم کی کوئی بات نہیں کرو گے۔۔ وعدہ کرو۔"
"یہ آپ کا حکم ہے۔۔ یا۔۔ ناصر صاحب کا۔۔؟"
"بھئی۔۔ ظاہر ہے کہ میں تم سے کہہ رہی ہوں تو میری بھی خواہش یہی ہوگی۔"
"ٹھیک ہے۔"
"کیا ٹھیک ہے۔۔ یعنی تم بات مان گئے ہو۔"
"جی ہاں۔۔ میں آپ کی خواہش کا احترام کرنا جانتا ہوں۔"
"گڈ۔۔ تو یہ ہوئی نا بات۔"
فاردہ کا چہرہ کھل اٹھا۔
علی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
پھر جیسے بے اختیار اس کے منھ سے ایک سوال نکل گیا۔
"کیا۔ ناصر صاحب۔۔ واقعی اتنے اچھے ہیں۔"
"کتنے؟"
"جتنا آپ بتا رہی ہیں یا جتنا اچھا آپ انھیں سمجھتی ہیں۔"
"ہاں علی۔۔ ناصر ایک بڑا ہی مخلص لڑکا ہے۔ اس نے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ بڑا غریب پرور لڑکا ہے وہ۔"
"اچھا۔۔ ؟ کیا مصیبتیں جھیلی ہیں انھوں نے۔۔؟"
"بہت سی۔۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔۔؟"
"ایسے ہی۔۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ۔۔ مصیبتیں تو بہت سے لوگ جھیلتے ہیں۔۔ لیکن۔۔ ان کی مصیبتوں کی تودا، تک سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ مگر۔ کتنے خوش نصیب ہیں ناصر صاحب۔۔ جن کی مصیبتوں کا آپ کو اتنا احساس ہے۔"
فبیری نے علی کو پھر سمجھانے کی کوشش کی۔
"تم ابھی ناصر سے بہت دور ہو۔ کبھی موقع ہوا تو تم خود محسوس کرو گے کہ تم نے ناصر کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔"
"خدا کرے۔۔ ایسا ہو۔۔ لیکن امید کم ہے ایسا ہونے کی۔۔"

"اچھا خیر ۔۔ اس وقت تم اتنا یاد رکھنا کہ گھر جاتے ہی ابو تم سے بات کریں گے ۔ جواب ٹھیک ٹھیک دینا ہے۔"
"بہت اچھا"
اور یوں ۔۔ علی ایک بار پھر جاتے جاتے اس گھر میں رُک گیا۔ اب کی بار نہ صرف فاردہ تھوڑی سی اس پہ مہربان تھی۔ بلکہ ۔ ناصر کا رویہ بھی دوستانہ ہو چلا تھا۔
یہ دوستی ۔۔ اگرچہ کسی بدنیتی پر محمول نظر آتی تھی۔ تاہم علی نے اپنی دلی کیفیات اور ردِ عمل کو قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ وہ ۔۔ ہر وقت اور بھی چوکنا رہنے لگا۔
اسے یقین تھا کہ ناصر کی یہ نرمی ۔۔ کسی بدترین سختی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی ۔۔ لیکن ۔۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ناصر کے دل میں کیا ہے ۔۔ اور ۔۔ وہ کب ۔۔ اپنی کمینگی کا مظاہرہ کرے گا۔
بہر حال ۔ اس نے خود کو ۔۔ اپنے آقا اور محسن سیٹھ اورنگ زیب کی خدمت اور عزت و حرمت کی حفاظت کے لیے مزید تیار کر لیا تھا۔
علی
علی
علی
دن رات اس کی زبان پہ بس ایک ہی نام تھا۔ ابھی تک تو دادی اماں اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں ۔ مگر اب علی نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔
ان چند روز میں ہی علی اس کا دوست ۔ بھائی ۔ ساتھی ۔ ملازم ۔ ڈرائیور ۔۔ اور استاد ۔۔ سب کچھ بن بیٹھا تھا۔ گوشی کو علی کا وجود ایک جزو لاینفک محسوس ہونے لگا تھا۔
حالانکہ
ڈرائیور وہ فاردہ کا تھا ۔ خدمت پر وہ فاردہ کی مامور تھا ۔ لیکن دل اس کا ملا تھا گوشی سے ۔ اور گوشی کو پسند آیا تھا تو علی۔
جھٹ پٹ ۔
اور بالا ہی بالا
گوشی نے علی سے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی۔
اب وہ فاردہ کو چڑاتا۔
آپا ۔ تم بڑی پھسڈی ہو ۔ ابھی تک ڈرائیونگ نہ سیکھ سکیں ۔۔ اور ۔۔ میں ۔۔ ذرا مجھے دیکھو ۔۔ بس عمر کی وجہ سے مجبور ہوں ۔ ورنہ لائسنس تو مجھے کب کا مل گیا ہوتا۔"
"اے جاؤ ۔ ڈرائیونگ سیکھ کر کونسا تیر مار لیا تم نے ۔ آجکل بچے بچے کو ڈرائیونگ آتی ہے۔"
گوشی بولا
"ہاں آتی تو ہے اور آنی بھی چاہیئے ۔۔ اسی لئے تو آپا تم سے کہہ رہا ہوں ۔۔ تم کیوں پھسڈی بنی ہوئی ہو۔"
"خبردار گوشی ۔۔ مجھے پھر پھسڈی مت کہنا۔"
"کیوں ۔ کیا سیکھنے کا ارادہ ہے ؟"
فاردہ نے جل کر جواب دیا۔
"آخر تمھیں میری اتنی فکر کیوں ہے ؟ جب میری مرضی ہوگی سیکھ لوں گی۔"
"تمھاری مرضی ۔۔ ہوگی ؟ یا ۔۔ علی کی مرضی ؟"

(نگاہِ التفات جاری ہے ۔ اگلی قسط جون کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

سورج بالکل سامنے آگیا تھا اور تمام صحن تیز چمکیلی دھوپ سے بھر گیا تھا۔ کرنوں کی شدت اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے اس نے کسمسا کر دوسری طرف کروٹ لی اور پھر اردگرد نگاہ دوڑائی۔ دھوپ کافی تیز ہو چکی تھی۔ اس سوئی کچھ جاگی سی فضا میں آنگن میں لگے بوڑھے پیڑ سے لے کر دیواروں کی منڈیر تک ہر چیز اجڑی اجڑی سی لگ رہی تھی۔

صحن کے اس پار برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی اماں پنکھا جھل رہی تھی۔ اماں کی تیز نگاہ بالکل سیدھ میں بیٹھی شانو کی طرف تھی جو چولہے میں گیلی لکڑیاں مسلسل پھونک پھونک کر جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر لکڑیاں جلنے کا نام ہی نہ لے رہی تھیں۔

اس کا دل کڑھ کر رہ گیا۔ کتنی بار سوچا تھا کہ اب کے بازار جا کر وہ مٹی کے تیل والا چولہا ضرور لائے گا۔ شانو کو کم از کم تھوڑا

بول اٹھی۔

"ارے یہ ان بے جان چیزوں پر غصہ کیوں نکال رہی ہے۔ تجھے میں نظر نہیں آتی۔ اٹھ مجھے مار!"

شانو نے دھوئیں سے سرخ ہوتی بھری بھری آنکھوں سے اماں کو دیکھا اور تنک کر بولی۔

"اماں۔ تم خواہ مخواہ بات بڑھاتی ہو۔"

"ہاں بھئی! قصور تو سارا میرا ہی ہے۔ ارے تجھ سے ایک پیالی چائے کیا مانگ لی۔ قیامت آگئی آدھے گھنٹے سے تیرا تماشا دیکھ رہی ہوں۔ تو کیسے کیسے چیل دکھا رہی ہے، کبھی کوئی برتن ٹیک رہی، کبھی پھونکنی مار رہی۔ اے! میں کوئی بچہ ہوں۔ مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے سکھانے چلی ہے۔ ارے سب جانوں یہ سارا غصہ کس بات کا ہے۔"

شانو کی سرخ آنکھوں کا دبا دبا دھواں دہک اٹھا اور

بہار آئے

عظمیٰ ناز

سا تو آرام نصیب ہوگا۔ مگر وہ چولہا لاتا بھی کہاں سے؟ یہ اماں تو گن گن کر ہتھیلی پر پیسے رکھتی ہے۔ مہینے کے آخری ہفتے سے اماں پہلی تاریخ کا حساب انگلیوں پر لگانا شروع کر دیتی ہے اور پہلی تاریخ کو وہ اس کی تمام جیبیں جھاڑ لیا کرتی۔

اس کی جب نئی نئی شادی ہوئی تھی تو وہ شانو کے لئے ایک بار اماں سے چوری چوری اسٹیل کی سنہری سونے جیسی چوڑیاں لایا تھا۔ شانو کے سونے ہاتھ سج اٹھے تو اماں اس کی پہلی جھنکار پر بھاگی آئی تھی۔ اُف وہ نئی دلہن کے سامنے کیسی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ ارے توبہ!

اس کے خیالوں کا سلسلہ یہیں پہ آ کر رک گیا۔

شانو لکڑیوں کے نہ جلنے پر سخت ناراض تھی۔ پھونکنی سے زور زور سے ضربیں لگا رہی تھی اور کم بخت لکڑیاں پھر بھی جلنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ اس نے چادر کو پھر آہستگی سے اوپر تان لیا اور چاہا کہ وہ جو سوتا بنا ہوا ہے سچ مچ کا سو جائے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اماں جو اتنی دیر سے غصہ ضبط کئے بیٹھی تھی

اب وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں اعلان کر رہی تھی۔

"آج کوئی نئی بات تو نہیں چائے تو روز ہی دیتی ہوں"

"تو کیا تیرا مطلب ہے ایک پیالی چائے بھی نہ ہو!"

"یہ میں نے کب کہا اماں؟"

"ارے! تو اور کیسے کہے گی سبھی کچھ تو کہہ دیا تو نے۔ طعنے بھی دیئے جا رہی ہے۔ غصہ بھی اتارے جا رہی ہے۔ ا میں کہتی ہوں اور کیا کرتی تو میرے ساتھ۔ ایک مارنا ہی رہ گیا تو میں کہہ تو رہی ہوں کہ اٹھا پھونکنی اور مار مجھے!"

اماں کی کڑک دار آواز سن کر دیوار سے حشمت خالہ سر نکال کر پوچھنے لگیں۔

"اے کیا ہو گیا آج پھر صبح ہی صبح کیوں جی خراب رہی ہے۔"

"کیا بتاؤں! میری تو تقدیر پھوٹ گئی ہے۔"

اماں پنکھا جھلاتی سٹر پٹر کرتی وہیں دیوار کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ حشمت خالہ نے جوان کا سوکھا منہ دیکھا تو محبت

کے جذبے سے پوچھا۔

"کیا بات کیا ہوئی ہے؟"

"بات کیا ہوتی۔ صبح ہی صبح نگوڑی عادت ہے جو چائے پینے کی سویری کم بخت کہ اس سے مانگ بیٹھی صبح سے لے کر یہ وقت آن پہنچا ہے۔"

اماں کی آواز بھرا گئی تو حشمت خالہ کا دل مارے جوش کے بھر گیا۔

"تو کیا چائے نہ دی اس نے۔"

"چائے تو نہ ملی ہاں! جوتے ملے کبھی ایک چیز کو پھینکتی ہے کبھی دوسری کو پٹختی ہے اور کیسے مارے گی جوتے۔"

اماں مسل مسل کے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ آنچل کے رگڑنے سے ان کی ناک سرخ ہو گئی تھی۔

"تو جی کا ہے کو ہلکان کرتی ہے۔ آجا میری طرف۔ میں تجھے پلاؤں گی۔"

اور جانے اماں نے کیا جواب دیا وہ سن نہ سکا۔ اس لئے کہ اس کا دھیان شانو کی طرف تھا مسلسل پھونکنے سے لکڑی سلگ اٹھی تھی۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ شاید وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

دھوپ منڈیروں سے آنگن میں اتر آئی تھی۔ اب اس سے مزید لیٹا نہ جا رہا تھا۔ لیٹا تو وہ اس ڈر سے تھا کہ اٹھا تو اماں اس کو بھی نہ بخشے گی۔ سو اس لئے وہ جھگڑا ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ لکڑیاں سلگیں تو چائے بھی بن گئی۔ اور جب شانو کے ہاتھ سے اماں نے چائے لی تو ایک بھرپور نظر اس کے اترے اترے چہرے اور روئی روئی آنکھوں پر بھی ڈال لی۔ اب وہ بہت حد تک مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اور حشمت خالہ سے دوسری باتوں میں لگ گئی تھی۔

اس نے سوچا تو بہت تھا کہ وہ اماں سے احتجاج ضرور کرے گا۔ اس لئے کہ سارا قصور اماں ہی کا ہوتا تھا۔ شانو بچاری تو بلاوجہ ہی اماں کا نشانہ بنتی تھی۔ اسے شانو کی بے گناہی کا سو فیصد یقین تھا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ اماں سے دو ٹوک بات نہ کر سکا۔ وہ تھا بھی دو قسم کا۔

وہ ذہنی لحاظ سے بھی بڑا سست آدمی تھا۔ کسی بات پر غور و فکر کرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا جیسی گزر رہی ہے سو گزر رہی ہے۔ مگر یہ تو کہنے کی بات ہے۔ اس کا غور و فکر کرنا بھی بے سود ہوتا کیونکہ زندگی کی تمام فکروں کو ماں نے اس سے چھین رکھا تھا۔

وہ کسی چیز میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔

مگر۔ اب کچھ دنوں سے شانو کی دبی دبی سسکیاں اسے ہر دم بے چین رکھتی تھیں۔ اس نے کئی بار چاہا کہ ماں سے آرام و سکون کے ساتھ یہ گفتگو ہو۔ مگر اپنی دبو فطرت کی وجہ سے وہ اتنی بڑی بات کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ شادی کے معاملے میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں ماں کو اس کے بیاہ کا شوق بہت تھا۔ وہ حشمت خالہ کے ساتھ سر پہ چادر ڈال کر گلیوں کوچوں میں سارا سارا دن ماری پھرتی مگر اماں کو کوئی لڑکی پسند ہی نہ آتی۔

"اے وہ رجو کی بیٹی۔ وہ تو کٹنی ہے کٹنی۔

اے وہ غفور کی لونڈیا! وہ تو ایک بال نہ چھوڑے گی سر میں۔"

اب لاکھ لوگ کہتے۔ لڑکی کی تعریفیں کرتے۔ مگر اماں کو تو صرف اپنی پسند تلاش تھی، اور آخر وہ تلاش کر ہی لائی۔ اماں کو سیدھی گائے جیسی لڑکی چاہیئے تھی۔ سو وہ مل گئی۔ بیاہ کرتے کے ساتھ ہی اماں کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ جانے کیا ضد تھی اماں کو کہ تنہائی اور وصل کی گھڑیوں کا ایک ایک لمحہ چھیننے کی کوشش کرتی اور وہ کوئی چرایا ہوا لمحہ لاتا بھی کہاں سے۔ دو کمرے کا چھوٹا گھر کچا صحن اور ایک چھوٹا سا برآمدہ۔ جس کے ایک طرف باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ وہ تھکا ہارا کام سے لوٹتا تو اس کا بڑا جی چاہتا کہ شانو اس کے پاس رہے۔ مگر شانو کی جگہ ہمیشہ اماں موجود رہتی۔ اور شانو! وہ تو گیلی لکڑیوں سے سر کھپاتی نظر آتی ماں کی یہ احتیاط پسندی اور بندشیں اسے بہت بری لگتیں مگر جی ہی جی میں کڑھ کر رہ جاتا۔

زبان ہلانے کی اسے کبھی ہمت نہ پڑی۔

کبھی کبھی وہ جلدی گھر آ جاتا اور اماں کی نظر بچا کر سیدھا باورچی خانے کی طرف لپکتا۔ مگر اماں آہٹ خوب پہچانتی تھی۔ فوراً چارپائی سے اتر کر سنکھیا ملاتی اس کے سر پہ آن پہنچتی۔

"اے باؤلا ہوا ہے کیا۔ گرمی میں کیا کر رہا ہے یہاں تو! چل صحن میں آ کر بیٹھ۔ ادھر خراہوا ہے۔"

اور فوراً ہی سر جھکائے اماں کے حکم کی تعمیل میں مرے مرے قدموں سے باہر صحن میں آ جاتا۔ جہاں چارپائی بچھی تھی۔ اماں کے ساتھ اسے بھی بیٹھنا پڑتا۔ وہیں سے چپکے چپکے شانو پر نظریں ڈال لیتا۔ اس کا اترا اترا چہرہ دیکھ کر اسے ماں پر سخت غصہ آتا۔ اس کا دل چاہتا کاش! اس کے پاس کوئی سلیمانی ٹوپی ہوتی جسے اوڑھ کر وہ ماں کی نظروں سے اوجھل ہو مگر یہ ماں بھی تو جادوگر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ وہ سارا سارا دن شانو کو کام کاج میں الجھائے رکھتی۔ بات کرنے کا موقع کیا خاک ملتا اس کا دل ماں کی طرف سے بدظن ہو جاتا۔

ہاں! رات اپنی نرم بانہیں پھیلائے جب سارے گھر میں پھیل جاتی تو وہ سکون کی ایک ٹھنڈی سانس لیتا۔ جب وہ سونے کے لئے لیٹتا تو شانو کا اترا ہوا مغموم چہرہ اس کے بے حد قریب ہوتا۔

ذرا سی ہمدردی پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔

ہر رات وہ اس سے وعدہ کرتا کہ اب ماں نے کوئی برا سلوک کیا تو وہ ماں کو ٹوک دے گا۔ زیادتیوں کا احساس ضرور دلائے گا۔

مگر پھر! جب صبح ہوتی تو۔

ماں کا سامنا ہوتے ہی رات کا وعدہ بھولنے لگتا۔ اور شانو شکوہ بھری نگاہ لئے برتن مانجھنے کے لئے صحن میں لگے نلکے

کے پاس بیٹھ کر راکھ بھرے ہاتھوں سے زور زور سے برتن مانجھنے شروع کر دیتی۔

کل ہی صبح کی بات ہے جب جھگڑا شروع ہوا تو وہ ماں کے پاس بیٹھا تازہ اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ اسے خبر نہ تھی کہ بات کیسے شروع ہوئی، کس نے شروع کی۔ ماں کی گونج دار آوازیں سن کر جب اخبار سے نگاہ اٹھائی تو شانو آنکھوں میں آنسو بھرے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دونوں کو یونہی لڑتا جھگڑتا کسی تماشائی کی طرح خاموش بیٹھا تماشہ ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر جھگڑا نہ رکا۔ ماں مسلسل شانو پر برس رہی تھی۔ فساد کی جڑ وہی صبح کی چائے تھی جس کی ماں کو نشے کی طرح عادت ہوگئی تھی۔ اور شانو کو بھی دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ ماں چائے کا غصہ بات بات پر نکال رہی تھی اور اماں کی زبان ایک بار چل جائے تو دوبارہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔

وہ مجرم کی طرح سر جھکائے شانو کو دیکھ رہا تھا جو چور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

آنسو مسلسل اس کے گالوں پہ بہہ رہے تھے۔ وہ اسکو سرد مہر اور بے حس پا کر گھٹنوں میں منھ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی تو وہ گھبرا کر باہر جانے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔ ماں اب بھی بڑبڑا رہی تھی۔

○

شام کو بھی وہ بے مقصد ادھر ادھر وقت گزارتا رہا۔

اسے گھر جاتے ہوئے سبکی کا احساس ہو رہا تھا۔ شانو کے روانی سے بہتے آنسو جو صبح دیکھے تھے۔ اب تک دل پر اثر کئے ہوئے تھے۔ اس نے بالکل طے کر لیا کہ کل صبح ہی صبح وہ ماں سے دو ٹوک بات کرے گا۔ بھلا ایسی بھی کیا سنگدلی شانو جب سے بیاہ کر آئی ہے۔ تو نے سیدھے منھ اس سے بات نہ کی سدا اس کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برستی رہیں۔ ایک تو بیچاری سوتیلی ماں کے سلوک سے ادھ موئی ہوگئی تھی دوسرے تو نے اس گھر میں لا کر کون سا سکھ دیا ہے۔ دیکھ اب بہت ہوچکی اب شانو کو کچھ نہ کہنا ماں!

یہ سوچ کر وہ کافی حد تک پرسکون ہوگیا۔

شبیر گلفروش اس کا پرانا یار تھا۔ وہیں رک کر اس نے شانو کے لئے موتیئے کے موٹے موٹے گجرے بنوائے اور اس کی لمبی چوٹی کے لئے وینی بنوا کر اس کی دکان سے اٹھ آیا۔ راستے میں ہی اس نے خوب اچھا سا پکی پان کا بیڑہ بنوایا۔ ایک اپنے کلے میں دبا کر دوسرا شانو کے لئے رکھ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ رات ہوگئی تھی اور وہ چاہ بھی یہی رہا تھا کہ رات کچھ اور سرک جائے تا کہ ماں گہری نیند سو چکی ہو اور واقعی قسمت مہربان تھی جو ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ شانو نے دروازہ کھول کر پیٹھ پھیر لی تھی۔ آج وہ اس سے بہت خفا تھی۔ اس نے شانو کے چھوٹے سے ہاتھ کو تھام لیا۔

"تو مجھ سے خفا ہے شانو؟"

اور شانو صبح سے جو طوفان روکے بیٹھی تھی ایکدم بہہ نکلا۔ آخر ہچکیاں رک گئیں۔

شانو کے من کا دھندلا غبار مٹ گیا۔

اب وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موتیئے کے گجرے تھے۔ یہ گجرے اس نے باندھے تھے۔ اور لمبی سی چوٹی میں وینی لگا کر وہ پھول کی طرح کھل گئی تھی۔ وہ اسے مسکراتا دیکھ کر خود بھی ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

"اب تو ناراض نہیں ہے نا؟"

"نہیں۔۔۔!"

شانو کی بھیگی ہوئی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

"بس ایک شکایت ہے تجھ سے مجھے صبح میرے لئے تو کیوں نہ بولا"

"میں کیا بولتا شانو تو بتا۔

اس نے مجرم کی طرح سر جھکا کر کہا۔

شانو کی مسکراتی آنکھیں اس بزدلی پر بھرنے کو تیار تھیں۔

"اور جو تو نے وعدہ کیا تھا!"

"کہا تو تھا شانو!"

وہ بہت بے بسی سے بول رہا تھا اور شانو پھر بدگمان ہو رہی تھی۔

"پھر۔۔۔؟"

"پھر کیا ایسوچ کر چپ رہتا ہوں کہ جھگڑا اور بڑھ جائیگا۔

"کبھی میرے بارے میں بھی سوچا ہے؟"

"سوچتا تو رہتا ہوں شانو!" "خاک سوچتے ہو"

"میں سچ کہتا ہوں شانو اپنے رب کی قسم!"

"اگر سچے ہوتے تو مجھے یوں تنہا چھوڑ کر چلے جاتے؟"

شانو کی آنکھیں پھر جل تھل ہوگئیں۔ وہ ماں کی زیادتیاں راجو کو گن گن کر بتا رہی تھی اور اس وقت بھی اس کے آنسوؤں سے وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔

اب اس کا ارادہ اور پختہ ہوگیا۔ وہ ماں کی زیادتیوں پر ضرور احتجاج ضرور کرے گا۔ اس نے شانو کو اطمینان دلایا۔ وعدہ کیا تھا

اب اس کا ارادہ اور پختہ ہوگیا۔ وہ ماں کی زیادتیوں پر ضرور احتجاج کرے گا۔ اس نے شانو کو اطمینان دلایا۔ وعدہ کیا شانو اس وقت ہواؤں پر اڑ رہی تھی۔ دن بھر کی کلفتیں اور پریشانیاں جیسے بھک سے اڑ گئی تھیں۔ شانو کا ہاتھ اب بھی راجو نے تھام رکھا تھا۔ شانو کا جی چاہا

یہ ہاتھ!

مخلص اور جفاکش ہاتھ

یونہی اس کے ہاتھوں کو تھامے رہیں۔ وہ اس وقت بہت سکون سے بیٹھی راجو کی بے چینیاں اپنے دل میں سمیٹ رہی تھی۔ راجو نے سارا دن اس کے بارے میں سوچتے سوچتے جس طرح بے قرار دن گزارا تھا وہ تمام احوال اسے سنا رہا تھا اور وہ سچ مچ بہت ہلکی پھلکی ہو کر بادلوں میں اڑ رہی تھی۔

اور پھر وہ سو گئی آنے والی کل کے خواب دیکھتے دیکھتے۔

میٹھی اور پرسکون نیند۔

اور صبح!

اس کے رات کے خوابوں کا نشہ ٹوٹنے لگا۔

اماں کی کڑک دار آواز اور پھونکنی کو لکڑی پر مارتی شانو کو دیکھ کر وہ چپکے سے سوتا بن گیا تھا۔

شانو نے غصے سے اسکے کسمساتے وجود کو دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ راجو بن کے سویا ہوا ہے۔ ڈرپوک کہیں کا۔

اس نے نفرت سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا اور عین اسی وقت اماں چلچلاتی دھوپ کی طرح اس کے سر پر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔ ماں کا سامنا ہوتے ہی اس کا سر جھک گیا۔ زبان تالو سے جا لگی۔ سارا بدن پسینے سے ڈوب گیا۔ شانو کی طرف دیکھنے کی اس میں سکت نہ رہی۔ وہ چپ چاپ اٹھا منہ ہاتھ دھونے کے لئے صحن میں لگے نلکے کے پاس آیا جہاں شانو نے ڈھیروں برتن مانجھنے کے لئے رکھے تھے۔ اس نے باورچی خانے کی طرف دزدیدہ نظر ڈالی۔ شانو کچھ دیر تک یونہی غصے میں کھڑی سانسوں کو ہموار کرتی رہی۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھر کے اپنی لمبی کالی چوٹی سے موتیے کے گجرے نکالے۔ نفرت اور غصے سے اس کی طرف پھینک دیئے جو راکھ کے برتن سے ہوتا ہوا اس کے پیروں میں آن گرا تھا۔ اور پھر اس کا سر جھکتا چلا گیا۔

انسان اور سائے

ریحانہ زیدی

وہ بہت ہانپتی کانپتی تقریباً بھاگتی ہوئی اوپر آئیں اور دھڑام سے برآمدے میں رکھی چوکی پر گر گئیں۔

دھماکے کی آواز سن کر جمانہ باہر نکلی تو دیکھا ممی چوکی پر بے سُدھ پڑی ہیں۔ اس نے پریشان ہو کر انھیں ہلایا۔

مگر وہ اپنے حواسوں میں نہ تھیں۔

پسینے سے شرابور جسم۔

زرد رنگت۔

کھلے ہوئے ہونٹ۔

پھٹی پھٹی آنکھیں۔

"ممی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" جمانہ چیخ مار کر ان سے لپٹ گئی۔ مگر ان کو پھر بھی جنبش نہ ہوئی۔ جمانہ بھاگ کر اندر گئی۔

"محسن جلدی نکلو" اس نے باتھ روم کا دروازہ پیٹ ڈالا۔

محسن نہا چکا تھا۔ جمانہ کے چلانے پر جلدی جلدی کپڑے پہن کر باہر آگیا۔

ممی اس وقت کروٹ لئے ہچکیاں لے رہی تھیں۔

ممی جو ناقابلِ تسخیر دیوار مشہور تھیں۔

ممی جو ہر وقت تنی ہوئی گردن کے ساتھ ہر ایک سے باتیں کرتی تھیں۔ جنھوں نے کبھی اپنے گھریلو حالات کی دنیا کو خبر نہ ہونے دی ۔۔ اپنی ممی کو اس وقت یوں روتے دیکھ کر محسن بھی چکرا گیا۔

"کیا ہوا ممی۔ بات کیا ہے آخر" اس نے بہ مشکل تمام ممی کو سیدھا کیا۔ ممی نے ایک چیخ مار کر دوبارہ گردن ڈال دی۔

جمانہ دھاڑیں مارنے لگی

محسن ڈاکٹر کو بلانے دوڑ گیا

"یا اللہ! کیا ہوا میری ممی کو ۔۔ اچھی بھلی مینا بازار میں شرکت کرنے گئی تھیں اور اب یہاں یوں لشت پڑی ہیں" جمانہ رونے لگی۔

اتنے میں محسن ڈاکٹر کو لے آیا۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا۔ طاقت کا انجکشن لگایا اور سکون بخش دوائیں لکھ کر محسن کو دیں۔

اتنے میں وہ ہوش میں آچکی تھیں۔

انھوں نے بوکھلا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔

"آپ یہاں کیسے آگئے .... آپ کو گھر کا پتہ کس نے بتایا؟" انھوں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا

"جی .... میں سمجھا نہیں۔ میں تو آپ کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔ مجھے محسن صاحب لیکر آئے تھے" ڈاکٹر نے دو قدم پیچھے ہٹ کر حیرت سے کہا۔

"اوہو ۔ سوری ڈاکٹر" وہ پشیمان ہو کر لیٹ گئیں۔

خوف کے بگولے ان کے ذہن میں چک پھیریاں لگاتے پھر رہے تھے۔

"اللہ یا تو کل نہ آئے یا پھر وہ ہی مر جائے۔"

"نہیں ۔ توبہ توبہ اللہ میاں انہیں کچھ نہ ہو ۔ انھوں نے آپ ہی آپ توبہ کی۔

وہ اتنا اچھا انسان بھلا کیوں مرے۔ ان کے جھوٹ اور لفاظی کی سزا وہ کیوں بھگتے۔ وہ پھر دل میں پشیمان ہونے لگیں۔

کتنی بری ہوں میں۔ مجھے واقعی سزا ملنی چاہیئے۔ بھلا مجھے ضرورت کیا تھی۔ اتنے ہوائی قلعے کا نقشہ کھینچنے کی۔

مگر اس میں میرا قصور بھی کتنا ہے؟

یہ تو سارے قسمت کے الٹ پھیر ہیں

انھوں نے بہت سختی سے آنکھیں بند کیں۔

بہت نرمی سے خواب پلکوں میں اتر آئے۔

یہ تو شہزادی ہے۔

رانی ہے رانی۔

کہیں کی ملکہ بننے کے لائق ہے۔

اللہ نے گدڑی میں لعل دیا ہے۔

ہر طرف انہی جملوں کی گونج نے انہیں ہواؤں کے دوش پر اڑنا سکھا دیا۔

ہر لمحہ لگتا جیسے کسی محل میں گھوم رہی ہوں۔

کسی تالاب کے کنارے خواصوں سے چہلیں ہو رہی ہوں یا پھر کوئی دربار لگا ہو۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھی احکامات پر عمل کروا رہی ہوں۔

تعلیمی دور آیا تو ہر ڈرامے میں ان کو مرکزی کردار ملتا۔

ان باتوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

بڑی بہنیں کام کرتی رہتیں اور وہ مرکزی کردار کی طرح اپنی دنیا میں مگن رہتیں۔

وہ کل تین بہنیں تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا۔ والد کی تنخواہ معمولی تھی مگر نام بڑا تھا۔ وہ کسی زمیندار صاحب کی زمینوں کے منیجر تھے۔ ان کے مالک ان کے کردار سے اتنے زیادہ مطمئن تھے کہ انھیں رہنے کے لئے مکان کا دو کمروں والا پچھلا حصہ دے رکھا تھا۔

بس یہیں سے ان کی زندگی کے پیچ و خم شروع ہو گئے۔

وہ اسکول میں سب سے یہی کہتیں کہ وہ لال رنگ کا ہمارا مکان
ہے۔ زمیندار صاحب ہمارے انکل ہیں۔ اسی لئے ہم ساتھ رہتے ہیں۔
فلاں صاحب ہمارے ماموں لگتے ہیں۔ تو فلاں ہمارے کزن ہیں۔
ویسے بھی وہ زمیندار صاحب کے گھر میں اتنا گھل مل کر رہتی تھیں
کہ سب یہی سمجھتے تھے کہ یہ ان کی کوئی رشتہ دار ہیں۔ بڑی بہنوں کی
شادی ہوگئی تو وہ اور بھی آزاد ہوگئیں۔ اسکول میں غریب لڑکیوں
سے زیادہ بات نہ کرتیں۔ ان کی دوستی ہمیشہ اونچے طبقے سے رہی۔
باپ کے پاس میٹرک سے زیادہ پڑھانے کا حوصلہ نہ تھا۔ مگر ان میں
آگے پڑھنے کی امنگ تھی۔ زمیندار صاحب کی بیٹی عظمیٰ پھول بنانے
کا کورس کر رہی تھی۔ وہ اس سے سارے ڈیزائن سیکھا کرتیں۔ وہ اس
فن میں اتنی ماہر ہوگئی تھیں کہ ہر کوئی ان کے بنائے ہوئے پھولوں کی
تعریف کرتا۔ انھوں نے عظمیٰ سے زیادہ پھولوں میں مہارت حاصل
کرلی تھی۔

شہر میں مینا بازار کا اہتمام ہوا تو انھوں نے زمیندار صاحب کی
خوشامد کرکے کسی نہ کسی طرح ایک اسٹال بھی اپنے لئے بُک کروالیا۔
زمیندار صاحب ویسے بھی ان کے شوق کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے
تھے۔ انھوں نے کافی مدد کی۔ عظمیٰ کو ان جھمیلوں میں پڑنے کا کوئی
شوق نہ تھا۔ وہ تو بس وقت گزاری کے لئے سیکھ رہی تھی۔ لہٰذا ان
کو اکیلے ہی اپنے بنائے ہوئے پھولوں کے ہجوم کے ساتھ اسٹال پر کھڑا
ہونا پڑا۔

جو بھی ادھر سے گزرتا ایک نظر ان کے پھولوں کو دیکھ کر تعریف
ضرور کرتا۔ مینا بازار تین دن کے واسطے لگا تھا۔ پہلے دو دن صرف
خواتین کے لئے وقف تھے۔ تیسرا اور آخری دن مردوں کے لئے
مسرتوں کا پیغام لایا۔ انہیں اپنی فیملی کے ساتھ آنے کی اجازت
تھی۔

دو دن تک ان کی دوکان کافی چمکی تھی۔ آج کے واسطے
انھوں نے خاص طور سے شوخ رنگ کے پھول بڑی محنت سے
بنائے تھے اور بڑی مستعدی سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہی
تھیں۔

آج لوگ جوق در جوق ان کے اسٹال پر آرہے تھے۔ بے
تحاشہ سیل ہوئی۔ مگر اب بھی کچھ پھول باقی تھے۔ وہ ان کو نئے سرے
سے ترتیب دے کر گاہکوں کے انتظار میں تھیں۔ لوگوں کا ایک غول
ادھر سے گزرا۔

"آیئے تشریف لایئے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"بڑے خوبصورت پھول ہیں۔" کوئی خاتون مول تول کرنے لگیں۔

مگر جو پھول مجھے پسند آیا ہے، وہ شاید بکاؤ نہیں ہے۔
کسی کی آواز پر وہ پیکنگ کرتے ہوئے چونک کر پلٹیں
پکی عمر کے صاحب تھے۔ شوخ نظریں ٹکرائیں تو انھوں نے
گڑبڑا کر سر جھکالیا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟" خاتون نے پتہ پوچھا۔

"یہیں نزدیک ہی۔" انھوں نے بات ٹال دی۔

انھوں نے آج تک کسی کو اپنے گھر کا ٹھیک پتہ نشان
بتایا ہی نہ تھا۔

مگر ڈھونڈنے والے تو خدا کو بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ رات
گئے جب اسٹال ختم کرکے زمیندار صاحب کی جیپ میں بیٹھ رہی
تھیں تو انھوں نے دیکھا نیلی مزدا میں وہی صاحب بیٹھے سگار پی
رہے تھے۔ ان کی جیپ کے کچھ فاصلے پر وہ مزدا ان کے پیچھے پیچھے
گھر تک آئی اور پھر آگے بڑھ گئی۔

انھیں ساری رات نیلی مزدا اور جلتے سگار نظر آتے رہے
دوسرے دن وہ سب لوگوں کو خوشی خوشی اپنی آمدنی کا حساب بتا
رہی تھیں کہ عظمیٰ نے ان کو اپنی طرف بلوا بھیجا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے وقت وہ دھک سے
رہ گئیں۔ کل والے صاحب کئی خواتین کے ساتھ وہاں بیٹھے تھے
ان کو چکر سا آگیا۔

اب ان کو پتہ چلے گا کہ میں زمیندار صاحب کے معمولی منیجر
کی بیٹی ہوں تو یقینی بھاگ جائیں گے۔ یہ لوگ شاید جیپ اور عالی
شان مکان سے مرعوب ہوکر آئے ہوں گے۔

وہ پسینے میں نہائی جارہی تھیں۔ خوف اور شرمندگی سے ٹانگیں
لرز رہی تھیں۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سب لوگ کیا باتیں
کر رہے ہیں۔ بابا کمرے میں آنے لگے تو وہ اٹھ کر واپس آگئیں۔

مگر ان کے سارے خدشے سارے تفکر بے بنیاد ثابت ہوئے
زمیندار صاحب کے بیچ میں پڑنے سے یہ رشتہ ہوگیا اور وہ فرقان
احمد کے گھر بیاہ کر آگئیں۔ فرقان احمد جو بہت اچھے خاندان کے
تنہا انسان تھے۔ سر پر کسی بزرگ کا سایہ نہ تھا اس وجہ سے شادی
نہ ہوپائی۔ کچھ ان کی پسند کا بھی دخل تھا۔ وہ خود انہی باتوں کی وجہ
سے چالیس کے پیٹے میں آگئے تھے مگر پسند اب بھی بہت اونچی تھی۔
دوستوں کا خیال تھا کہ شاید ان کی پسند کی لڑکی پاکستان میں ملنے
سے رہی۔

اس دن بھی وہ اپنے بہت اچھے دوست کی فیملی کے ساتھ
مینا بازار دیکھنے آئے تو ان کو اچانک پھولوں کے درمیان گھرا ہوا

ایک نوخیز پھول پسند آگیا۔

انھوں نے بہت دن بعد کھل کر اپنی پسند کا اظہار کیا تھا۔ نادرہ کے گھر والوں نے ان کا اشارہ پاتے ہی وہ جدوجہد کی کہ ان کی پسندیدہ لڑکی ان کی بیگم بن کر گھر میں آہی گئی۔

بیگم فرقان احمد بننے کے بعد ان کے دماغ اور بھی اونچے ہو گئے فرقان خود بھی شاہ خرچ تھے۔ وہ ان سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر نکلیں۔ پہلی بار انھوں نے فراغت دیکھی تھی۔ اتنی اونچائی دیکھ کر بوکھلا گئیں۔ اپنے اونچے اسٹیٹس کی وجہ سے ماں باپ کے گھر بہت کم جاتیں۔ بہنوں سے ملنا تو انھوں نے عرصہ ہوا چھوڑ رکھا تھا۔ خود تو ان لوگوں کے گھر جاتی ہی نہ تھیں۔ اپنے گھر بھی اگر کوئی تقریب ہوتی تو کسی کو نہ بلاتیں۔

سالوں بعد سب سے اماں کے مرنے پر ملیں۔ وہ بھی بس کھڑے کھڑے انھیں کہیں ڈنر پر جانا تھا۔

لوگ انگشت نمائی کرتے رہ گئے۔ اور تو اور انھیں بابا کے دکھوں کا بھی احساس نہ رہا۔ ماں کے مرنے کے بعد انھوں نے بابا سے جھوٹے منہ بھی اپنے گھر آنے کو نہ کہا۔

فرقان نے ایک آدھ بار سمجھانے کی کوشش بھی کی، مگر ان کے دماغ تو عرشِ معلیٰ پر تھے۔ بھلا کمتر لوگوں سے کیسے رابطہ رکھ سکتی تھیں۔

محسن کے بعد حبانہ ہو گئی تو کچھ ان کے معمول میں فرق پڑا اب وہ ہر جگہ فرقان کے ساتھ جانے کے بجائے بس خاص خاص جگہوں میں شریک رہتیں۔

فرقان اور ان کے دوستوں نے مری کا پروگرام بنایا۔ حبانہ کو ان دنوں خسرہ نکلی ہوئی تھی۔ وہ اپنی شدید خواہش کے باوجود فرقان کی پارٹی کے ساتھ نہ جا سکیں۔ مگر فرقان نے ان سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ سردی کم ہونے پر وہ ان کو بچوں سمیت مری گھما لائیں گے۔

مگر یہ وعدہ وفا نہ ہو سکا۔

مری میں برف باری دیکھنے کے شوق میں فرقان کی گاڑی ایک موڑ کاٹتے ہوئے کھڈ میں جا گری۔

انھوں نے زندگی کے اس روپ کے متعلق تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس موڑ کے لیے تو تیار ہی نہ تھیں۔ انھوں نے تو ہمیشہ روشنیوں کی خواہش کی تھی۔ اندھیرا پا کر بوکھلا گئیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ۔ میکے سے انھوں نے کبھی رابطہ ہی نہ رکھا تھا۔ بابا بھی پچھلے دنوں حج کے دوران مکہ میں انتقال کر گئے تھے۔ بہنیں ان کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ ادھر سسرال میں بھی کوئی قریبی رشتہ دار نہ تھا۔ جو دور کے تھے ان سے فرقان خود الرجک تھے تو بھلا وہ کیسے مل سکتی تھیں۔ اب تک انھوں نے فرقان کے روپے پیسے کی کوئی چھان بین نہ کی تھی مگر اب جو انھوں نے حساب سنبھالا تو ہوش اڑ گئے۔ مکان کا کرایہ تھا۔ گاڑی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ بینک بھی ان کی شاہ خرچیوں کے باعث انھیں کوئی آس نہ دلا سکا۔

مگر انھوں نے جھکنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔

لفظ ہار سے انھیں سخت نفرت تھی۔

کسی جاننے والے کے توسط سے انھوں نے فلیٹ کا آدھا حصہ کرائے پر لے لیا اور مصنوعی پھول بنانے والی فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ دونوں بچوں کو اسکول چھوڑ کر وہ فیکٹری جاتیں اور وہاں سے واپسی میں ان کو لیتی آتیں۔ بیوہ ہونے کے باوجود ان کی ٹپ ٹاپ اور زندہ دلی نہ ختم ہوئی۔ فرقان کے حلقۂ احباب سے انھوں نے کنارہ کشی اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی کبھی اپنے گھر جھوٹے منہ بھی آنے کو نہ کہتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی ان کو بھولنے لگے۔ اب انھوں نے نئے نئے تعلقات پیدا کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ ہمیشہ ایسے لوگوں سے ملتیں جہاں فائدے کی امید ہوتی۔ کوئی غیر ممالک کے دورے زیادہ کرتا تو وہ بھی ان کا پرخلوص دوست بن جاتا۔ آتے جاتے پھولوں کے گچھے بک جاتے۔ ان کی اچھی بھلی کمائی ہو جاتی۔ گھروں کی مختلف تقریبات کے لیے انھوں نے ایک ڈیکوریشن کمپنی کے مالک سے رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ غرض اتنے ہاتھ پیر مار کر وہ اپنا اچھا بھلا خرچہ نکال لیتیں۔ فیکٹری کی تنخواہ الگ ہوتی۔

ذرا سکھ کا سانس آتے ہی ان کو فلیٹ کی زندگی دوبھر لگنے لگی۔ دماغ تو ان کے ہمیشہ سے اونچے تھے۔ وہ فلیٹ جس میں انھیں سر چھپانے کا آسرا مل گیا تھا، اب ان کو مرغی کا ساڈربہ لگنے لگا تھا۔

بچوں کے امتحان ختم ہوتے ہی انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے ایک اچھے علاقے میں کسی بنگلے کا اوپری حصہ کرائے پر حاصل کر لیا۔ چھوٹا تو یہ بھی تھا مگر بلا سے بنگلے کا اوپری حصہ تو تھا۔ دور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے نا کہ کسی بنگلے میں داخل ہو رہی ہیں۔ فلیٹوں کی طرف جاتے ہوئے تو انھیں شرم آتی تھی۔

مگر یہاں آکر بھی انھوں نے اپنی روش نہ چھوڑی۔ بس لوگوں سے دور ہی کا واسطہ رکھتیں۔ گھر مدعو کرنے کے معاملے میں ہمیشہ بہانہ بنا دیتیں۔ کوئی کسی کامیابی پر پارٹی مانگتا تو ہوٹل میں لے جاتیں۔

فیکٹری والوں کے اصرار پر گھر سے کوئی اچھی چیز پکا کر لے آتیں۔
مگر گھر۔
ان کا گھر بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا۔
اور جنھوں نے دیکھا بھی تھا ان کو یہی معلوم تھا کہ .....
پورا بنگلہ ان کا ہے۔ نچلے حصے میں کرایہ دار رہتے ہیں۔ وہ خود اوپری حصے میں اس وجہ سے رہتی ہیں کیونکہ ان کی فیملی بہت مختصر ہے پھر کرایہ بھی اچھا ملتا ہے۔ اگر کوئی ڈھیٹ انسان ان کے گلے پڑ کر گھر تک آ بھی جاتا ہے تو وہ اسے نیچے والوں کے ڈرائنگ روم میں بٹھاتیں اور یہی بتاتیں کہ انھوں نے نچلا حصہ کرائے پر دیتے وقت یہ ڈرائنگ روم اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ مہمان کے جانے تک وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتیں۔ مبادا کہ نچلے حصے والے ان کی پول ہی نہ کھول دیں۔ نیچے والے خود کرائے پر رہتے تھے اور بہت شریف لوگ تھے۔ ان کے ہاں کی خواتین سوشل نہ تھیں۔ اس وجہ سے ان کے ملنے والوں سے کتراتی تھیں۔ پھر خود انھوں نے بھی کبھی جھوٹے منہ ان لوگوں کو اپنے ساتھ شریک نہ کیا تھا۔
دن بہت آرام سے گزر رہے تھے۔ وہ معمول کے مطابق فیکٹری جاتی تھیں۔ اسی دوران انھیں فیکٹری ہی میں اطلاع ملی کہ شہر میں ایک ہفتے بعد مینا بازار لگ رہا ہے۔ دوکانوں کی بکنگ جاری ہے۔
انھیں پہلے ہی مینا بازار میں دوکان لگانے کا تجربہ اور سلیقہ تھا۔ ساتھ ہی توصیفی سند بھی موجود تھی۔ ذرا سی جدوجہد کے بعد انھیں بھی ایک دوکان مل گئی۔
انھوں نے رات دن کی محنت کے بعد بے انتہا خوبصورت پھول تیار کئے۔ دوکان سجانے میں بھی اپنی ساری مہارت صرف کر دی۔
پورے مینا بازار میں بہت کم دکانیں تھیں جن پر بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اور ان دوکانوں میں ایک ان کی دوکان بھی تھی۔ اب کی بھی ان کی بہت سیل ہوئی۔ مینا بازار آٹھ دن کا تھا اور ان آٹھوں دن وہ پھول بنا بنا کر تنگ آ گئیں مگر لوگ خریدتے نہ تھکتے۔
آخری دن وہ کاؤنٹر پہ بیٹھی اپنی اور فرقان کی ملاقات یاد کر رہی تھیں
کہ ایک خوبصورت سا لڑکا پھول خریدنے آ گیا
"کیا بتاؤں آنٹی۔ آپ نے اتنے غضب کے پھول بنائے ہیں کہ میری بیگم کی ساری سہیلیاں چڑیلوں کی طرح میری جان کو آ گئی ہیں۔ روز نئے پھول لانے کی فرمائش ہوتی ہے اور مجھے آپ کے پاس آنا پڑتا ہے۔ کیوں آنٹی۔ آپ کی آدھی دوکان تو میں خرید ہی چکا ہوں گا۔" اس نے گل داؤدی اور بیلے کی کلیوں کے گچھے خریدتے ہوئے پوچھا۔
"آدھی دوکان اگر نہیں بھی خریدی تو بہرحال سب سے زیادہ خریداری آپ ہی نے کی ہے۔" وہ ہنس کر بولیں
"آنٹی! میری بیگم کو بھی یہ فن سکھا دیں۔ تاکہ کچھ میری بچت ہو۔ ابکی انھوں نے آپ کے پھولوں کی خاطر میری پاکٹ میں بھی ڈنڈی مار دی۔" وہ بڑے دلچسپ انداز میں باتیں کرتا تھا۔
"ہاں ہاں ضرور سکھا دوں گی۔" انھوں نے خوش دلی سے کہا۔
"مگر آنٹی آپ رہتی کہاں ہیں یہ تو بتایا نہیں۔" اس نے سادگی سے پوچھا۔
"بیٹے میں یہاں سے بہت دور رہتی ہوں۔ ہوسکتا ہے تم آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ آپ اپنا پتہ سمجھا دیں میں آکر خود آپ کی بیگم سے مل لوں گی۔" انھوں نے پرانا بہانہ تراشا۔
"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" لڑکے نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر ان کو دے دیا۔
اسی دوران مینا بازار بند ہونے کا وقت آ گیا۔ انھوں نے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ چوکیدار کو بلوا کر دوکان حوالے کی۔ بچے کچھے پھول خیراتی ادارے کے کھاتے میں دیئے
اس تمام کارروائی کے دوران لڑکا ان کے ساتھ رہا۔ وہ اس کی موجودگی سے پریشان رہیں، الجھتی رہیں مگر وہ بہت خلوص سے ان کا ہاتھ بٹاتا رہا۔
کام ختم کر کے وہ باہر آئیں تو وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔
"آنٹی۔ آپ کا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔ آیئے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔" اس نے اخلاقاً کہا۔
"نہیں بیٹے میں روز ہی ٹیکسی سے جاتی ہوں۔ چلی جاؤں گی میری گاڑی آج کل خراب ہے۔" انھوں نے پہلو بچایا۔
"آنٹی، تکلف کیوں کرتی ہیں۔ اس وقت یہاں پر سواری ملنا بہت مشکل ہے۔ پھر شام ہو رہی ہے۔ آپ عورت ذات آ نہ جائیں۔" اس نے بہت خلوص سے کہا۔
"بیٹے بات در اصل یہ ہے کہ میں بیوہ عورت ہوں۔ کسی کی گاڑی میں جاؤں گی تو لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔" انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر کہا۔
"ارے آنٹی مجھے خود خیال ہے اس بات کا۔ میں آ

کو گھر سے ذرا دور چھوڑ دوں گا۔ آپ آیئے تو۔" اس نے دروازہ کھول کر کہا۔

لڑکا تو گلے کا ہار ہو گیا ہے۔ انھوں نے جل کر سوچا۔ اور بیٹھ گئیں۔

"آنٹی۔ آپ کو تو یہ فن بہت اچھا آتا ہے۔ آپ اس کو بڑے پیمانے پر شروع کریں تو زیادہ فائدہ ہو گا۔" لڑکے نے رائے دی۔

"ہاں میرا ارادہ ہے۔ بلکہ میں نے تو ایک دوکان بک بھی کروالی ہے۔ بس بہت جلد اپنا ذاتی کاروبار شروع کروں گی۔" انھوں نے پھر لفاظی کی۔

"گڈ۔ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے۔ اچھا اب کس طرف مڑنا ہے؟" چورنگی پر پہنچ کر لڑکے نے پوچھا۔

"بس یہیں روک لو۔ وہ آخری والا کریم کلر کا میرا بنگلہ ہے۔" انھوں نے اشارے سے بتایا۔

"آپ یہاں کرائے پر رہتی ہیں؟" لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ میرا اپنا ہے۔ میں نے نچلا حصہ کرائے پر دے رکھا ہے۔ میری فیملی بہت چھوٹی ہے۔ اس وجہ سے اوپر رہتی ہوں۔" انھوں نے ہمیشہ کی طرح رٹی ہوئی کہانی دہرائی۔

"اچھا آنٹی اب تو میں نے آپ کا گھر دیکھ ہی لیا ہے۔ کل اپنی بیگم کو لے کر آؤں گا۔" اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے مژدہ سنایا۔ "مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ یہاں رہتی ہیں۔ اسی مکان کے نچلے حصے میں تو میرا بہت گہرا دوست رہتا ہے۔ صفدر نام ہے اس کا۔"

اس کے الفاظ گرما گرم سیسے کی طرح ان کے کانوں میں اتر گئے۔

وہ بہت مشکل سے خدا حافظ کہتی ہوئی ہانپتی کانپتی اوپر آئیں اور چوکی پر گر پڑیں۔

"امی۔ کھانا نہیں کھائیں گی؟" جمانہ نے اندر آ کر پوچھا۔

"لے آؤ۔" انھوں نے بچوں کی پریشانی کا سوچ کر کہا۔

جمانہ اور محسن وہیں کھانا لے کر آ گئے۔ انھوں نے بڑی ہی مشکل سے دو چار لقمے زہر مار کیے۔ اور تھکن کا بہانہ کر کے لیٹ کر سوتی بن گئیں۔

اُجالے کی لکیر

لبنیٰ غزل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM
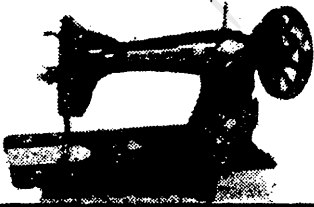
وہ اپنے کمرے میں جیسے ہی داخل ہوا بیڈ سے ملحق سفید میز پر نظر جا پڑی۔ کمرے کے دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے اندازہ لگا لیا کہ بھابی نے آج پھر کئی تصویریں اس کی میز پر ڈھیر کر دی تھیں وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتا بیڈ تک آ گیا اس کا خیال درست نکلا۔ واقعی بھابی پھر کئی رنگین خوبصورت تصویریں اس کی میز پر لا کر ڈال دی تھیں اس نے تصویریں اٹھا لیں اور ایک ایک کا بغور جائزہ لینے لگا۔

"تو بھابی نے اس کی شادی کا پروگرام بنا ہی ڈالا اب تو وہ میری شادی کروا کر ہی دم لیں گی۔"

تصویریں دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

بھابی پچھلے تین سال سے اس کے گرد تھیں کہ وہ اپنا گھر بسائے مگر وہ تھا کہ ایک کان سے سنتا دوسرے سے اڑا دیتا۔ بھائی جان عاصم بھی کئی بار سمجھا چکے تھے مگر پھر اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر انہیں بھی خاموش ہونا پڑا اور اس سے کچھ کہے بغیر اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم نمٹتی رہو اس ضدی دیور کے ساتھ جب کوئی لڑکی پسند آ جائے تو مجھے مطلع کر دینا میں بات چیت کر کے رشتہ طے کر لوں گا۔

مگر

اس انسان پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا شاید دل تو اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ محبت جیسا خوبصورت جذبہ جہاں جنم نہ لیتا تھا تو پروان چڑھنا درکنار۔ بھابی اکتا جاتی تھیں۔

"خدا کی قسم احتشام دل چاہتا ہے کہ تمہارا سر پھوڑ دوں۔ اتنی محنت سے تصویریں جمع کر کے تمہیں دکھاتی ہوں اور تم سب ریجیکٹ کر دیتے ہو۔!"

"تو مت دکھایا کریں مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔"

وہ لاپرواہی سے کہتا تو وہ مصنوعی غصے سے ہونٹ بھینچ کر رہ جاتیں۔

"ساری عمر یونہی کنوارے بیٹھے رہنا۔!"

"مجھے اپنی آزادی بڑی پیاری ہے بھابی۔"

وہ شوخ سی دھن سیٹی پر بجاتا باہر نکل جاتا تو وہ کڑھ کر رہ جاتیں۔

"تمہیں تو خدا ہی سمجھے گا۔!"

وہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں۔ آج بھی انہیں احتشام سے کسی ایسے ہی جواب کی توقع تھی اس لئے خاموشی سے اس کی غیر موجودگی میں تصویریں اس کی میز پر رکھ کر چلی گئی تھیں۔

وہ تصویریں دیکھنے میں بڑی سنجیدگی سے منہمک تھا۔ بھابی نے ہاتھ میں ٹرے تھامے دروازے سے جھانکا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری تیر دل پہ لگ گیا ہے شاید!"

وہ خود بخود مسکرائیں اس کی سنجیدگی سے تو انہوں نے بھی اندازہ لگایا تھا۔ وہ وہیں کھڑی اس کی ساری کارکردگی کا جائزہ لیتی رہیں۔

"بھابی کب تک یہاں کھڑی رہیں گی میری چائے بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ جو کچھ دیکھنا ہے اندر آ کر دیکھ لیں۔ دروازوں سے جھانکنا منع ہے۔"

وہ بھی کب باز آنے والا تھا۔ فوراً آنکھ بچا کر انہیں دیکھ لیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اسے پتہ چل گیا کہ وہ یہاں کھڑی ہیں۔ اس لئے بیڈ پر نیم دراز ہو کر وہیں سے چلایا۔

بھابی مسکراتی ہوئی اندر آ گئیں۔

"بہت استاد ہو۔"

"آخر بھائی اور دیور کس کا ہوں۔"

وہ اترانے لگا۔

"اب ان تصویروں میں سے کوئی اپنی پسند بتا دو!"

"کوئی بھی نہیں۔"

اس نے بڑے اطمینان سے ساری تصویریں بیڈ پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے پھیلا دیں۔

"یعنی یہ آخری کوشش بھی بیکار۔!"

بھابی چلائیں۔

"یہ آخری کوشش تھی۔"

وہ بولا۔

"ہاں۔ اب خدا کی قسم ہے جو میں نے کوئی تصویر تمہیں دکھائی کرتے رہنا اپنی پسند سے شادی یا پھر عمر بھر کنوارے بیٹھے رہنا۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا تمہیں دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا تھا کہ ایک بھائی مل گیا مگر تم نے تو میرے سارے ارمان خاک میں ملا دیئے کتنی آرزو تھی مجھے تمہاری شادی کرنے کی۔ اب تمہیں کبھی نہیں کہوں گی۔ اللہ کرے تمہیں کوئی اندھی لنگڑی ہی ملے!"

انہوں نے مذاق سے بددعا دی تو کپ میں چائے انڈیلتا ہوا احتشام ہنس پڑا۔

"میں خود انوکھا ہوں نا۔ اس لئے انوکھی شے پسند کروں گا شاید وہ بھی ایسی ہو۔ معذور!"

"خدا نہ کرے شام۔ میں نے مذاق سے کہا تھا!"

"بھابی یہ تصویریں ہے جائیں نہایت معذرت کیساتھ۔"
"آخر تم چاہتے کیا ہو۔"
"کوئی انوکھی نرالی سی لڑکی جس کے روپ میں تقدس اور معصومیت ہو۔"
وہ کہیں کھو سا گیا۔
"کوئی حور تو تمہیں ملنے سے رہی۔"
"میں حور یا پری نہیں چاہتا بھابی۔"
"پھر؟"
"بس کوئی دل کو بھا جانے والی معصوم صورت۔"
"ایک سے ایک حسین لڑکی تمہیں دکھائی ہے۔"
"مجھے حسن نہیں پاکیزگی چاہیئے۔"
"پھر تلاش کرتے رہو عمر بھر کوئی حور۔"
وہ اٹھ کر جانے لگیں تو احتشام نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔
"ناراض ہو گئیں۔"
"تم کبھی میری بات نہیں مانتے ہو۔"
وہ منہ بنا کر بولیں۔
"آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"
"تمہارے بھائی جان تو بری الذمہ ہو گئے ہیں اب میں بھی تمہیں اختیار دیتی ہوں اپنی مرضی سے کرنا جو جی میں آئے۔"
وہ ان کا موڈ آف دیکھ کر ہنس پڑا۔
"بھابی آپ کو ابھی اپنی ایک سہیلی کے گھر جانا ہے موڈ درست کرلیں۔"
اس نے یاد دلایا تو وہ چونک گئیں۔
"ارے ہاں۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں تم مجھے چھوڑ دینا اور پھر رات کو لے لینا وہاں سے۔"
"اوکے بھابی۔"
اس نے کپ خالی کرتے ہوئے کہا۔ بھابی ٹرے لے کر واپس چلی گئیں تو گنگنانے لگا۔
وہ بھابی کو چھوڑ کر اپنے دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ بھائی جان ایک ہفتے کے کاروباری دورے پر لندن گئے ہوئے تھے اس لئے اسے فکر نہ تھی۔
وہ گیٹ کھلا دیکھ کر بے تکلفی سے اندر آ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی نور برسا رہی تھی۔ چاندنی کے مدھم مدھم غبار سے فضا بڑی ہی خواب آلود ہو گئی تھی۔
اور
اس خواب آلود فضا میں جیسے وہ خواب دیکھنے لگا۔ اس کے قدم رک گئے اس کے سامنے چاندنی مجسم ہو گئی تھی۔
پھر
سارے جہاں کا حسن اس کی نگاہوں میں سمٹ گیا تھا۔
وہ جو کوئی بھی تھی بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھی کسی میگزین کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ ہوا کی ہلکی سی چھیڑ سے اس کے چہرے پر سیاہ زلفوں کے بادل لہرا رہے تھے اور وہ اس ہوا کی سرگوشیوں اور اس کی آمد سے بے نیاز تھی۔ اس کے سر سے دوپٹہ ڈھلک کر شانوں پر آ گیا تھا۔ جھکے جھکے چہرے پر پرسوز سی معصومیت تھی۔
وہ اسے دیکھے گیا۔
اور
شاید اس کی نگاہوں کی تپش اتنی تیز تھی کہ اسے اپنے جلنے کا احساس ہو گیا اس نے اچانک چہرہ اٹھا کر دیکھا سوالیہ انداز میں اٹھی ہوئی نگاہوں میں حیرت تھی اور سرخ سرخ سے ڈورے کسی اضطراب کی چغلی کھا رہے تھے۔
"مسز عادل سے ملنا ہے مجھے۔"
اس کی نگاہوں کے مخاطب کرنے پر وہ کچھ گھبرا کر بولا۔
"آپ تشریف رکھیں۔"
اس نے میگزین رکھ کر پلکیں بڑے قاتل انداز میں اپنے رخساروں پر جھکا لیں۔
"وہ ابھی حاضر ہوتی ہیں۔"
وہ بولی۔ اس کی آواز میں اتنی دلکشی اور شیرینی تھی کہ احتشام کا دل چاہا کہ اس کی آواز سے شعلے سے لپکتے رہیں اور وہ ان ٹھنڈے شعلوں کی تپش دل میں محسوس کرتا رہے۔
وہ اطمینان سے اس حسین قاتل اور حسن جہاں سوز کے روبرو بیٹھا رہا۔ ابھی اس کی نگاہوں کا سحر نہ ٹوٹا تھا کہ عادل کی بیوی ثمن آ گئی
"ہیلو احتشام کیسے ہو آج بہت دنوں بعد نظر آئے ہو۔"
وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔
"آپ کی دعاؤں سے اچھا ہوں عادل کہاں ہے؟"
اس نے پوچھا۔
"وہ کل ہی لاہور گئے ہیں ان کی بہن کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اس لئے فوری طور پر جانا پڑا۔"
ثمن نے بتایا تو وہ بھی افسوس کرنے لگا۔

"ارے میں تم دونوں کا تعارف کروانا تو بھول ہی گئی۔ اعتشام یہ میری کزن ندا ہیں اور ندا یہ عادل کے بڑے گہرے دوست اعتشام ہیں۔"!

وہ دونوں مختصر سے تعارف پر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اعتشام نے دیکھا اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک لمحے میں ہی غائب ہو گئی۔ بڑی مجروح مسکراہٹ تھی وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے اپنے سفید آنچل کے کنارے سے کھیلتی رہی چہرے پر سنجیدگی سی چھائی ہوئی تھی اس نے ایک بے بسی کے عالم میں ثمن کو دیکھا۔ نگاہوں میں ہی کچھ کہا اور پھر پلکیں گرالیں جانے ان آنکھوں میں کیا راز تھا۔ کہ ثمن کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو اداسی چھاگئی۔

وہ اس خاموشی اور ندا کی بے بسی کو کچھ کچھ سمجھ گیا اس نے اندازہ لگالیا کہ وہ اس کی موجودگی سے گھبرا رہی ہے اور شاید جانا چاہتی ہے اس لئے وہ خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے اب میں چلوں کافی دیر ہوگئی ہے۔"

"کافی پیئے بغیر نہ جانے دوں گی۔ بیٹھو!"

ثمن فوراً بولی۔

"پھر کبھی سہی کل آکر پی لوں گا۔ اس وقت بھابی کو بھی ان کی سہیلی کے گھر سے لینا ہے دیر ہو جائے گی۔"!

وہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

"کل آؤ گے نا؟"

"ہاں۔ انشاء اللہ۔"

اس نے ندا کی طرف دیکھا۔ جس نے بڑی بے بسی سے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا تھا۔ اعتشام دکھی سا ہو گیا۔

"جانے کیوں۔"

بڑی مردہ سی چال کے ساتھ وہ چلا گیا۔

بھابی کو ان کی سہیلی کے گھر سے لیا اور خاموشی سے کار ڈرائیو کرنے لگا۔ اور سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا اور دھوئیں کے مرغولے میں وہ اس معصوم صورت کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ بھابی کو اس کی خاموشی اچھی نہ لگ رہی تھی۔ وہ تو کبھی ٹکلا بیٹھنے والا نہ تھا۔ اب اسے کیا ہو گیا تھا۔

"تم اتنے خاموش کیوں ہو۔"؟

"دل چاہ رہا ہے۔"

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"کوئی بات ضرور ہے۔"

"نہیں تو۔"

وہ ہنس دیا۔ اور بھابی کو مزید سوچنے کا موقع نہ دینے کے لئے اس نے کار میں لگے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آن کر دیا اور خود بھی خوشی سے گانے لگا۔

اس نے وقتی طور پر تو بھابی کو مطمئن کر دیا تھا مگر اپنے آپ کو مطمئن نہ کر پایا ایک تجسس تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا دل ان لمحات کی قید میں تھا۔ وہ لمحے کتنے سحر زدہ تھے۔ نگاہوں نے جی بھر کر بھی نہ دیکھا دل کی پیاس بجھی نہ بجھی۔ روح سیراب نہ ہوئی۔ مگر پھر بھی وہ ان لمحات کی گرفت میں آچکا تھا جنہوں نے اس سے اس کے حواس چھین لئے تھے وہ اپنے آپ کو مطمئن نہ کر سکا۔

دھندلا دھندلا سا عکس۔ خوابیدہ سا حسن کھوئی کھوئی سی پرسوز معصومیت ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی کا مدھم مدھم غبار اور وہ سفید آنچل۔

اس کے ذہن کے ایک ایک حصے اور دل کے گوشے سے لپٹ گیا تھا۔ اس نے تو اس خوابناک سی فضا میں جیسے ایک ادھورا خواب دیکھا تھا بے حد دلکش سہانا مگر دھندلا دھندلا سا اندھیرے اجالے کے پس منظر میں وہ صورت اچھی طرح نظر نہ آسکی تھی۔

مگر۔

ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی کے نور میں ڈوبے وہ خواب آلود سے لمحے اس کی نگاہوں میں کھب گئے تھے حسن کے سحر سے وہ آزادانہ ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ اس خوابیدہ تصور اور دھندلے دھندلے سے نقوش میں کھویا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی تلاش مکمل ہو رہی ہو۔ یا منزل کا سراغ مل گیا ہو۔

•

آج وہ کافی دیر بعد بیدار ہوا تھا حالانکہ روزانہ صبح ہی صبح اٹھ کر بھابی کو تنگ کرنے لگتا تھا۔ کہ جلدی سے ناشتہ دیں اور بھابی اپنے لاڈلے دیور کے ناز اٹھاتے ہوئے جلدی سے ناشتہ بنا کر اسے دے دیتیں مگر آج وہ کافی دیر تک نہ اٹھا تو انہیں تشویش ہونے لگی وہ اس کے کمرے کی طرف لپکیں۔ دروازہ کھلا ہی تھا شاید وہ بیدار ہو چکا تھا۔ ہلکی سی دستک دے کر بھابی اندر آگئیں وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔

"ہوں تو آج مطالعہ قدرت ہو رہا ہے۔"؟

بھابی اس کے قریب آکر بولیں تو وہ چونک کر مڑا انگلیوں میں تھما سگریٹ جل جل کر ختم ہونے کو تھا اس نے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا

"ہاں بھابی قدرت کتنی حسین ہے۔"!

وہ بولا۔
"تمہیں اب پتہ چلا۔"
وہ مسکرائیں۔
"ہاں شاید میں نے آج پھولوں کو غور سے دیکھا ہے۔"
"پھر کیا پایا ان میں۔"!
"حسن معصومیت۔ پاکیزگی اور تقدس!"
وہ کھویا کھویا سا بولا۔
"معلوم ہوتا ہے صبح صبح کسی شاعر کو پڑھ لیا ہے۔"!
بھابی نے بے ساختگی سے کہا تو وہ چونک سا گیا۔ تب اس کا دل چاہا کہ وہ کہہ دے۔
"رات کو میں ایسی کتاب پڑھ کر سویا ہوں جس کا لفظ لفظ معصومیت ہے جس کی ہر سطر میں پاکیزگی تھی۔
"کہاں کھو گئے ہو تم۔"!
بھابی کو کچھ شک ہونے لگا۔
"کہیں، نہیں۔ آپ ناشتہ لانے کی زحمت فرمائیں گی۔"!
اس نے بڑی خوبصورتی سے مسکراتے ہوئے بات پلٹ دی
"اپنے کمرے میں کرو گے کیا؟"
"ہاں!"
"کیوں!"
"دل چاہ رہا ہے۔"!
"یہ تمہارے دل کو کیا ہو گیا ہے۔"!
وہ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پہ لئے باہر چلی گئیں۔ وہ غسل کرنے چلا گیا۔ واپس آیا تو گلدان میں خوبصورت پھول سجے ہوئے اپنی بہار دکھا رہے تھے جن میں گلاب کے سرخ سرخ پھول نمایاں تھے۔
وہ قریب آ گیا اور غور سے ان پھولوں کو دیکھنے لگا۔ ابھی ابھی کھلے ہوئے پھولوں کو توڑ کر مالی بابا اس کے کمرے کی زینت بنا گئے تھے۔ روزانہ ہی وہ اس کے کمرے میں پھول سجایا کرتے تھے لیکن وہ کوئی دھیان نہ دیتا تھا۔
مگر۔
آج۔
آج جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ ہر معصوم شئے پر پیار آ رہا تھا۔
اُسے بے ساختہ ان پھولوں پر ترس آ گیا جن پر شبنم کے ننھے ننھے پاکیزہ قطرے چمک رہے تھے اُس نے ہاتھ بڑھا کر گلدان اُٹھا لیا اور ان پھولوں پر اپنے لب رکھ کر اک لمبا اور گہرا سانس لیا کہ ان کی ساری خوشبو اپنے اندر اتار لے اس پر ابھی تک رات والے دھندلے دھندلے نقوش کا اثر تھا۔ خوابیدہ حسن کا سحر اب تک اس پر طاری تھا بلکہ ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ ساتھ اس کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔
وہ بہار تھی۔ خوشبو تھی۔ یا پھر سورج کی پہلی کرن۔
یا۔
چاندکی کومل ٹھنڈی روشنی۔ جو اندھیروں پر غالب آ جائے اِک برق سی لہرائی تھی۔ اک ہوا کا معطر جھونکا تھی جس نے اُسے بہکا دیا تھا۔
وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔
وہ آنکھیں بند کر کے اس ان دیکھے خواب کے تصور میں کھونے لگا۔
"ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے آج تمہیں پھولوں پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے!"
بھابی ناشتے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئیں تو اُسے یوں محو دیکھ کر بولیں۔
"اتنے قریب سے جو دیکھا ہے آج!"
وہ گلدان احتیاط سے میز پر رکھ کر بولا۔
"پہلے ناشتہ کر لو پھر ایسی پیاری پیاری باتیں کرنا!"
بھابی اس کے لئے چائے بنانے لگیں اس نے توس اور انڈے کی پلیٹ پہلے ہی اپنے آگے کر لی تھی۔ ناشتہ کرتے کرتے وہ پھر کہیں کھونے لگا۔ کپ سے اُٹھتی بھاپ دھندلاہٹ پیدا کرنے لگیں تو پھر وہ خوابیدہ عکس تڑپانے لگا۔
"کیا سوچ رہے ہو شام؟"
بھابی نے اس کی صورت دیکھ کر پوچھا۔
"کچھ نہیں۔"
اس نے جلدی سے کپ خالی کر دیا۔
"لگتا ہے تمہیں کچھ ہو گیا ہے!"
"کیا ہو گیا ہے؟"
وہ ہنس دیا۔
"کوئی اور ہی خاص قسم کا چکر لگتا ہے۔"
وہ مسکرائیں۔
"بھابی ابھی تو خوابوں سے عشق کر رہا ہوں۔"!
اس نے اقرار کر ہی لیا۔
"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ کچھ اجنبی سا چہرہ کھویا کھویا وجود اور دھندلے دھندلے عکس میں تو اس حسن معصوم کو اچھی طرح سے دیکھ بھی نہ پایا۔

"کہ آنکھ کھل گئی اور سپنا ٹوٹ گیا۔"

بھابی اس کی بات کاٹ کر ہنس دیں۔

"بھابی یہ حقیقت ہے۔!"

وہ جھینپ سا گیا اُن کے ہنسنے پر۔

"مگر وہ ہستی ہے کون جس نے تمہیں فتح کر لیا!۔"

بھابی خوش ہو گئیں اب لگا تھا وہ ٹھکانے۔

"معلوم نہیں۔"

"نام تو معلوم ہو گا!۔"

"ندا۔"

"ماشاءاللہ نام تو بہت پیارا ہے جبھی تو جناب دل و جان ہار بیٹھے ہیں۔"

"بھابی دل بھی عجیب شئے ہے نہیں آتا تو کسی کے کہنے اور لاکھ سمجھانے پر اور مدتوں گزر جانے کے بعد بھی نہیں آتا اور اگر آ جائے تو ایک لمحے میں آ جاتا ہے ایک ہی پل میں زندگی کا فیصلہ ہو جاتا ہے!"

"تو تم نے اتنی جلدی فیصلہ بھی کر لیا۔"

"ہاں بھابی۔"

"دیکھو شام میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اتنی جلد بازی سے کام نہ لو پہلے کچھ معلومات حاصل کر لو۔"

وہ برتن سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"ابھی تو ابتدائے عشق ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

اس نے سگریٹ سلگا لیا۔

"بہت سگریٹ پینے لگے ہو شام۔"

انہوں نے ایش ٹرے میں پڑے بہت سے سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑے اور جمع شدہ راکھ دیکھ کر کہا۔

"دھوئیں اور دھندلاہٹوں میں وہ عکس معصوم تلاش کر رہا ہوں۔!"

وہ گہرا کش لے کر سارا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا

"شاعری بھی کرنے لگے ہو۔"

وہ مسکراتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

اور اختشام

اس سے ملنے کا پروگرام سیٹ کرنے لگا۔ آج شام بارگاہ حسن میں عشق کے جذبوں نے سجدے کرنے تھے۔

شام دھواں دھواں سی بے حد اداس ہو رہی تھی یوں جیسے خزاں چھپ چھپ کر رونے لگی ہو۔ ٹھنڈی ہوائیں درختوں میں سرسرا رہی تھیں۔ وہ کانپ سا گیا۔ بہاروں پر اداسی کیوں چھانے لگی تھی اس کا دل دکھی سا ہو گیا۔ وہ مدھم مدھم چاپ لئے اندر آ گیا۔ برآمدے کی سبز خواب ناک سی روشنی اور غبار آلود ماحول میں اس کی روح پر اندھیرے سے چھا گئے۔

وہ

برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی تھی آنکھیں بند تھیں پلکیں لرز رہی تھیں اور ان لرزتی پلکوں سے اشکوں کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر زرد رخساروں پر برس رہے تھے ہاتھوں میں ستار تھما ہوا تھا ایک شانے پر ستار ٹکا ہوا تھا۔ اور ہاتھ کی نازک نازک انگلیاں تاروں کو چھیڑ چھیڑ کر اک درد سا فضا میں پھیلا رہی تھیں وہ محو تھی اپنا درد لٹانے میں۔ اپنے آپ سے بے خبر تھی آسمانی ساڑھی کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا مگر اسے پرواہ نہ تھی۔

وہ حسن بے پرواہ۔ وہ پرسوز معصومیت اس کے دل پر قیامتیں سی گزر گئیں۔

وہ کیوں رو رہی تھی۔ اتنا سوز کیوں تھا۔ اس کے وجود میں اتنا درد کیوں گھل رہا تھا۔ اک وہ تڑپ رہی تھی تو سارا جہاں سوگوار ہو گیا تھا کیوں؟

وہ سمجھ نہ سکا۔

وہ تڑپتا ہوا قریب آ گیا۔

"ندا۔"

اُس نے اپنے عشق کی تمام تر صداقتوں سے اُسے پکارا۔

وہ نہ چونکی محو رہی۔

"ندا۔"

اس نے پھر کہا۔

اب کے اُس کے ہاتھوں کی حرکت بند ہو گئی۔ پلکیں اُٹھیں۔

اور

سرخ سرخ آنکھوں کی کربناک اداسیاں کھنچنے لگیں۔

میرے درد کو نہ چھیڑو۔

اس کی آنکھوں سے سارا درد بہہ نکلا اس نے ستار اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور ساڑھی کا ڈھلکا ہوا آنچل سنبھال کر اپنا بھیگا بھیگا چہرہ صاف کر لیا۔

"تشریف رکھیں۔"

اس کا لہجہ نرم تھا۔

وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اک تجسس اس کے تن من میں پھیل گیا اس کی روح کچھ جاننے کے لئے بے چین تھی۔

"وہ کیوں رو رہی تھی۔!"

وہ مچل رہا تھا۔

"ندا آپ۔ آپ رو رہی تھیں۔!"

"یونہی کچھ غم تازہ ہونے لگے تھے!"

وہ بڑی زخمی مسکراہٹ سے بولی۔

"کیسے غم؟!"

وہ چونکا۔

"چھوڑیں غموں کی بات آیئے خوشیوں کی بات کریں۔"

وہ ہنس دی مگر احتشام کو یوں لگا جیسے اس کی ہنسی بھی رو رہی ہو۔ اس کی مسکراہٹ میں کتنے غم پوشیدہ تھے۔ وہ اپنے آنچل کے کنارے سے کھیلنے لگی بھیگی بھیگی پلکیں بڑی بے قراری سے لرز رہی تھیں۔

اور وہ

مدہوش ہوا جا رہا تھا۔ وہ حسن سوز بہار دا سے دل کو اپنی گرفت میں لے کر تڑپا رہا تھا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنے کا حق تو نہیں رکھتا مگر یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ آپ اس قدر دکھی کیوں ہیں۔!"

وہ اپنی نگاہوں میں اسے سمیٹ کر بولا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

"دکھ۔"

"دکھ تو مقدر ہیں اپنا!"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ دکھ آپ نے اپنے اوپر طاری کر لیا ہو۔"

"یہ دکھ اتنے سنہرے نہیں کہ میں انہیں جان بوجھ کر دل میں سمیٹوں!"

اس نے اپنی آنکھوں سے وار کیا۔

وہ پگھل ہی تو گیا۔ کتنی معقول بات کہی تھی اس نے مگر وہ اس کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ اسے ٹٹولنا چاہ رہا تھا۔ اس کے غم کی شناخت کرنا چاہتا تھا۔

اور

دکھوں کے جہنم سے نکالنا چاہتا تھا۔

"آپ نے ان دکھوں کا مداوا نہیں کیا!"

"تقدیر پر مجھے اختیار نہیں۔"

"انسان کی تقدیر اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔"

"ان مٹی مٹی سی لکیروں میں کچھ بھی تو نہیں۔!"

وہ اپنی گلابی گلابی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔ بڑی حسرت ناک نظروں سے۔

"زندگی سے اتنی مایوسی۔!"

"زندگی نے دکھ ہی تو دیئے ہیں۔"

"لگتا ہے کوئی گہری چوٹ لگی ہے۔"

سگریٹ سلگاتے ہوئے احتشام نے سوچا۔

وہ صورت اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی وہ اس کی جدائی اب برداشت نہ کر پائے گا۔ وہ اس سے کہہ دے گا۔

"مگر کیسے؟!"

یہی احساس اسے تڑپانے لگا۔

وہ کیسے اس سے کہے۔ کیسے کوئی تعلق قائم کرے کہیں وہ اس کی ہنسی نہ اڑائے۔

وہ بڑی دکھی مگر کربناک سوچ میں ڈوب گیا۔

آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔

یہ عشق کیسے پروان چڑھے گا۔

اس کو بھی خبر ہوگی یا نہیں۔

"ہوگی۔"

اس نے فیصلہ کر لیا اس کے چہرے پہ چٹانوں کی سختی ابھر آئی۔ اور لہجہ میں پختہ عزم سما گیا۔

"وہ اس دکھی لڑکی کو شناخت کر کے رہے گا۔"

اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ دل چاہا کہ ابھی ان اڑتے لمحوں کا دامن تھام کر اس سے اپنی بے قراری بیان کر ڈالے۔ وہ اپنے اس خیال کو زندگی دینے ہی والا تھا۔

کہ

سارے خیالات بکھر کر رہ گئے۔ ثمن باہر آ گئی۔

"ہیلو احتشام!"

وہ آتے ہی مسکرائی۔

"آداب!"

وہ اپنے خاص انداز میں بولا۔ ثمن ہنس دی۔

"خوب باتیں ہوئیں معلوم ہوتا ہے۔!"

"ہاں یہ مجھے شناخت کرنا چاہتے ہیں۔!"

وہ ہنسی۔

"یہ کام تم سے نہ ہو سکے گا احتشام!"

ثمن نے بتایا۔
"کیوں؟"
وہ بولا۔
"بہت مشکل ہے!"
ثمن بولی۔
"میں تو اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکی ہوں!"
وہ نگاہیں جھکا کر بڑے درد سے بولی تو احتشام نے دل تھام لیا۔
"ندا تم اب نارمل ہو جاؤ۔"
ثمن نے اُسے ڈانٹا۔
"کیا کروں ثمن۔ دل پر اختیار نہیں رہتا۔ یہ شام کتنی اداس ہوتی ہے کہ مجھے خود بخود رونا آجاتا ہے۔!"
وہ پھر اداس ہونے لگی۔
"کل سے تم یہاں نہیں بیٹھو گی۔!"
"سارا دن تو کمرے میں بند رہتی ہوں یہ چند لمحے جو مجھے خوبصورت اداسی عطا کرتے ہیں مجھے بے حد عزیز ہیں مجھ سے یہ لمحے تو نہ چھینو ثمن!"
اُس کی آنکھوں میں درد کھٹکنے لگا۔ اور لہجہ نرم ہونے لگا تو ثمن بھی خاموش ہو گئی۔ سارے ماحول پر پراسرار سی اداسی چھا گئی تھی۔ احتشام کی روح میں اندھیرے اُتر گئے اس نے سگریٹ پھینک کر جوتوں سے تلے دبا کر بجھا دیا۔
"ثمن آپ کافی کب پلوا رہی ہیں!"
اُس نے ماحول کی تلخی اور اداسی کم کرنے کے لئے مزاح سے کام لیا۔
"کافی تو تیار رکھی ہے میں ابھی لے آتی ہوں۔!"
وہ اُٹھ کر جانے لگی۔ تو ندا نے دھیرے سے اُس سے کچھ کہا۔
"اب ایسی اداسی کی باتیں کر کے اپنے آپ کو پریشان نہ کرنا ندا۔"
ثمن نے جاتے جاتے کہا۔ ندا ہنس دی کھوکھلی سی بے جان ہنسی احتشام پھر کوئی بات کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔
"آپ کو میری باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے"
ندا نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ خود ہی بات چھیڑ دی۔
"پریشان تو بہت ہوا ہوں۔!"
وہ ہمت کر کے بولا۔
"ایسی تو کوئی خاص بات نہیں!"
"میرے لئے تو ہے میں تو ساری رات سوچتا رہا ہوں آپ کے بارے میں!"
"مگر میں بڑی ٹیڑھی ہوں سمجھ میں نہ آنے والا مسئلہ!"
"میں تمہیں حل کر کے رہوں گا۔"
احتشام سوچ کر رہ گیا مگر کہہ نہ سکا۔
"میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں نقصان اٹھائیں گے"
وہ ستار کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے بولی۔
"نقصان ہو یا نفع میں تو سوچوں گا۔!"
"کیوں!"
"میری مرضی!"
اس کے اس جواب پہ وہ خاموش ہو گئی۔ نگاہیں جھکا کر ستار سے کھیلنے لگی۔
"کیا سوچنے لگی ہیں۔!"
"اس دماغ میں اتنی سوچیں ہیں کہ میں مزید کچھ سوچنا نہیں چاہتی"
"مگر میں تو ایک بات ضرور کہوں گا تم سے!"
وہ بے تکلف ہونے لگا۔
"کیا!"
وہ چونکی۔
"تم مجھے بہت اچھی لگی ہو پسند آئی ہو۔"
اس نے اپنے جذبے کا اظہار سادہ سے طریقے سے کرنا چاہا
"آپ مجھے لیتے رہتے ہیں!"
وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"ہاں ندا میں نے کل سے بے شمار لمحوں میں بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں... میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"
"محبت۔"
وہ بیدردی سے ہنسی۔
"ندا۔"
وہ فدا ہونے والے انداز میں پھر مخاطب ہوا۔
"یہ محبت بہت سچی۔ بہت پاک ہے!"
وہ اُسے یقین دلانے لگا۔
"یہ لفظ میرے لئے اب قطعی بے معنی ہو چکا ہے میں اس نام پر مزید دھوکہ نہیں کھا سکتی!"
"کس نے دھوکا دیا ہے۔"
"میری قسمت نے۔"
"اس قسمت کو اگر میں بدل ڈالوں تو!"

"آپ خدا تو نہیں!"
اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے اُسے گھور کر لاجواب کر دیا۔
"ہماری ندا سے باتوں میں نہیں جیت سکو گے!"
ثمن بڑے اٹھلاتے چلی آئی۔
"مارے ہوئے لوگ کسی کو کیا شکست دیں گے ثمن!"
ندا کا ٹوٹا ہوا لہجہ ثمن کو پھر پھڑکا گیا۔
"میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا ندا۔ میں آج ہی لاہور آنٹی کو فون کرتی ہوں کہ تمہیں واپس بلا لیں انہوں نے اس لئے تو تمہیں یہاں نہیں بھیجا کہ الٹی سیدھی باتیں سوچ سوچ کر آدھی رہ جاؤ۔"
"آدھی تو میں ہوں ہی۔"
کافی کا مگ تھامے ہوئے اس نے بڑے تلخ لہجہ میں کہا۔
"اپنے آپ سے اتنی نفرت نہ کرو ندا۔"
احتشام سوچنے لگا۔
"میں تو خود کو اس دھرتی پر اک بوجھ تصور کرتی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔!"
وہ بڑی شکستہ باتیں کئے جا رہی تھی۔
"بکواس مت کرو۔"
ثمن تنگ آ گئی۔
"فریفتہ ہوں شکستہ دلی پہ میں اپنی!"
بکھری بکھری سی ندا نے کچھ اس طرح کہا کہ احتشام کا دل کانپ گیا۔ ثمن احتشام کی کیفیت بھانپ گئی۔
"تم اس کی باتوں پر مت جاؤ یہ ایسی ہی تلخ لڑکی ہے۔"
ثمن نے کہا تو احتشام کافی کے ساتھ ساتھ نگاہوں سے اس تلخ مگر دکھی لڑکی کو دیکھنے لگا۔
چاند اپنی کومل کومل کرنیں ساری دھرتی پر اتار رہا تھا اور اس کے دل میں آگ سی لگ رہی تھی اک چاند اس کے دل میں طلوع ہو رہا تھا جس سے دل کی دنیا روشن ہو رہی تھی۔ روح تک میں اجالے بکھر رہے تھے۔
مگر
یہ کیسے اجالے تھے جو اندھیروں سے مغلوب ہو رہے تھے
"لیکن نہیں میرے جذبے ان اندھیروں پر غالب آ جائیں گے میں ہر سمت سے روشنی ڈھونڈ نکالوں گا۔"
اس نے اپنے آپ سے کہا۔
"عجیب لڑکی تھی وہ!"

خوشی کی کوئی بات نہ کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اپنے آپ کو خوش رکھنے کی متمنی تھی
اتنی اذیت پسند کیوں تھی وہ!
شاید دنیا نے اُسے ہمیشہ ہی دکھوں سے آشنا کیا تھا اس کی باتوں سے کتنی حسرت ٹپک رہی تھی۔ اس کا لہجہ بار بار آنسوؤں سے نم اور آواز بھاری ہو جاتی تھی۔ دلکش آواز سوز میں ڈھلی اب تک احتشام کے کانوں میں گونج رہی تھی۔
جیسے
وہ بہت دکھی ہو کوئی بہت بڑی ٹھوکر لگی تھی۔ کوئی گہری چوٹ لگی تھی اُس کے دل پر جس نے اُس سے اعتماد کے لمحوں کا سکون چھین لیا تھا اور وہ اب تک سنبھل نہ سکی تھی۔ سہارے کی تلاش میں لڑکھڑا رہی تھی۔
کسی مضبوط اور پائیدار سہارے کی تلاش میں۔
محفوظ پناہ گاہ ڈھونڈ کر اس میں کھو جانے کی متمنی۔
خوشیاں شاید اس سے دور بھاگتی تھیں جو وہ خوشیوں کے لئے ترس رہی تھی۔
بے قرار ہو کر۔
اور شاید دکھی دل اور مجروح جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔
خوشیوں کے ایک ایک لمحے کے لئے وہ بھیک مانگ رہی تھی۔ تار تار دامن زمانے کے سامنے پھیلا رہی تھی۔
کہ
کوئی تو ہاتھ بڑھے جو اس کا تار تار دامن تھام لے۔
اس کی بھیک کی لاج رکھ لے۔
سکون و آشتی کے در و دیوار پر دستک دیتے دیتے اس کے ہاتھ تھک چکے تھے۔ اس کی انگلیوں کی پوریں زخمی ہو چکی تھیں اور ان سے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا لہو اس کے دل کی گہرائیوں کو چھلنی کر دیتا تھا۔ روح میں اتر اتر کر آگ لگاتا تھا۔ وہ ان غموں سے اکتا کر تھک چکی تھی۔
مگر
اب شاید اُسے منزل مل جائے۔ اُس کے آبلہ پا کو مرہم نصیب ہو جائے اُس کی بے قراریوں کو قرار آ جائے۔
احتشام
ایک اُجالے کی لکیر تھا۔ روشنی کا پیامبر۔ اک مضبوط سہارا منزلوں کا نشان۔
"میں تمہیں ضرور اپناؤں گا ندا تم جو بھی ہو جیسی بھی ہو میں محروم

کو خوشیوں سے جگمگاتے لمحوں میں بدل دوں گا۔ پھر خوشیوں اور سکون و آشتی کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے تمہارے ہاتھ زخمی نہیں ہوں گے۔ یہ آخر در میرا ہوگا جو پہلے سے تمہارے لئے کھلا رہے گا جب جی چاہے چلی آنا۔"

احتشام نے بڑے خلوص سے سوچا۔

وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔

اُس کی محبت کا اسیر بھی۔

اس نے اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ پختہ عزم اور غیر متزلزل ارادے

"میری تنہائیاں بھی تم دور کر دگی اور میں تمہارے دکھوں کو سمیٹ لوں گا۔!"

●

وہ اُس سے ملنے جا رہا تھا آج اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اُس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے گا۔ اُسے بتا دے گا کہ تم اپنی محرومیوں سمیت مجھے قبول ہو۔

وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ اپنے وجیہہ سراپے کو ایک بار پھر قدِ آدم آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا۔

اپنی خوبصورتی اور وجاہت پر ناز ہونے لگا۔

آج تو وہ دیکھتے ہی مر مٹے گی۔!

بڑے غرور سے سوچ کر وہ پلٹا۔

"کہاں کے ارادے ہیں اتنے اہتمام سے!"

بھابی دروازے میں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں۔

پورے کمرے میں دلکش مہک پھیلی ہوئی تھی۔

"بھابی مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے آج۔!"

"کسی خاص کام سے جا رہے ہو۔!"

"آپ کو معلوم تو ہے پھر بھی انجان بن رہی ہیں۔!"

"ہوں۔ تو ندا کے پاس جا رہے ہو!"

انہوں نے معنی خیز نظروں سے اس کا سر سے پاؤں تلک جائزہ لیا۔ احتشام جھینپ سا گیا۔

"بہت اسمارٹ لگ رہے ہو اس پر اپنی شخصیت کا رعب تو نہیں ڈال رہے!"

وہ ہنسیں۔

"بھابی میں اس پر کیا رعب ڈالوں گا ہم تو خود اس نگاہِ قاتل کے اسیر ہیں۔!"

"بہت خوب اس کو بھی تمہارا احساس ہے یا نہیں۔!"

"یہی تو آج معلوم کر کے رہوں گا۔ پھر آپ کو لے کر جاؤں گا"

"خدا تمہیں کامیاب کرے اور اپنی نظر اتار لینا کہیں میرے پیارے بھیا کو ندا صاحبہ نظر نہ لگا دیں۔"!

بھابی نے بڑے پیار سے اس کی پیشانی چوم کر خلوص سے کہا تو وہ ہنس پڑا۔

بھابی اُسے گیٹ تک خدا حافظ کہہ کر اندر چلی گئیں۔

اور وہ

اپنی منزل کی طرف رواں دواں۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر آ گیا۔ برآمدے میں بس خوابناک سی روشنی ہو رہی تھی مگر وہاں وہ خواب آلود چہرہ نہ تھا وہ معصوم وجود نہ تھا۔

"وہ کہاں ہو گی۔"؟

اس کے دل نے سرگوشی کی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی کھلا تھا وہ اندر آ گیا۔ ملازم ادھر کسی کام سے آیا تھا۔ احتشام کو یوں کھڑے دیکھا تو پہلے ادب سے سلام کیا اور پھر بیٹھنے کو کہا۔ احتشام بیٹھ گیا۔

"ثمن کہاں ہیں۔"!

اُس نے اس کے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں جی!"

"ان کی کزن ندا ہیں گھر میں۔"؟؟

اس نے پھر پوچھا۔

"جی ہاں وہ اپنے کمرے میں ہیں آپ ان کے کمرے میں چلے جائیں۔!"

"اِن کے کمرے میں۔"

وہ حیرت سے بولا۔ ایسا بے تکلف تو وہ ابھی ہوا نہیں تھا۔

"میں ان کو اطلاع کر کے پھر آپ کو بتا دیتا ہوں۔!"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

وہ بولا۔ ملازم چلا گیا اس نے سگریٹ سلگا لی۔

"وہ آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔"

ملازم نے آ کر بتایا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ملازم کے ساتھ ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہر قدم پر دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

"اندر آ سکتا ہوں!"

وہ دروازے میں سے بولا۔

"آ جائیے۔"

وہ مسکرائی۔ رائٹنگ ٹیبل پر جھکی وہ کچھ لکھ رہی تھی اُسے دیکھا تو قلم درمیان میں رکھ کر ڈائری بند کر دی اور یونہی کرسی پر بیٹھے بیٹھے

اس سے مخاطب ہوئی۔

"آداب عرض ہے!"

وہ قدرے جھک کر بولا۔ اس کے اس انداز پر وہ ہنس دی۔

"آداب۔ تشریف رکھیں۔!"

اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تھوڑا سا جھکا اور پھر بیٹھ گیا۔ اس کے وجود سے اٹھتی مہک ندا کی سانسوں میں اتر گئی۔ اس نے نگاہیں جھکالیں احتشام شاید کچھ کہنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے جھکتے ہوئے سگریٹ جلایا تو اس کے چمکیلے بالوں کی لٹ پیشانی پر بکھر گئی۔ ندا نے اس کی طرف دیکھا۔ سگریٹ کا گہرا کش لیتا ہوا وہ کتنا دلکش لگ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں محبتیں دھڑک رہی تھیں۔ والہانہ انداز میں چاہتیں امنڈ آنے کے لئے بے قرار ہو رہی تھیں۔

ندا کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے جلدی سے پلکیں جھکالیں۔

"ندا۔"

احتشام نے اس کی اس معصوم ادا پر فدا ہوتے ہوئے اسے پکارا۔

"میں آج تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔!"

اس کا لہجہ خمار آلود ہونے لگا۔

"میں جانتی ہوں۔!"

وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو مروڑنے لگی جھکے چہرے پر اچانک ہی دکھ سا لہرا گیا۔

"پھر... پھر اتنی انجان کیوں بن رہی ہو۔!"

احتشام نے اس کا سرد سا ہاتھ تھام لیا اس نے اس کے سرد کانپتے ہاتھ سے اندازہ لگالیا کہ وہ اندر تک لرز رہی ہے۔

"احتشام۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے کتنی بے بسی سے اسے پکارا تھا۔

"ایک بار پھر پکارو۔ تمہارے ہونٹوں پر یہ نام بکھرنے کی مجھے حسرت تھی ندا۔ ایک بار پھر کہو۔"

"احتشام۔ احتشام۔"

وہ اس کے ہاتھ پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"ندا۔"

احتشام نے اس کے اس انداز سپردگی سے مغلوب ہو کر اس کا بھیگا بھیگا سرخ چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اپنے دکھ مجھے دیدو۔"

احتشام نے کہا تو اس نے تڑپ کر اسے دیکھا جیسے کوئی انہونی بات کہی ہو۔

"نہیں۔ نہیں۔"

وہ تڑپ کر چیخی۔

"مگر کیوں!"

"احتشام۔ تم مجھے بہت محبوب ہو۔ شاید اپنی زندگی۔ اپنی جان سے بھی بڑھ کر میں نے تو تمہاری تصویر یش کے البم میں دیکھی تھی اس دن سے تمہاری راہ دیکھنے لگی تھی اب تم مل بھی گئے ہو تو سب کچھ خواب لگتا ہے۔"

"ندا جب ہم دونوں ایک دوسرے کو اتنی شدتوں سے چاہتے ہیں۔ تو کیوں نہ ایک دوسرے کے غم سمیٹ لیں۔"

احتشام نے اس کے دونوں سرد ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے کہ کوئی اسے اس کی گرفت سے آزاد نہ کرا سکے۔

"یہ... یہ نہیں ہو سکتا شام۔ ایسا نہ کہو۔"

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"اس کی کوئی خاص وجہ ہے کیا!"

"شاید بہت ہی خاص۔"

"پھر بتاتی کیوں نہیں ہو۔"

"اپنی زندگی کے ان چند خوبصورت لمحوں سے مجھے یہ خوشیاں سمیٹ لینے دو۔ پھر بتا دوں گی۔"

"نہیں ابھی بتاؤ۔ میں آج ہر قیمت پر تم سے سب کچھ پوچھ کر جاؤں گا"

وہ ضد پر اتر نے لگا۔

"میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتی۔ شام تمہیں دکھی دیکھا تو شاید مر جاؤں۔ میں تمہاری آنکھوں کی جگمگاہٹ نہیں چھیننا چاہتی۔ تم ابھی چلے جاؤ شام۔ میں کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تم چلے جاؤ شام۔"

احتشام کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے لگا لئے جن میں التجائیں کانپ رہی تھیں اس کے کانپتے ہونٹوں پر فریادیں تڑپ رہی تھیں۔ حسن کتنا بے بس تھا۔ احتشام پگھل گیا۔

"میں ابھی چلا جاتا ہوں مگر یہ بتاؤ کہ پھر کب آؤں!"

"اب مت آنا۔ میرے فون کا انتظار کرنا تمہیں دیکھوں گی تو سب کچھ ہار جاؤں گی۔ میں تمہیں فون پر اپنی زندگی کا اہم راز بتا دوں گی۔!"

احتشام بڑے شکست خوردہ سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور

ندا پر ایک نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اُس نے ندا کی ہونکی آواز بھی سُنی دل پر پتھر رکھ کر وہ واپس نہیں پلٹا اس لئے کہ ندا نے کہا تھا کہ اب مت آنا۔!

اُسے اُس کی بات کی لاج بھی تو رکھنا تھی۔ اتنی سی جدائی کیا وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اُسے ساری زندگی کا بھی بن باس دیتی تو قبول کر لیتا۔

بھابی اُس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں وہ آ تو گیا مگر تھکا ہارا سا چہرے پر وہ بشاشت نہ تھی جو جانے سے قبل تھی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔

"کیا ہوا شام۔؟"

کسی خوف سے اُن کا دل دھڑک اُٹھا۔

"کچھ نہیں بھابی۔ ندا کو میری آزمائش کی ضرورت ہے۔ اور میں اس آزمائش میں پورا اتر کر بتاؤں گا۔!"

وہ بستر پہ ڈھیر ہو گیا۔

"کچھ تو بتاؤ۔؟"

"بھابی وہ اپنے دُکھ مجھے نہیں دینا چاہتی۔!"

اس کے لہجہ میں بڑی بے بسی تھی۔ اور اُس لمحے وہ اتنا بیکل ہوا تھا کہ دل کی ساری کیفیتیں ان پر عیاں کر دیں۔

"حوصلہ رکھو شام۔ تمہیں اب اپنی مردانگی کا ثبوت دینا ہے" بھابی نے اُس کے بکھرے بکھرے سے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کی۔

"میں اُسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہونگا۔!"

وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ رات بیت رہی تھی اور نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ بے چین پریشان اور الجھا الجھا سا وہ باہر چلا آیا۔ خوبصورت چاندنی سے پوری فضا مہک رہی تھی۔ سارے ماحول پر نور سا چھایا ہوا تھا مگر یہ سب کچھ اُسے بے حد اداس لگنے لگا۔ ہر شئے سے سونا پن ٹپکتا محسوس ہوا اُس نے برآمدے کی ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر سگریٹ سلگا لیا اور اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

رات کے اُڑتے لمحے ساکت ہو گئے تھے جیسے اپنی جگہ ٹھہر گئے تھے۔ اِس سکوت میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ اِس سکون اور ٹھہراؤ میں اُسے وحشت ہونے لگی۔

بس

یہی تو چاہ رہا تھا۔ کہ ابھی اس کا فون آ جائے اور اس کی داستان

غم کو اپنے دل میں سمیٹ کر اُسے خوشیوں سے آشنا کر دے۔

کاش۔

کہ وہ اُس وقت اُڑتے ہوئے لمحوں کا دامن تھام لیتا گزرتے ہوئے وقت کی طنابیں کھینچ لیتا۔

اور

زمانے کی خوشیاں اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا۔

وہ بڑی شدت سے اُس کے فون کا انتظار کرنے لگا۔

رات لمحہ بہ لمحہ گزر رہی تھی

مگر نیند پہ وہ حاوی تھا اور کسی طرح سے بھی سونے کے لئے راضی نہ تھا۔

وہ تو بس پاگل ہوا جا رہا تھا۔ دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ انتظار اُس کے فون کا۔ انتظار اُس کی آواز کا۔ اور انتظار اس کی خوشیوں کا لیکن انتظار انتظار ہی رہا وصل کے لمحات نصیب نہ ہوئے۔ کانوں میں شہد بھری آواز نہ گھلی۔ اور وہ تڑپتا رہا۔ ساری رات ٹہل ٹہل کر انتظار کرتا رہا۔ ساری رات گزر گئی۔ صبح ہوئی۔

مگر کسی کام میں اُس کا دل نہ لگا آفس بھی نہ جا سکا۔ سارا دن یونہی بستر میں پڑا۔ اُس کے فون کا انتظار کرتا رہا لمحے بڑی تیزی سے اُڑ رہے تھے۔

اور ان اڑتے لمحوں میں اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ دھڑکنیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ دن گزرا شام بیتی اور رات آ گئی رات پھر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کان کھڑے ہو گئے اور وہ خود اس شیریں۔ نرم، دلکش آواز سننے کے لئے بے حد بے چین و بے قرار تھا۔

"خدا کے لئے اتنا نہ تڑپاؤ۔ یوں نہ آزماؤ۔ میں تمہاری محبت میں دیوانہ ہو گیا ہوں کہیں مر ہی نہ جاؤں ندا اپنی آواز سُنا دو۔!"

شدتِ کرب سے اُس نے آنکھیں میچ لیں سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ بستر پہ ڈھیر ہو گیا۔

فون پھر بھی نہ آیا۔ اور اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی سانسیں رُک جائیں گی۔ دھڑکنیں ساتھ چھوڑ دیں گی۔ نبضیں ڈوب جائیں گی اور وہ خود مر جائے گا۔ کہ اس کی آواز سے محرومی اُس سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ کئی بار مر لمحہ لمحہ قاتل ہو گیا تھا۔ جب ایک رات گزری دوسری اور پھر تیسری اس کا فون نہ آیا۔ وہ نڈھال سا ہو گیا۔ فرقتوں نے دل میں ایسا درد بیدار کیا تھا کہ دھڑکنیں تک پامال ہو رہی تھیں۔ اور وہ اپنے بے جان سے وجود کو سنبھالنے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ بھابی سے اُس کی نڈھال حالت نہ دیکھی جاتی تھی

"یہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے شام۔ اُسے بھول جاؤ!"

"نہیں بھابی وہ میری زندگی ہے اُسے بھول کر زندہ رہوں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ یا تو پھر مجھے مرجانے دیں۔!"

"خدا نہ کرے شام!"

وہ تڑپ جاتیں مگر وہ نہ سنبھلتا۔ نڈھال نڈھال سا شکستہ وجود سُرخ و سفید رنگت کیسی ماند پڑ گئی تھی آنکھوں کی چمک جانے کہاں کھو گئی تھی بکھرے بکھرے سے بال اور بڑھی ہوئی شیو۔

یہ احتشام تھا۔

بکھرا بکھرا اور نڈھال سا شکستہ سا۔

تین دن اور تین راتوں میں ہی اس کی حالت بدل گئی تھی یوں لگتا تھا جیسے مجنوں بن گیا ہو را ہوں کی خاک چھان چھان کر بیدم ہو گیا ہو آبلہ پا وہ دوڑ رہا تھا ویرانوں ریگستانوں میں اُسے تلاش کر کے تھک کر چور ہو گیا ہو۔

یا۔

فرہاد کی طرح تیشے چلا چلا کر ہاتھوں میں گڑھے پڑ گئے ہوں نڈھال ہو گیا ہو۔

مگر اپنی محبت سے ہار نہیں مانی یہ جذبہ تو بہت بلند بہت مضبوط تھا۔ محبت کا چاہت کا۔ اور عبادت و پرستش کا اور احتشام نے تو اُسے اپنا خدا مان لیا تھا پھر کیوں نہ اس طرح تڑپتا۔ مچلتا اور بے چین ہوتا۔ اس کی جبین شوق سجدے کرنے کے لئے تڑپنے لگی مگر محبتوں کا خدا سامنے نہیں تھا کہیں کھو گیا تھا روپوش ہو گیا تھا۔

لیکن

وُہ اُسے تلاش کرنا چاہتا تھا کھونا نہیں چاہتا تھا ہر گوشے سے اُسے ڈھونڈ لینا چاہتا تھا بس یہی اس کی آرزو تھی اُس کی تمنا کی انتہا تھی۔ اور اُس کی آخری خواہش تھی۔

"میں تمہارا اور تمہاری آواز کا انتظار کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا قیامت تک!"

احتشام نے نڈھال سا ہو کر اپنا سر تکیے پر ڈال دیا۔

اور

اُس لمحے فضا جاگ اُٹھی۔

ماحول میں زندگی سمٹ آئی۔

اور زندگی کی ساری رعنائیاں یہاں لوٹ آئیں۔

جب

فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

اور احتشام

وہ تو پہلے ہی ان لمحوں کا متلاشی تھا صدیوں کا سا انتظار کیا تھا پھر ان لمحوں کو ہاتھ سے کیسے جانے دیتا۔

"ہیلو۔!"

اس نے بجلی کی سی تیزی سے ریسیور اُٹھایا۔ دل کی ساری دھڑکنیں منتشر ہو گئی تھیں۔

"میں بول رہا ہوں ندا تم بولتی جاؤ۔ بولتی رہو میرے کان تمہاری آواز سُننے کے لئے ترس گئے تھے۔ یہ تین دن تین راتیں تڑپ تڑپ کر گذاری ہیں۔ لمحے لمحے کا کرب سہا ہے اب نہ تڑپا نا صدیوں کا سا انتظار کیا تھا اک اک پل میں تمہارے فون کے لئے بے چین ہوا تھا۔ کہاں کھو گئی تھیں اب بتا دو۔ کہہ دو کہ تم میری ہو۔"

وہ اپنی ساری بے قراریاں اور بے تابیاں لہجہ میں سمو کر بولتا چلا گیا۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے احتشام میں ندا نہیں ہوں ثمن بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے ثمن کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"ثمن۔!"

احتشام کے ہاتھ کی گرفت ریسیور پر ڈھیلی پڑنے لگی دل کو زبردست جھٹکا سا لگا۔

"ندا کہاں ہے، اس نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے سب کچھ بتا دے گی۔ میں اُس کے منع کہنے پر نہ آیا ورنہ ایک پل یہاں نہ رُکتا۔ خدا کے لئے بتائیں وہ کہاں ہے اس نے فون کیوں نہ کیا۔؟"

وہ تڑپ اُٹھا تھا۔

"وہ... وہ جا چکی ہے احتشام۔"

ثمن نے دھیرے سے کہا۔

اور

احتشام شدید جھٹکوں کی زد میں آکر رہ گیا۔ کانوں میں جیسے سناٹے چیخنے لگے۔

"وہ چلی گئی۔ کہاں، کب، کیوں؟"

وہ اپنی کٹی ہوئی شہ رگ کے درد پر قابو پا کر بولا۔

"اُس کے بھائی آکر اُسے لے گئے ہیں وہ تمہارے نام اک خط چھوڑ گئی ہے۔!"

ثمن نے بتایا۔

"میں ابھی آرہا ہوں۔!"

اس پر جنون سوار ہو گیا۔

اور
یہ جنون راستے کی ہر رکاوٹ کو پار کر گیا مگر پھر اُسے اپنی
راہ میں لاتعداد پتھر بچھے ہوئے معلوم ہوئے کانچ کے ٹکڑے کسی
نے بکھیر دیئے ساری راہیں کانٹوں سے بھر گئیں۔
اُس کے کانپتے ہاتھ میں ندا کا خط لرز رہا تھا اس کے آنسوؤں
میں ندا کی خوبصورت تحریر دھندلا گئی
اور میں نے تمہیں ٹھکرا دیا۔ تم سمجھے میں تم سے نفرت کرتی
ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تم بھلا کیا جانو تم نے اتنی خاموشی سے
میرے من پر قبضہ کیا کہ مجھے پتہ بھی نہ چلا اور جب معلوم ہوا تو میرے
دل کی دھڑکن بن چکے تھے۔ تمہیں بھلانا خود کو بھلانا تھا مگر میں
تمہیں حاصل نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میں نے تمہیں احترام و عقیدت
دی ہے یہاں تک کہ تمہاری عبادت میں خدا کو بھلا بیٹھی۔ لیکن
میں جس شئے کی تمنا کروں اگر وہ مل جائے تو اپنی قدر کھو بیٹھتی ہے۔
بس میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تمہیں پاکر تم مجھ سے چھین لیے گئے
نہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں تمہیں دے دیا کیونکہ... کیونکہ
تمہیں دے کر میری بے چینی اور بے کلی بڑھ گئی۔ یہ بے چینی مجھے
بہت عزیز ہے۔ شام میں راہوں کی دھول ہوں تمہارے قدموں
تلے روند کر کچھ دیر تک تمہارے ساتھ تو رہ سکتی ہوں مگر زندگی
کے طویل راہوں پر تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی مجھے تلاش نہ کرنا
ورنہ تم بکھر جاؤ گے۔!"
اور پھر
وہ ہر لمحہ بکھرا۔ بار بار سمیٹا اپنے وجود کو اور پھر اپنے آپ کو
کھونے لگا۔
"میں تمہیں دنیا کے آخری کونے تک تلاش کروں گا ندا۔"
ندا۔
ندا۔
ندا۔
اس کی بازگشت ہر طرف ہر کونے اور ہر گوشے میں پھیل گئی۔
در و دیوار سے لپٹ لپٹ گئی۔ ہر صدا ٹکرا ٹکرا کر ناکام واپس لوٹ آئی۔
اگر وہ اسے نہ مل سکی تو۔ نہیں۔ نہیں
وہ تڑپتا دل تھام لیتا۔ بے چین روح کو دلاسے دیتا۔ مجھے
اپنے عشق پر اعتماد ہے تم ضرور ملو گی مجھے وہ اُسے بڑی شدت
پاکیزگی اور خلوص سے چاہتا تھا۔ اس کی پرستش کی تھی۔ وہ اپنی عبادت
میں ندا کی نہ چاہتا تھا۔ اسی لئے تو ہر دم اس کے لبوں پر اُس کی
صدا تھی۔

بخار سے اس کا جسم پھنک رہا تھا۔ بھابی اُس کی پیشانی پر ٹھنڈی
پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ عاصم بھائی بھی قریب ہی بیٹھے تھے جب سے
وہ اپنے دورے سے واپس لوٹے تھے احتشام کو یوں بکھرا بکھرا
ٹوٹا ٹوٹا اور بے بس سا پایا تھا۔
"میں مر رہا ہوں ندا۔ مجھے آکر تھام لو نا۔"
اس کے سوکھے لب ہلے تو ندا کا نام ہی اُبھرا اس کا عشق
ہی بولا۔ اُس کا رواں رواں پکار بن گیا تھا۔ رگ رگ صدا بن گئی
تھی۔
"شام میرے بھیا یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔!"
بھابی اس کے شانے پر سر رکھے رونے لگی تھیں۔
"شام۔"
عاصم بھائی اُسے پکارتے ہوئے اُس پر جھک گئے وہ پھر
بے ہوش ہو گیا تھا۔ عاصم بھائی نے دوا میں کوئی کسر نہ چھوڑی بھابی نے
خدا کے سامنے رو رو کر منتیں مان مان کر اپنے لاڈلے دیور کی
زندگی کی بھیک مانگی تھی۔
"اگر خدانخواستہ اُسے کچھ ہو گیا تو۔"
وہ تو اس گھر کی رونق ہے ان دونوں کی جان ہے۔ ان کی
اولاد ہے
ان کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔
یہ پھلواری جسے انہوں نے اپنی محبت کا شہد پلا کر پروان
چڑھایا تھا اجڑا چلا جاتا ہے کیا۔
"نہیں۔ خدا اتنا بے رحم نہیں۔ اتنا ظالم نہیں!"
اور
خدا کی رحمتوں کے بیش بہا لمحے آتے ہی گئے۔
احتشام سنبھل گیا تھا۔ وہ بستر مرگ سے اُٹھ گیا تھا۔
"خدا کے لئے شام اب اپنے آپ کو فراموش نہ کرنا ورنہ ہم
سب مر جائیں گے!"
بھابی نے یوں تڑپ کر کہا کہ وہ پگھل گیا۔ انہیں وہ اپنی ماں
سمجھتا تھا۔ اس کا سر تعظیم سے جھک گیا۔
"خود فراموشی کے وہ لمحے ہر عذاب سے ناآشنا تھے کسی کے
پیار میں مر جانا تو بہت آسان ہے مگر مر مر کر جینا ہی محبت کی معراج
ہے میں اس معراج کو حاصل کروں گا۔"
"میں ہر دم تمہارے لئے خدا سے دعا کروں گی شام تمہیں صبر
دے۔"
"محبت کو صبر آجائے تو وہ مر جاتی ہے بھابی میں اس لئے زندہ

رہوں گا کہ یہ جو اذیت مجھے مل رہی ہے اس میں بہت لذت ہے ندا کی یاد آتی ہے اور پھر وہ بھی تو مجھے چاہتی ہے مجھے کھو کر بھی چاہتی رہے گی۔ یہ اس کی محبت کی انتہا ہے اور میرے عشق کی حدِ آخر اس کا حاصل ہے بس یہ دعا کریں میں اپنی تلاش میں کامیاب ہو جاؤں وہ مجھے مل جائے کہ میں اپنی وفا کو سرخرو کر سکوں!"

اس کے لہجہ میں اعتماد تھا۔ محبتوں کی پختگی تھی۔

اور

ارادوں کی چٹان جیسی مضبوطی تھی اور وہ اپنے اس عزم کو لے کر آگے بڑھنے لگا۔ اس شام عاصم بھائی نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی وہ خود لاہور جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کی ندا تھی مگر وہ ابھی عاصم بھائی کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابھی وہ آرام کرے۔ لیکن انہیں محسوس ہو گیا تھا۔ کہ وہ اپنی منزل کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا وجود کھو کر رہ جائے اس لئے بھائی کے مشورے سے انہوں نے اس کے لاہور جانے کے انتظامات کروا دیئے۔

"میں چاہتا ہوں احتشام کہ تم لاہور والے آفس کا جائزہ لے آؤ۔"

انہوں نے کاروباری کام سے بھیجنا زیادہ مناسب سمجھا ان کا کاروبار ہر بڑے شہر میں تھا اور ہر جگہ شاخ موجود تھی وہ اسی لئے اسے لاہور بھیج رہے تھے کہ کچھ کام کی نگرانی بھی ہو جائے اور احتشام کا دل بھی بہلا رہے۔

اندھا کیا مانگے دو آنکھیں۔

احتشام کو جیسے اس کی خوشیوں کا پروانہ مل گیا تھا۔

اب اس کی تلاش و جستجو بے قراری اختیار کر گئی۔

وہ شام کی فلائیٹ سے لاہور آ گیا۔

"ندا... ندا... ندا۔"

اس کی نگاہ ہر سمت پھیل گئی دل کی ہر دھڑکن صدائے عشق بن کر گونج رہی تھی۔

مگر

وہ کہیں ہوتی تو اس کی صدا سنتی اسے دیکھتی اس کے استقبال کو آتی۔

احتشام کا دل بجھنے لگا۔ مایوس سا وہ گھر آ گیا۔ یہاں رحمت بابا اس کے منتظر تھے۔ رحمت بابا ان کے پرانے ملازم تھے۔ اور لاہور والی کوٹھی کی حفاظت ان کے ذمہ تھی۔ جب بھی احتشام یا عاصم آتے ان کی رگوں میں زندگی دوڑ جاتی۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ وہ عاصم کے چھوٹے سے چھوٹے کام کا خیال رکھ رہے تھے اس کا کمرہ خوب صاف کر کے نفاست سے سجا ہوا تھا مگر احتشام کو ہر شے اداس لگنے لگی۔ در و دیوار سے وحشت ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ روح میں جیسے کرچیاں سی اترنے لگیں۔

"کب ملو گی ندا۔"

وہ پکار کر رہ گیا۔

دو دن گزر گئے تھے مگر اسے اپنی منزلوں کا سراغ نہ ملا تھا اداس اداس گھر میں ڈوبی ہوئی شام کی ساری تلخیاں اس کی روح میں گھلنے لگی تھیں۔ کرسی کی پشت سے سر ٹیکے وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتا ہوا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کھو کر بھی اس میں سمائی ہوئی تھی۔

وہ اس شہر خموشاں میں اسے کہاں تلاش کرے۔

کس سے پوچھے اس کا پتہ۔

کس کو بتائے کہ اس کی محبوبہ اسے انجانا دکھ دے کر چلی آئی ہے۔

وہ اپنے سوالوں کا جواب دھندلی دھندلی سی فضاؤں میں ڈھونڈ رہا تھا۔

"احتشام!"

وہ اس وقت چونکا جب جاوید اس کا شانہ ہلا کر اسے پکار رہا تھا۔ جاوید اس کا بہترین دوست تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ امریکا سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لی تھی جاوید کے والدین کا کاروبار لاہور میں تھا اس لئے اس نے یہیں کاروبار سنبھال لیا تھا۔ احتشام جب بھی آتا تھا وہ اس سے ضرور ملتا تھا۔ اب جیسے ہی اسے اس کے آنے کی اطلاع ملی وہ چلا آیا۔

"معلوم ہوتا ہے جناب کسی خوبصورت سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔"

جاوید مسکرانے لگا۔

"بیٹھو یار!"

وہ جھینپ سا گیا۔

"اپنے آنے کی اطلاع تو دے دیتے!"

"دو دن تک بہت مصروف رہا تھا۔ آج فرصت ہی ملی ہے"

"جب ہی کچھ اور پروگرام بنانے کا سوچ رہے ہو!"

جاوید ہنسا۔

رحمت بابا چائے بنا کر لے آئے تھے جاوید ان کا حال پوچھنے

لگا تھا۔

"احتشام تم کل شام تو فری ہو نا۔!"

جاوید نے چلتے چلتے کافی کا کپ اس سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کل شام تو فری ہوں کوئی خاص بات ہے کیا۔!"

"ہاں تمہیں یاد نہیں کل ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔!"

"ارے ہاں یاد آیا!"

"تو تم آرہے ہو نا!"

"تمہاری خاطر تو آنا ہو گا۔ ورنہ بھابی بھی ناراض ہو جائیں گی!"

وہ مسکرایا۔

"ہاں وہ تو تمہاری اچھی طرح خبر لے گی!"

وہ ہنس دیا۔

کافی دیر تک وہ بیٹھا رہا تو احتشام کا دل لگا رہا وہ چلا گیا تو احتشام اٹھ کر اندر آگیا۔

کل

کیا معلوم اس کے لئے کیسی ہو، کیا پیغام لائے!

شاید کوئی بہار کا معطر جھونکا اس کا پیغام سنا جائے اس کا دل چاہا کہ وہ اس بہاراں ہواؤں، ان فضاؤں اور اس چاند سے کہے کہ اسے اس کا ٹھکانہ بتا دے۔

یا پھر

اس تک ہی یہ پیغام پہنچا دے کہ صحرا صحرا بھٹک کر اسے پکار رہا ہے دل میں امیدیں سی تھیں اور لبوں پر دعائیں۔

اک سلگتی سی کشش اسے اس ماحول میں محسوس ہو رہی تھی۔

وہ ہر چہرہ دیکھ رہا تھا ہر وجود میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔ خاموشی سے سگریٹ پیتا ہوا وہ سوچ رہا تھا مہمانوں کی مدھم مدھم سرگوشیوں میں کوئی بھی تو ویسی آواز نہ تھی قیمتی پرفیومز کی مہک نے ساری فضا کو معطر کر رکھا تھا۔

مگر

اس کے وجود پر جو خوشبو چھائی ہوتی تھی وہ اس کے کھو جانے کے بعد بھی اس کی لپیٹ میں تھا۔ جاوید اور اس کی بیوی صدف ہنستے ہوئے اس کے قریب آگئے۔

"آؤ احتشام۔ تم یہاں اکیلے بیٹھے ہو۔ وہاں ہم نے موسیقی کی ایک محفل کا اہتمام کیا ہے!"

صدف بولی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا ہے مجھے یہیں رہنے دیں۔!"

"اس کی آواز سنو گے تو خود ہی کھنچے چلے آؤ گے۔!"

جاوید ہنستا ہوا چلا گیا۔ صدف دوسرے مہمانوں سے دخلت کرنے لگی۔ موسیقی کے شائقین اک اک کر کے اٹھ کر جانے لگے اور وہ تنہا بیٹھا احساسوں میں ڈوبا سگریٹ پیتا رہا۔

اچانک

وہ چونکا۔

ستار کے تار بڑی بے دردی سے کسی نے چھیڑ دیئے تھے وہ زخمی ہونے لگا۔ اس کی روح جسم کے اندر جیسے پھڑپھڑانے لگی۔

وہ آواز۔

آنسوؤں میں ڈوبی اور آہوں کے سوز میں ڈھلی۔

اس کی اک اک رگ میں بے چینی پر پا کر گئی وہ تیزی سے اٹھا اور باہر لان میں آگیا۔ سب مہمان غزل سننے میں محو تھے۔ اور اس لمحے اس کے دل کی اک اک دھڑکن چیخ اٹھی۔

"ندا۔"

"ندا۔"

"ندا۔"

اسے اپنی بصارت پر اعتبار نہ آرہا تھا مگر وہ تو وہی تھی بے حد مقدس پاک معصوم اور سوگوار اداس مضمحل۔ سفید ساڑھی میں ملبوس وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح لگ رہی تھی۔ بے قرار بے چین اور مضطرب سی اس کے ہاتھوں میں ستار کانپ رہا تھا شانے پر ٹکا ہوا ستار جس کے تاروں کو وہ اپنی زخمی انگلیوں سے بڑی بیدردی سے چھیڑ رہی تھی۔ بند پلکوں پر شبنم کے لرزتے قطرے سوگواری اداسی دکھ عجیب سی کیفیت اس پر طاری تھی اس کی آواز کے کرب دکھ درد اور سوز نے غزل کو ایک نیا حسن سوز بخش دیا تھا اپنے آپ سے بے نیاز سی وہ اپنا درد لٹا کر سب کو تڑپا رہی تھی۔

تب۔

احتشام کا دل چاہا کہ جا کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دے یا اس کے ہونٹوں سے وہ الفاظ چھین لے وہ آہیں وہ نالے چھین لے جنہوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا اس کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ اپنی اس جان سے زیادہ عزیز محبوبہ کا دکھ دیکھنے کا اب اس میں حوصلہ نہ تھا وہ تڑپ تڑپ جا رہا تھا۔

مگر

اپنی جگہ پر ساکت تھا۔

پتھر ہو گیا تھا اس حقیقت پر۔

سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ اس خوشی پر ناچے۔

یا

اس کے دکھ درد، کرب اور سوگواری پر اتنا روئے کہ خود اس کا اپنا وجود آنسوؤں کا سمندر بن جائے۔

غزل ختم ہوئی۔

سحر ٹوٹ گیا۔

مگر وہ کھویا رہا، وہ اس کے سامنے تھی مگر اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔

"تم نے تو آج ساری محفل لوٹ لی، ندا۔"

صدف نے ندا کے قریب آکر ستار اس کے ہاتھ سے لیا۔ اور جواب میں وہ دھیرے سے ہنس دی پھیکی پھیکی سی زخمی ہنسی اور اٹھنے لگی۔

مگر

کھڑے ہونے سے پیشتر ہی لڑکھڑا گئی اور صدف کو تھام لیا۔

"مجھے اندر لے چلو صدف"

اس نے صدف سے آہستہ ہی کہا۔

اور

احتشام کے دل پر ہوش و حواس پر بجلی گر پڑی اس طرح کہ سب کچھ جل کر راکھ ہونے لگا۔ تباہ ہونے لگا۔ یہ سب کچھ کیا تھا وہ سہاروں کی تلاش میں کیوں لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں کہ اس کا سب سے مضبوط سہارا تو سامنے تھا۔ مضبوط محفوظ پناہ گاہ ہوتے ہوئے بھی وہ دوسروں پر کیوں انحصار کر رہی تھی۔

جاوید اس کے قریب آ گیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو یار۔"

"یہ..... یہ....."

وہ کچھ کہہ نہ سکا ندا کی طرف اشارہ کر کے رہ گیا۔

"صدف کی سہیلی ہے پڑوس میں رہتی ہے دونوں ٹانگوں سے معذور ہے بیچاری۔"

جاوید نے ہمدردی سے کہا تو احتشام کے دل کے ٹکڑے ہو گئے۔

معذور!

معذور!

معذور!

ہر طرف سے یہی صدا ابھرنے لگی وہ پاگل ہو گیا وہ تیزی سے اندر لپکا جہاں صدف اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر اندر لے گئی تھی۔

"ندا۔"

ڈرائنگ روم کی خوابناک فضا میں اس کی ندا سحر زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہیل چیئر پر بیٹھی بے حد بے بس تھی چہرے پر دکھ کے تاثرات تھے اور آنکھوں میں آنسو جمع تھے پینے کے لئے۔

"ندا۔"

وہ اس کے قدموں میں جھک گیا۔

اس کے دل کی ایک اک دھڑکن سراپا صدا بن گئی۔

"بہت تڑپایا ہے بہت ستایا ہے۔ بہت رلایا ہے مجھے تمہارے عشق نے خدا کے لئے اب نہ تڑپانا ورنہ میں مر جاؤں گا۔ میں صرف تمہاری تلاش کے لئے بھٹکا ہوں مجھے پناہ دے دو ندا۔"

"میں خود بے سہارا ہوں شام۔ دیکھو میری حیثیت اس لئے تم سے اپنا آپ چھپاتی رہی تھی۔ کہ کہیں تم بھی اوروں کی طرح میری حقیقت جان کر مجھے ٹھکرا دو میں اسی لئے چپ چاپ بھائی جان کے ساتھ چلی آئی۔ میں نے تنو کو بھی منع کر دیا تھا کہ تمہیں کچھ نہ بتائے مگر شام انسان جس بات سے ڈرتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے میں نے خود کو تم سے چھپایا مگر تقدیر نے یہاں بھی مجھے نہ چھوڑا۔ تم چلے جاؤ شام تمہیں مجھ سے بہتر ہمسفر مل جائے گی۔ زندگی کی طویل راہوں کے لئے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تم میرا کہاں تک ساتھ دو گے۔"

"جب تک میری سانس رہے گی میں تمہیں چاہتا تھا مگر اب پرستش کرنے لگا ہوں تمہارا در چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا۔ تم ہی میری بندگی ہو میری روح۔ میرا سب کچھ۔ میں تمہیں یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اپنی دلہن بنا کر۔ چلو گی نا میرے ساتھ۔"

اس کے دونوں ہاتھ تھامے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑی التجا سے بولا۔

"شام!"

وہ رونے لگی۔

"جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں ندا۔ اور ہم ایک دوسرے کے لئے اس دنیا میں آئے ہیں ہم ایک دوسرے کو چاہیں گے دکھ درد بانٹیں گے ساتھ جئیں گے ساتھ مریں گے۔"

احتشام نے بڑے اعتماد سے ٹھوس لہجہ میں کہا۔

اور

اس لمحے ندا ہار گئی اس کے دونوں ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کر وہ رونے لگی جو اس کا اقرار تھا۔ شام نے اس کے وجود کو سمیٹ لیا۔

شاہدہ ارم

گولڈن اسٹیپ

کریوٹ

نیلڈ ویلیج کو اس نے ہمیشہ خوبصورت بہاروں کے روپ میں دیکھا تھا مگر آج وہاں کے رنگ بے رنگے

پھول اسے کانٹے بن کر چبھ رہے تھے وہ وہاں کی صاف ستھری کشادہ سڑک کو قدموں تلے روندتا ہوا ہوٹل کی طرف واپس آ رہا تھا اس کے دماغ کے سارے خانے روشنی ہو چکے تھے لزتھبہ کی محبت کی چریا اس کے دل و دماغ سے پگھلی تو حقیقت کی دھوپ چاروں طرف سے اس کا احاطہ کئے ہوئے تھی جھنجلاہٹ بے بسی اور کمپلیسٹ میں غم و غصے کی اتنی شدت تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا جو چیز راستے میں آئے اس کو جہنم رسید کر دے۔

لیکن!

وہ سوقیانہ جذبات کا حامل انسان نہیں تھا ورنہ سب سے پہلے اس نے لزتھبہ کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبانا تھا اچھا بھلا ذمہ دار سینئر پوسٹ پر فائز انجینئر تھا جس نے بڑے ٹھوس اور باضابطہ طریقے سے محبت کی وادیوں میں قدم رکھا تھا اور بڑے صبر کے ساتھ ایک خوبصورت وقت کے لئے اپنے آپ کو تمام آلودگیوں سے بچا کر رکھا تھا اسے اپنی محبت اور جذبے پر اتنا مان تھا کہ اس نے اپنے قول و فعل کو تضاد سے بچانے کے لئے اپنے خونی رشتوں کی بھی پرواہ نہ کی تھی

تیسری منزل پر اس کا کمرہ تھا اس کے خون میں اتنی حدت اور جوش تھا اس نے لفٹ کا بھی انتظار نہ کیا اور ایک ایک سیڑھی کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا ایک ہی سانس میں اپنے کمرے تک جا پہنچا ایک ٹھوکر سے اس نے دروازہ کھولا اور کمرے کے وسط میں جا کھڑا دبیز قالین انگارے بنا ہوا تھا اتنی سردی کے باوجود اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے ساری کھڑکیاں نہایت بے ڈھنگے انداز میں کھولیں آج اس نے وہ تمام انگریزی آداب بالائے طاق رکھ دیئے تھے جس کا پرچار اس نے پاکستان جا کر بڑی شد و مد سے کیا تھا۔

ہوا کے تند و تیز جھکڑوں نے اس کے منہ پر اس بدتمیزی سے کھڑکی کھولنے پر دو چار چانٹے مار کر جلتی پر تیل کا کام کر دیا اس نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور ایک ہی سانس میں خالی کر گیا اس تمام جذباتی کشمکش اور ہاتھ پیروں کی بے ڈھنگی ورزش نے اسے بالکل نڈھال کر دیا تب وہ بے سدھ چپ چاپ بستر پر جا گرا۔

لزتھبہ کے ساتھ گذارے ہوتے گرین فیلڈ میں دو سال اور پاکستان جا کر خط و کتابت کے سہارے گزارے ہوئے تین سال اس کی آنکھوں سے برق بن کر یوں گزرے کہ کوئی سرا بھی اس کے ہاتھ نہ لگا۔

اتنی چمک تھی۔

اتنی چنگاریاں تھیں۔

اتنی تپش تھی کہ اوراق کی ترتیب پر اس کی گرفت بے انتہا کمزور رہی۔

تب اس کا دل چاہا کہ

کیا ایسا نہیں ہو سکتا میرے دماغ پہ فالج گر جائے اور میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہ رہوں۔

مگر ایسا بھی نہیں ہوا۔

اس نے بے بسی سے تکیے پر سر رگڑا۔

ہم پاکستانی نوجوان بھی کتنے بے وقوف ہوتے ہیں تعلیم حاصل کرنے یہاں آتے ہیں اور مغرب کی کھلی بے حیائی کو گلے لگا لیتے ہیں اپنی مشرقی، باحیا معصوم لڑکیوں کو بیک ورڈ گردانتے ہیں اور مغرب کی اداؤں میں اپنی حیا اور معصومیت نثار کر دیتے ہیں ان کی عریانی ہم جیسی بند بوتلوں کے لئے چابی کا کام دیتی ہے ذرا سا پیچ گیا اور ہم بے تحاشا بپھرے ہوئے جھاگوں کی طرح سیدھے آسمان پر۔ اس سے قطع نظر کہ اس بند لاوے کے بکھرنے سے ہمارے آباؤ اجداد کی سینت سینت کر رکھی ہوئی عزت و ناموس کے منہ پر کتنی زبردست کالک لگتی ہے۔

ہم جو اپنی قوم اپنے وطن کی امانت ہوتے ہیں اپنی حب الوطنی کی کیسی دھجیاں اڑاتے ہیں ہزاروں روپیہ ہمارے والدین ہماری اعلیٰ تعلیم پہ خرچ کرتے ہیں۔

اور ہم

دولت۔ اسٹیٹس اور سنہری زلفوں کے نشے میں۔ "گرین کارڈ" حاصل کرتے ہیں۔

ناپاکیوں کی دلدل میں سرتاپا یوں غرق ہو جاتے ہیں جہاں پاکیزگی کا کوئی تصور ہماری نگاہوں میں باقی نہیں رہتا۔

اور وہ جو ہم سے منسوب ہوتی ہیں۔

جنہیں ہم خدا کی قسم کھا کر یقین دلا کر آتے ہیں کہ ہم صحیح سلامت لوٹ آئیں گے۔

تمہارے ہیں تمہارے ہی رہیں گے۔

تمہیں قسم ہے ان چاند ستاروں کی اسی جگہ پر ہمارا انتظار کرنا وقت سے مجبور نہ ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

وہ ہمارے انتظار میں زندگی کے کتنے خوبصورت سال ہماری یادوں اور وعدوں کے حصار میں اپنے آپ کو قید کر کے بیکار ضائع کرتی ہیں۔

کتنی پاگل ہوتی ہیں نا ۔ بے وقوف ۔ ۔"

وہ ہذیانی ہنسی ہنسا۔

اس کی نگاہوں میں مریم کا سراپا گھوم گیا۔

وہ آج بھی اپنے کمرے میں دریچے سے سر ٹکائے آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگی۔

بوگن ویلا کی پتیاں مسلتے ہوتے بے شمار آنسوؤں کو پلکوں کے توسط

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سے رخساروں پر ڈھلکیں رہی ہوگی۔

اور وہ آنسو یقیناً اس کی گردن کی ہمسفری میں اس کے سینے میں جذب ہوگئے ہوں گے پھر وہ آنکھوں کی راہ نکلے ہوں گے اس کے آنسوؤں کا عمل فوارے کی مانند تھا کبھی نہ ختم ہونے والا اسٹاک اس کے سینے میں جمع ہو چکا تھا۔

اس کو اس کرب میں مبتلا کرنے والا کون تھا؟

وہ خود۔

وہ پہلی مرتبہ بے انتہا شرمندہ ہوا۔

محبت میں ٹھوکر کھائی تو محبت کا درد جانا۔

کیا مریم بھی ایسا ہی تڑپی ہوگی!

کیا اس کے سینے میں بھی درد یوں جاگا ہوگا!!

اس نے لاشعوری طور پر ٹھکرائے ہوؤں کا موازنہ کیا۔

اس کے دل و دماغ میں بڑی زبردست کشمکش تھی۔

غیرت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ پاکستان جا کر منہ ہی نہ دکھاتا۔ کس قدر طمطراق اور اعتماد سے وہ حسب وعدہ گرین فیلڈ تین سال بعد آیا تھا۔

گرین فیلڈ خوبصورت سی وادی جو اس کی تمناؤں کا مرکز تھی۔

جہاں اس نے فریڈھ کے ہمراہ کتنی حسین صبحیں اور شامیں گزاری تھیں اور اپنے دمکتے مستقبل کے تانے بانے بنے تھے فیوچر پلاننگ کی تھی بلکہ صحیح معنوں میں محبت کے جالوں میں پھنسا تھا زندگی کی حسین قدروں کو روح میں پیوست کیا تھا جو اپنے یہاں کی ڈھکی چھپی عورتوں کی نازک اداؤں سے واقف نہ ہوا تھا سنہری زلفوں کی کج اداؤں سے مات کھا گیا تھا۔

اور آج

آج وہ سنہرے ناگ اس کی گرفت سے باہر تھے وہ اپنی زلفوں کے تمام پیچ و خم اس کی بند مٹھیوں سے یوں نکال لے گئی تھی کہ اسے پتہ بھی نہ چلا۔

اس کی مٹھیاں یونہی بندھی کی بندھی رہ گئیں۔

مگر اندر سے کوئی چیز غائب ہوگئی تھی۔

اس نے ہتھیلیاں پھیلا کر دیکھیں کتنے بدنما داغ تھے اس نے جلدی سے گھبرا کر ہاتھ نیچے کر لیے۔

ہائے حقیقت سے تو فرار نہیں میں لاکھ اپنے داغ چھپاؤں۔ ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں مگر وہ داغ تو نہ چھپ سکیں گے جو میری سفید حویلی پر لگے ہیں۔

اس نے لندن سے واپسی پر تین سال اجنبی بن کر پاکستان میں گزارے تھے وہ سفید حویلی جس کے تقدس پر اسے کبھی فخر تھا اس کا رنگ اس کا اسٹائل اسے کتنے فرسودہ اور پرانے لگتے۔ وہاں کے فرنیچر اور سٹینگ میں ہزار ہا نقص گنوا دیتے تھے مگر کوئی تبدیلی نہ کروا سکا تھا کیونکہ حویلی کی روایات جو کہ ہرگز بھی اتنی فرسودہ نہ تھیں جتنا اسے لگتی تھیں اسی آن بان سے موجود تھیں اور کسی کو آپس میں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ تھی ادب و احترام کی منزلوں سے روگردانی کا خیال کسی کے دماغ میں آیا ہی نہ تھا اب یہ تو نہ تھا کہ وہ سات سمندر پار گیا تھا تو سات ہزار تبدیلیاں اس کی برداشت کر لی جاتیں۔

مگر آج

جبکہ اسے یہاں آئے دوسرا دن پورا بھی نہ ہوا تھا اسے بری طرح سفید حویلی یاد آگئی جس میں اس نے اپنے ماضی کا بڑا حسین دور گزارا تھا۔

ایبٹ آباد کے خوبصورت سے پہاڑی علاقے میں ایک عظیم الشان حویلی تھی جو پوری کی پوری سفید تھی اس کے چاروں طرف ایک مخصوص رقبے پر گھاس کے خطے تھے جو حویلی ہی کا ایک حصہ تھے اور اس قدر نفاست اور ترتیب سے سجے تھے جو اپنے مکیں کے ذوق کی کھلی عکاسی کرتے تھے۔

حویلی کے بیک سائڈ پر سفیدے، پام، کھجور اور ناریل کے درخت قطار در قطار یوں ایستادہ تھے جیسے حویلی کے محافظ سینہ تانے کھڑے ہوں حویلی کے دائیں طرف سبزیوں کے چھوٹے چھوٹے حصے تھے جن میں قسم قسم کی سبزیاں لگی ہوتی تھیں بائیں طرف پھلوں کے درخت تھے آڑو، آلو بخارے امرود، آم اور خوبانی و انار وغیرہ۔

حویلی کے بالکل سامنے کشادہ اور خوبصورت سا لان تھا جو ہزارہا مختلف قسم کے پھولوں سے بھرا پڑا تھا دائیں طرف کار پارکنگ کے لئے مخصوص جگہ تھی جہاں تک جانے کے لئے ذرا سا گولائی میں سرخ بجری کی روش تھی اور برآمدے تک پہنچنے کے لئے سنگ مرمر جس میں رنگین پتھروں کی آمیزش تھی ایک رہداری سی تھی بائیں طرف ہری ہری ترشیدہ گھاس اور خوبصورت سے پھولوں کے جھرمٹ میں ایک تالاب تھا جو مکمل طور سے سنگ مرمر کا تھا اس کا فوارہ آرٹ کا شاہکار تھا جو ایک جل پری کی صورت میں تھا اس کے خوبصورت سے دہانے سے پانی کی پھواریں نکلتیں تو محسوس ہوتا کوئی شریر دوشیزہ پانی سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے اس پر پیچھے لگے رنگین قمقموں کے انعکاس سے قوس و قزح کے رنگ بکھر جاتے۔

حویلی کی ظاہری شان و شوکت ہی نہ تھی درون خانہ بھی یہ اپنی شاندار روایات اتحاد اور نفاست پسندی کی وجہ سے مشہور تھی اس میں اس وقت تین خاندان آباد تھے دو بھائی اور ایک بہن۔

وجاہت علی، شجاعت علی اور ان کی چھوٹی بہن رفعت جہاں اور ان تینوں کی والدہ ثریا خانم۔

وجاہت علی کے دو لڑکے منیر اور جنید اور دو لڑکیاں رومی اور نبیلہ تھیں۔

شجاعت علی کی تین لڑکیاں صدف، کرن اور یاسمین تھیں اور اکلوتا لڑکا عمیر اور رفعت جہاں کے صرف مریم تھی۔

رفعت جہاں کے شوہر حسن دانش وجاہت علی کے دوستوں میں سے تھے ان کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا بڑے شریف النفس اور حلیم الطبع قسم کے انسان تھے جب رفعت جہاں کی شادی کا وقت آیا تو وجاہت علی نے اپنی والدہ ثریا خانم کے سامنے حسن دانش کو پیش کر دیا ثریا خانم کو حسن ہر لحاظ سے پسند آئے ان کے شوہر اسحاق علی کے انتقال کو دو سال ہو گئے تھے اور وہ جلد ہی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں وجاہت اور شجاعت کی شادی دو دو سال کے وقفے سے انہوں نے پہلے ہی کر دی تھی کیونکہ حسن دانش اس دنیا میں اکیلے تھے اس لئے اس کشادہ حویلی سے نکل کر کہاں جاتے سب نے سر آنکھوں پر بٹھایا وہ بھی ہمیشہ داماد کے بجائے تیسرا بیٹا ہی بن کر رہے۔

عمیر تین سال کا تھا جب رفعت جہاں کے یہاں مریم ہوئی شجاعت علی نے اس خوبصورت سی گول مٹول بچی کو گود میں اٹھاتے ہی اعلان کر دیا۔

"یہ میرے عمیر کی دلہن بنے گی۔"

"اونچا ہاتھ مار گئے پارٹنر۔"

وجاہت علی نے اپنے چھوٹے بھائی کو سینے سے لگایا۔

"ایسی بھی کیا بے صبری ابھی اس معصوم کو [illegible] ین آئے چند گھنٹے ہی ہوتے ہیں۔"

وجاہت علی نے زوردار قہقہہ لگایا تو شجاعت علی جھینپ گئے۔

"نہیں بھائی جان مذاق اڑانے کی نہیں ہو رہی۔"

پھر ایک دم بچی کی پیشانی چومتے ہوتے بولے۔

"رفعت جہاں اس کا نام مریم رکھنا بڑی پاکیزگی اور تقدس کا احساس ہوتا ہے۔"

ثریا خانم جنہیں سب دادی اماں کہتے تھے اپنے بیٹوں کی محبت بھری چھیڑ چھاڑ پر دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھیں۔

"خدا تم سب میں ہمیشہ اتحاد رکھے۔"

انہوں نے دل کی گہرائیوں سے دعا دی۔

کتنا پرسکون اور اعتدال پسند خاندان تھا حویلی کا۔ اتنی یک جہتی اور خلوص کہ دلوں میں کسی قسم کے کھوٹ اور بے ایمانی کا شائبہ تک نہ تھا سب ایک دوسرے کے دھوپ چھاؤں کے ساتھی تھے۔

دادی اماں کا وجود اس روشن مینارے کی طرح تھا جس کی شعاعوں سے حویلی کے در و بام میں اجالا تھا ان کی ہستی بڑی بارعب مگر کتنی نرم و ملائم ریشم کی طرح تھی جس کی چمک اور گداز سے حویلی کے ہر فرد کے قلب و جاں منور تھے۔۔ ان کی

دینی تعلیم!

زندگی کا مثبت نقطہ نظر!!

مثبت و لا اور کے فلسفے!!!

زیست کے نشیب و فراز کا مردانگی سے مقابلہ!!!!

اور

باضمیر با اخلاق پاک و صاف زندگی گزارنے کے بہترین اصول۔

حویلی کے ہر فرد کی گھٹی میں پڑے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے بیٹے اور بیٹی کامیاب و شادماں زندگی گزار رہے تھے کیونکہ وہ دین و دنیا دونوں کی تعلیم سے آراستہ تھے اس کے ساتھ ساتھ دادی ماں اپنے پوتے پوتیوں اور نواسی کی تربیت سے بھی غافل نہ تھیں۔۔۔ ادھر بچے نے بولنا سیکھا اور دادی ماں کی تربیت شروع ہوئی ان کا ایمان تھا کہ بچے کی پہلی اخلاقی درسگاہ ماں کی آغوش ہے ان کی اپنی بہوؤں کو بھی یہ نصیحت تھی۔

"دنیا کی تعلیم تو وہ شعور آنے پر ترقی کی دوڑ میں خود ہی حاصل کر لیں گے مگر دین کی تعلیم سے اگر بے بہرہ رہ گئے تو پھر ساری عمر ان کی بنیادیں کمزور رہیں گی اور پھر ان بنیادوں پر جو بھی عمارت تخلیق ہو گی وہ کھوکھلی اور جلد شکست کھا جانے والی ہو گی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ بچے کے منہ سے سب سے پہلے "اللہ" نکلواتی تھیں پھر وہ ذرا صحیح بولنا شروع کر دیتا تو سب سے پہلے کلمہ پھر چھوٹے چھوٹے سوال و جواب۔ اللہ ایک ہے۔ محمد مصطفےٰ اس کے رسول ہیں۔

نماز کیا ہے؟

قرآن شریف کیا ہے؟

اور جب بچہ چھ سال تک پہنچتا تو دین کی بہت سی بنیادی باتوں سے آراستہ ہو جاتا گھر کے بڑوں کو نماز پڑھتا دیکھتا تو خود بھی شوق اٹھتا۔

اور پھر دادی ماں کا نماز کی طرف راغب کرنے کا طریقہ بھی بہت خوبصورت اور انوکھا ہوتا۔

وہ نہ جانے کس وقت بچے کی جائے نماز کے نیچے ایک آنہ رکھ دیتیں تھیں اور جب بچہ اپنی بساط بھر نماز پڑھ کر دعا مانگ کر جائے نماز تہہ کرتا تو اس کی نظر پیسوں پر پڑتی۔

"دادی اماں یہ کیا؟"

بچوں کے چہرے پر معصوم سی خوشی پھیل جاتی۔

"بیٹا یہ اللہ میاں نے دیئے ہیں جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں انہیں اللہ میاں اچھی اچھی چیزیں دیتا ہے۔"

اور پھر یہ بچپن کا شوق نماز کی عادت بن جاتی۔

وہ بچوں کو کبھی جنوں بھوتوں سے نہیں ڈراتی تھیں ہمیشہ بہادری کا سبق دیتیں تاریخ اسلام سے چھوٹی چھوٹی بہادری کی کہانیاں سناتیں اور بچے اتنے انہماک اور جوش سے سنتے کہ اکثر کا دل مچل جاتا۔

"دادی ماں ہمارے ملک میں جہاد کیوں نہیں ہوتا پھر میں بھی جھنڈا لے کر نکلوں گا۔"

دادی اماں شفقت سے بچوں کو چوم لیتیں۔

"نہیں میرا چاند ہم سب تو مسلمان ہیں جہاد تو کافروں سے ہوتا ہے۔"

بچپن کی اس ٹھوس اور خوبصورت تربیت ہی کا نتیجہ تھا جو وجاہت علی شجاعت علی اور رفعت جہاں کی تمام اولادوں کی اٹھان خوبصورت انداز سے ہوئی ہے۔

سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ہر لڑکے اور لڑکی نے اپنے رجحان کے مطابق علم حاصل کیا تھا۔ دادی اماں کی تعلیم اپنی جگہ پر تھی۔ اور یوں انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔

سارے کزن مل کر رائیڈنگ بھی کرتے، کلب بھی جاتے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کچھ تھا مگر.....

سوقیانہ پن اور چھچھورا پن نہ تھا... سب باوجود فری ہونے کے احترام و اخلاق کو ملحوظ خاطر رکھتے... بزرگوں کی پذیرائی اور چھوٹوں سے شفقت ان سب کی بے ساختہ عادتیں تھیں ان تمام آزادیوں کے باوجود بچپن کی صحیح تربیت کی وجہ سے کبھی کسی نے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی.....

آپس میں ان کی کوئی باتیں ایک دوسرے سے چھپی نہ رہتیں تھیں کھانے پینے سے لے کر پہننے اوڑھنے تک کے مشوروں میں سب شامل ہوتے تھے اس خوبصورت سی حویلی میں اور پر فضا مقام پر انہوں نے زندگی کی کتنی بہاریں ایک دوسرے کی ہمراہی میں گذاریں تھیں کبھی بھی کھوٹ سے مبرا۔ بڑا دلکش وقت گزارا تھا..... جیسے جیسے بچے تعلیم سے فارغ ہوتے گئے دادی اماں نے رشتے کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی اس کی اپنی دونوں بہنیں صدف اور کرن، منیر اور جنید سے بیاہی تھیں جب وہ لندن سے پاکستان پہنچا تھا۔ بقول دادی اماں۔

"اگر گھر میں رشتے موجود ہوں تو کیا ضرورت ہے گھر کی عزت باہر بھیجنے کی۔"

دوسرے سال میں رومی اور نبیلہ اپنے اپنے گھر کی ہو گئی تھیں.... اور اب اس کی اپنی بہن یاسمین اور مریم رہ گئی تھیں۔

مریم جس کو اس نے ٹھکرا دیا تھا۔

یوں نہیں کہ اس سے کوئی پرخاش تھی یا وہ صورت شکل اور تعلیم میں کم تھی اس نے مریم کو کبھی ناپسند نہیں کیا تھا ساتھ کھیلے تھے ایک دوسرے کی عادتوں سے بھی واقف تھے یہ بھی جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے منسوب ہیں

لیکن نہ تو کبھی مریم نے ادائیں دکھانے کی بے جا سعیں کی تھیں نہ عمیر نے کیریئر بنانے کی دھن میں ڈائیلاگ بولے تھے اپنی اپنی جگہ سب مطمئن تھے پر سکون تھے کہ جو جس کا ہے اسی کا رہے گا... مگر....

یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ سارے خواب پورے ہو جائیں گے مگر ایک خواب بکھر جائے گا اور یوں کہ...

اپنے سے منسلک تمام رشتوں کے دامن تار تار کر دیگا لزبتھ درمیان میں نہ آتی تو مریم اس کی تھی وہ مریم کا...

وہ حویلی کی یادوں میں گم ہوا تو تھوڑا سکون حاصل ہوا اور یادوں کی کتاب پر جو اس کی گرفت کمزور رہی تھی نارمل حالت میں آ رہی تھی اس کی نگاہوں میں پانچ سال پہلے کا نقشہ گھوم گیا جب وہ پہلی مرتبہ ایم۔ ایس۔ سی کرنے لندن آ رہا تھا۔ ائیر پورٹ پر گھر کے سارے چھوٹے بڑے موجود تھے اس کی دادی۔ تایا، پھوپھو امی ڈیڈی سارے کزن..... سورج کی پہلی کرن بھی نہ نکلی تھی ایک دم صبح ہی صبح اس کی فلائیٹ تھی۔ کیسی انوکھی صبح تھی!

مسرور کر دینے والی صبح!!!

اس کے تابناک مستقبل کی روشن صبح!!!

سب کے چہرے آنسوؤں کی دھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ابھی رات نے صبح کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا یوں ملگجے اجالے میں مختلف کیفیات کے حامل چہرے ایک دوسرے سے اپنی کمزوریاں چھپائے بظاہر بہادر بنے باتیں کر رہے تھے۔ مگر کچھ دل ہی جان رہے تھے مزا دل کی چاہ کا... جس حصے میں وہ کھڑے تھے وہاں کے بلب فیوز تھے جو ان کی پردہ پوشی کے لئے مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

وہ ان کے خاندان کا پہلا فرد تھا ایک بائیس سالہ نوجوان جو بڑی کم سنی میں انجینئر بن گیا تھا اور بی ای کرنے کے بعد ایک سال سے شور مچا رکھا تھا کہ وہ باہر جا کر تعلیم ضرور حاصل کرے گا۔ کچھ لوگوں نے اسے سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ یوں تمہیں کسی چیز کی کمی تو نہیں..... مگر وہ تھوڑا ضدی اور جو من میں سما جائے کر جانے والا تھا یوں کبھی کوئی غلط قدم اٹھانے کا روادار نہ ہوا تھا بس

اس کے دل میں سمائی اور اس نے رزلٹ کے فوراً بعد کوششیں شروع کر دی تھیں۔
اور آج اس کی خواہش کی تکمیل کی طرف پہلا قدم تھا وہ ایک ایک سے گلے ملا تھا سب نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے گلے لگایا تھا اس کی پیشانی پہ محبتوں کے نشان ثبت کئے تھے ہزاروں دعاؤں کی نور برساتی چھاؤں میں رخصت ہوا تھا... پاسپورٹ۔ ویزا ٹکٹ کے چکروں میں اس نے کچھ محسوس نہ کیا تھا مگر اب ایک دم اس کو بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ اُسے مریم کا سراپا یاد آیا۔
سفید ساڑھی میں سادہ جوڑا بنائے وہ بڑے وقار سے کھڑی تھی۔ عمیر سب سے مل کر اس کی طرف بڑھا وہ سفید چہرہ لئے جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہی تھی اپنی پلکوں کو آزمائش میں ڈالے بے ساختہ امنڈ آنے والے آنسوؤں پہ زبردستی بند ھ باندھ رہی تھی۔ یوں ان کے یہاں بے جا شرم کی روایت نہ تھی سب کھلے دل سے ملتے تھے مگر مریم کو بزرگوں کا پاس تھا سو وہ ضبط کے چکر میں شل ہو رہی تھی۔ عمیر نے اپنا مضبوط سا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ مریم نے اپنا کانپتا سفید چھوٹا سا نرم و ملائم سا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا بڑے اعتماد کے ساتھ۔
عمیر نے ایک لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ گہری گہری ڈوبی ڈوبی سی آنکھوں میں اُسے وہ رنگ نظر آئے جو اس سے پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ عمیر نے مریم کے کپکپاتے ہاتھ کو نرمی سے دبایا۔ اور بولا۔
”دعاؤں میں یاد رکھنا۔“ مریم نے ہلکے سے سر ہلایا۔
عمیر نے دھیرے سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
• جب وہ سات سمندر پار کر کے اجنبی دیس اجنبی لوگوں میں اُترا تو ہلکی پھوار نے اس کا استقبال کیا۔ صاف و شفاف چمکیلی سی سڑکیں تھیں پہ بارش کے قطرے گرتے تو نظر آتے۔ مگر غائب ہوتے نظر نہ آتے... چپے چپے پہ سبزے اور رنگ برنگے پھولوں نے آگ سی لگا رکھی تھی۔ لندن ائیرپورٹ پر اُتر کر اس کا سفر ختم نہ ہوا تھا اس نے اوورکوٹ کے کالر بھی کھڑے کر لئے ہوائیں جسم کے پار اتر رہی تھیں۔ اس نے بیڈ فورڈ جانے والی بس پکڑی یہ شہر لندن سے پینتالیس میل دور جنوب میں تھا مگر وہ بھی اس کی منزل نہ تھا اس سے بھی آگے مزید پندرہ میل دور کرین فیلڈ کی وادی میں پہنچنا تھا۔ جہاں کرین فیلڈ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے اُسے ایم ایس سی کرنا تھا اس کا قیام مانچسٹر ہال میں تھا۔
جب اس نے یہاں قدم جمالئے تھوڑا سیٹ ہوا تو جائزہ لیا چار پاکستانی اور پانچ مختلف مسلم ممالک کے لڑکے یہاں موجود تھے باقی مختلف قومیتوں کے اسٹوڈنٹ تھے۔ اپنی باغ و بہار شخصیت کی وجہ سے وہ جلد ہی گھل مل گیا۔ وہ پڑھنے میں بے انتہا ذہین تھا ذمہ دار تھا اور یہاں سمسٹر سسٹم اُسے اور بھی الرٹ ہونا پڑا۔ اس کا ”سبجیکٹ“ ایروڈائنامکس، تھا ابتدائی دن تو پلک جھپکتے ہی گزر گئے شروع شروع تو میں نمازوں کا پابند رہا پھر پڑھائی کی زیادتی اور نماز کے اوقات میں کلاسز کا ہونا اُسے تساہل کی طرف لے گیا اس دوران گھر سے خط و کتابت بڑی باقاعدگی سے جاری تھی جس میں دادی ماں کا ایمان افروز خط ملا دادی ماں نے نمازوں کی ہر حالت میں تاکید کی تھی اور حرام و حلال کی تمیز پہ بھی ایک لیکچر دیا تھا اس نے اپنا محاسبہ کیا ظہر اور عصر کی نمازیں ضرور غائب ہو رہی تھیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان نمازوں کے اوقات لیکچرز کے دوران آتے تھے قضا تک ادا کرنے کا موقع نہ ملتا۔ رات گئے پڑھائی کی وجہ سے اکثر فجر کی نمازیں بھی بڑے آرام سے غائب ہو جاتی تھیں۔ خط پڑھ کر وہ شرمندہ ہو گیا... بہت دیر تک سوچتا رہا ایسا حل کہ ذمہ داری سے نماز پڑھی جا سکے۔ بالآخر اس نے ایک میٹنگ بلائی چاروں پاکستانی دوست اور پانچوں مسلم ممالک کے اور ان کے سامنے ایک تجویز پیش کی۔
”ہم لوگ اگر چاہیں تو باجماعت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنے سالوں سے یہاں مسلم لڑکے آتے ہیں مگر نہ تو کسی مسجد کا قیام ہے۔ نہ دوران لیکچر ہمیں ٹائم دیا جاتا ہے“
عمیر نے سب کے سامنے مسئلہ رکھا۔ سب مسلمان تھے اس لئے کسی کو بھی اعتراض نہ تھا البتہ اس کے مختلف پہلوؤں کو زیر غور لایا گیا۔
”کسی ایک کمرے کو منتخب کر لیتے ہیں اور نمازوں کے اوقات میں وہاں خود ہی جمع ہو جایا کریں گے۔“
برادر حمید نے مشورہ دیا جو بنگال سے آئے تھے دین پہ اچھی بھی دسترس رکھتے تھے۔ اور تبلیغی جماعت سے ان کا تعلق تھا۔ سب نے ان کی رائے کو پسند کیا اور انہیں امام بھی منتخب کر لیا۔ یوں باجماعت نمازوں نے ان میں آپس میں اخوت و محبت کو مزید فروغ دیا تھا۔
پڑھائی اپنے پورے عروج پہ تھی نمازیں بھی جاری تھیں مگر

ایک مسئلہ سے ان لوگوں کی طبیعت بڑی مکدر تھی اپنے گھر میں
وہ گوشت کے بغیر نوالہ بھی نہ توڑتا تھا۔ مگر یہاں آ کر تین مہینے
میں اُبلی ہوئی سبزیاں کھا کھا کر اس کے پیٹ کا حلوا نکل گیا
تھا۔ میس کا کھانا سب کے لئے یکساں تھا جس میں گوشت
بھی شامل تھا مگر پہلے دن ہی جب اُسے پتہ چلا کہ یہاں ذبح
کرنے کا کوئی سسٹم ہی نہیں جھٹکے کا گوشت ہوتا ہے تو اس
کی طبیعت بڑی مکدر ہوئی تھی اس نے اپنے مینو میں شروع
دن ہی یہ آئیٹم اڑا دیا تھا...... مگر ایسے کب تک کام چلتا۔
شروع شروع میں تو یہ لوگ اپنے طور پر ہیڈ فورڈ
سے ویک اینڈ میں گوشت لے آتے... اُسے پکاتے کھاتے
یوں وقت بھی کافی برباد ہوتا اور اچھی بھلی دردسری تھی جلد ہی عمیر
کو یہ چیز محسوس ہوئی اس مسئلہ کا کوئی نہ کوئی تو حل ہونا چاہیئے......
اس نے سوچا اتنے سالوں سے تقریباً دوسری جنگ عظیم کے
بعد، یہ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تھا اور اتنے سالوں سے یہاں مسلم
لڑکے بھی آ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں ایم ایس سی کے ساتھ انہیں
پی ایچ ڈی کی پیش کش بھی ہوتی ہیں اور یوں ان کا طویل عرصے
قیام بھی رہتا ہے مگر میس میں ان کے لئے کوئی انتظام نہیں
ہوتا گوشت کے سلسلے میں۔

اس نے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اور اسٹوڈنٹ یونین
کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا۔ تمام مسلم لڑکے اس کے ساتھ
تھے۔ ان لوگوں نے حیرت سے انہیں دیکھا آج تک کسی
نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا جو کٹر قسم کے مسلمان تھے وہ سرے سے
گوشت کھاتے ہی نہ تھے یا پھر ہیڈ فورڈ سے کسی نہ کسی طرح انتظام
کرتے وہی پکانے کی دردسری مول لیتے۔ اور جو زیادہ دھیان
نہ دیتے وہ مزے سے کھاتے تھے۔ چنانچہ ان کے مسئلہ کو کوئی
اہمیت نہ دی گئی اور ان لوگوں نے صفائی سے منع کر دیا۔

عمیر کے عزائم پر اس انکار سے کوئی فرق نہیں پڑا وہ
اپنی کوششوں میں سرگرداں رہا اس نے آہستہ آہستہ مختلف
قومیتوں کے اسٹوڈنٹ اور ان کے وفود سے ملاقاتیں کیں۔
اپنے نظریات اپنے مذہب کی روشنی میں اپنے مسئلہ سے آگاہ کیا
کھانا اور وہ بھی گوشت جیسا بنیادی آئیٹم... پے مینٹ کے
باوجود وہ بھرپور غذائیت سے محروم تھے..... وہ بولنے میں ماہر
تھا۔ اور حق پر تھا چنانچہ اس نے اپنے موقف پہ بہترین انگلش
کے ساتھ بڑے ٹھوس دلائل دیئے ان لوگوں نے ہمدردی
اور انصاف سے ان کے مسئلہ کو سمجھا اور عمیر کے
ساتھ ہو گئے......

نتیجتاً انسٹی ٹیوٹ کی گورننگ باڈی جس میں بہت سارے لارڈز
اور اسلامک سوسائٹی کے نمائندے موجود تھے کا اجلاس ہوا اور
یہ مسئلہ زیر غور لایا گیا... عمیر کو سب نے بہت مبارک باد دی۔
بلاشبہ اس کا کریڈٹ عمیر کو جاتا تھا۔

ان مسائل کو حل کرنے کے دوران اس کا کافی وقت برباد
ہوا تھا وہ سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہوا... اپنے ایک سبجیکٹ
کی مدد کے لئے اس کو فرانسیسی سیکھنی ضروری تھی۔ فرنچ کلاسز
شروع ہو چکی تھیں اس کا نام موجود تھا مگر وہ تقریباً پندرہ دن لیٹ
تھا... پہلے دن وہ کلاس میں پہنچا تو بھی دس منٹ لیٹ تھا۔ اس
نے میڈم سسیلا سے معذرت کی اور خاموشی سے اپنی نشست
پر بیٹھ گیا... تبھی دوران لیکچر میڈم نے کلاس کی ذہین لڑکی
لزبتھ کو کھڑا کیا کہ فرانسیسی میں جملہ بناؤ۔

"عمیر دیر سے آیا ہے۔"

لزبتھ نے شرارت سے عمیر کو دیکھا وہ اجنبی پاکستانی
خوبصورت سا لڑکا اس کو ایک دم پسند آ گیا تھا اس نے بڑی صفائی
سے کہا۔

"عمیر دیر سے ہی نہیں بلکہ بہت دیر سے آیا ہے۔"

اس کے اضافی جملے پر کلاس میں بے ساختہ قہقہہ پڑا تھا۔
عمیر نے استفہامیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا تب میڈم نے انگلش
میں ترجمہ کر دیا۔ وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

کلاس ختم ہونے پر وہ تیر کی طرح عمیر کے پاس پہنچی۔

"مجھے یقین ہے آپ نے بالکل محسوس نہیں کیا ہوگا۔ یہ
بالکل اتفاقیہ مذاق تھا۔"

اس نے بڑے خوبصورت سے اسٹائل میں معذرت کی۔

"اوہ! نو۔"

عمیر نے خندہ پیشانی سے کہا۔

"میں شوخی کو پسند کرتا ہوں۔"

"لزبتھ کہتے ہیں۔"

لزبتھ نے ہاتھ بڑھایا۔ اور ایسا بڑھایا کہ انہوں سے چھڑا
لیا وہ ایم ایس سی کے فائنل میں تھی اور شوقیہ فرنچ سیکھ رہی تھی ان کی
روزانہ ملاقاتیں فرنچ ہی کی کلاس میں ہوتی تھی وہ ہیڈ فورڈ میں
رہتی تھی اپنی آسانی کے لئے "مچل ہال" میں رہتی تھی.... اُسے یہ
پاکستانی نوجوان جو کہ دولت مند بھی تھا بے حد پسند آیا تھا وہ ہزاروں

رنگ میں رنگی ہوئی خوبصورت سی تتلی تھی جسے دل لوٹ لینے کے سارے انداز آتے تھے۔ اس ایک سال میں اس نے اپنی ساختہ وبے ساختہ اداؤں، خوبصورت سی نرم و ملائم دل لبھانے والی گفتگو اور اپنی شوخی وشرارت سے بڑے نامحسوس طریقے سے عمیر کو کھینچ لیا تھا.... سال کے آخر میں چھٹیاں ہوئیں تو اس نے عمیر کو لندن گھومنے کی دعوت دی۔ سفر کے دوران وہ اس کے بے انتہا قریب آگئی۔

"عمیر تمہیں کبھی کسی لڑکی نے نہیں بتایا کہ تم بے انتہا ڈیشنگ اور چارمنگ ہو۔"

لزبتھ نے اپنی زلفیں عمیر کے شانوں پر پھیلا کر کہا۔

عمیر بے ساختہ پیچھے ہٹا تھا۔

لزبتھ دل میں مسکرائی بے وقوف۔

"نہیں ڈیئر ایسا کون کہتا۔"

عمیر نے حیرت سے کہا۔

"واٹ اے نان سینس تمہارے یہاں کی لڑکیوں میں جمالیاتی حسن نہیں ہے۔"

لزبتھ نے نخوت سے کہا۔

"نہیں جمالیاتی حسن کیوں نہیں ہے مگر وہ اس طرح برملا نہیں کہہ سکتیں۔"

عمیر نے سادگی سے کہا۔

"ڈارلنگ یہ تو تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے مجھ سے پوچھو تم کتنے خوبصورت ہو۔"

لزبتھ کی خمار آلود آواز نے عمیر پر نشہ سا کر دیا۔

اس ایک ماہ کے طوفانی دورے میں لزبتھ نے اُسے بہت حد تک ٹھیک ٹھاک کر لیا۔ جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق اس نے لزبتھ کی ہمراہی میں دل کھول کے تفریح کی۔ وہ ہلکا پھلکا ڈانس بھی سیکھ گیا تھا، وہ صحیح اسٹیپ لیتا تو لزبتھ دل کھول کر تعریف کرتی۔ لزبتھ نے بڑے اسٹائل سے اسے ٹرانس میں لیا یوں کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی حقیقت سے آنکھیں چرا گیا۔

لزبتھ نے بڑی صفائی سے اس کی آنکھوں میں اپنے رنگ بھر دیئے تھے۔

تبھی وہ حقیقت کو فراموش کر کے خوابوں کی دنیا میں کھو گیا تھا... اُسے لزبتھ اتنی معصوم اور خوبصورت لگتی تھی کہ وہ اُسے اپنے لئے خدا کا انعام سمجھتا.....

"کون کہتا ہے معصومیت اور بھولپن صرف مشرق کا حصہ ہے۔ انہیں لزبتھ دکھا دو۔"

وہ دل ہی دل میں اُسے سراہتا۔

لندن کی رومان پرور فضائیں لزبتھ کا حسین قرب..... عمیر کے لئے لزبتھ کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن تھا۔

جب وہ روشنیوں کے اس شہر میں دریائے ٹیمز کے کنارے ستانے بیٹھتے تو وہ اس سے بے انتہا قریب ہو کر تیز و مبہم سی سانسوں میں قرار لیتی۔

"تم مجھ سے وعدہ کرو پاکستان جا کر بھول تو نہ جاؤ گے۔"

"نہیں لزبتھ ڈارلنگ تمہارے بغیر تو اب زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں۔"

وہ اس کے ہاتھ پیار سے تھپتھپاتا۔

"سچ!"

وہ خوشی سے پاگل ہو جاتی۔

"مگر تمہیں اس کے لئے میرا مذہب قبول کرنا ہوگا۔"

وہ بھی گرم لوہے پر چوٹ مارتا۔

"یقیناً یقیناً مجھے تمہارے یہاں کے ڈریس بہت اچھے لگتے ہیں۔"

لزبتھ مذہب کو اتنی زیادہ اہمیت نہ دیتی مگر عمیر.... شادی کے نشے میں کبھی اس بات پر غور نہ کرتا۔

یہ ایک مہینہ چھم چھم کرتے گزر گیا اور انہیں تب بھی نہ چلا وہ واپس گرین فیلڈ جانے کے بجائے بیڈفورڈ آ گئے..... لزبتھ کے گھر اس نے عمیر کا غائبانہ تعارف اپنے والدین سے کروا دیا تھا۔ اور لندن جانے کی اطلاع بذریعہ ڈاک دے دی تھی۔

وہ تحفے تحائف میں لندی پھندی گھر پہنچی تو اس کے والدین عمیر سے مل کر بہت خوش ہوتے۔

"ڈیڈی عمیر نے لندن کا سارا خرچ برداشت کیا ہے جبکہ دعوت میں نے دی تھی۔"

لزبتھ نے بظاہر شکوہ کیا مگر کس ادا سے کہ غرور چھلکا چھلکا جاتا تھا۔

ایک ہفتہ وہ لوگ وہاں رہے لزبتھ نے بڑے فخر سے ممی اور ڈیڈی کو بتایا کہ عمیر بہت دولت مند ہے اور فراخ دل بھی۔

رسیلی لو آرائے لکی گرل۔ ڈیڈی اور مم دونوں ہم خیال تھے۔

عمیر نے خوش ہو کر نمونے کے طور پر تین چار مرتبہ ان کو مختلف

ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر سے نوازتا۔
ایک رات ممی موڈ میں تھیں لزبتھ استری کر رہی تھی۔ تبھی ممی ایک دم بولیں،
"بے بی تمہارا جواس اعلیٰ ترین ہے جانے نہ دینا؛"
"اوہ نیس مم اب بے بی بھی اونچا شے ہے وہ پاکستان جاکر تین سال بعد واپس آئے گا۔ اور ہم سے میرج کریگا۔"
لزبتھ نے قہقہہ لگایا۔
"اوہ پور گرل! تم تین سال تک کیا کروگی۔"
ممی نے ہمدردی اور تشویش سے پوچھا۔
"البرٹ سے شادی"
لزبتھ نے اترا کر کہا۔
"اوہ نیس ہم تو بھول ہی گیا تھا۔"
ممی کے سر سے بوجھ اترا۔
یونیورسٹی کھل چکی تھی وہ پھر پڑھائی میں لگ گئے......
پڑھائی کے سلسلے میں وہ بہت سنجیدہ تھا۔ اس لئے پڑھتے وقت کسی ذہنی تفریح کی گنجائش نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ لزبتھ کے تصور نے اُسے بہت زیادہ ڈسٹرب نہیں کیا تھا یونیورسٹی میں ان کی ملاقاتیں روزانہ ہی ہوتی تھیں اور پھر ویک اینڈ ایک ساتھ گزارتے۔
پڑھائی کی مصروفیات میں اضافہ امتحان کی آمد نے کیا تو ان کی تسلسل سے ملاقاتیں جاری نہ رہ سکیں مگر جب بھی ملتے گلاب سے کھل جاتے.... عمیر کی ساری تھکن دور ہوجاتی۔
لزبتھ کی خوبصورت سی مسکراہٹ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اُسے حوصلہ بخشتی۔ وہ ان میں سے نہ تھا کہ ایک مسکراہٹ پہ جان قربان کر دیتا۔ یہ مقام بہت آہستہ آہستہ اس نے لزبتھ کو دیا تھا۔
وہ یوں تو پوری طرح لزبتھ کی محبت میں ڈوب چکا تھا مگر!...
ابھی بھی دو معاملات میں وہ بہت مضبوط تھا۔ ایک تو......
اس نے شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا!
دوسرے
لزبتھ سے وہ ابھی تک ایک حد میں رہ کر ملتا تھا۔!!
بڑے بڑے نازک موقعوں پر وہ بہکنے سے بچا تھا۔
روشنی کا ایک جھماکہ سا ہوتا تھا اور وہ اپنے قدم پیچھے ہٹا لیتا.....
اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ
اس کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون دوڑ رہا تھا!
اس کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس نے اس کی بہت سی باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا مگر اس کی موٹی موٹی چند باتوں پر ضرور کاربند تھا!!
ابھی حرام اور حلال کی تمیز اس کی آنکھوں سے نہ چھینی گئی تھی۔!!!
اور پھر اس کے بزرگوں اس کے گھر والوں کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔!!!
امتحان نزدیک آگئے تو نمازوں میں تسلسل آگیا اور دعاؤں میں خشوع و خضوع مگر دعاؤں کے وقت وہ چونک جاتا۔
خدا سے کامیابی اور ترقی کی دعائیں مانگتا ہوں مگر.......
اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہوں۔
"لیکن میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔"
اس کا نفس نرم و ملائم آواز میں تھپکی دیتا۔
لزبتھ سے سچی محبت کرتا ہوں اس کو پہلے مسلمان کروں گا اور پھر شادی... یہ تو اور بھی ثواب کا کام ہوگا"......
زر، زن، زمین کسی ایک کا بھی نشہ ہو تو ایمانی قوتوں کو شیطان کیسا سلب کر لیتا ہے.... نفس ایسے خوبصورت خوبصورت جواز ڈھونڈ لاتا ہے کہ ضمیر چپ چاپ منہ لپیٹے ایک طرف پڑا رہ جاتا ہے۔
عمیر بھی وقت کے دھارے میں بہہ رہا تھا۔ لزبتھ کے وجود سے گرگی ٹھنڈی ٹھنڈی نرم و ملائم برف کی پھواروں میں ڈوبتا جا رہا تھا
لزبتھ کا بس چلتا تو دن رات کی گردش کو روک دیتی اور وقت کو تھام لیتی عمیر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کے لئے.... مگر رزلٹ کے بعد عمیر کو ہر صورت میں واپس جانا تھا.. جاتے سمے وہ روئی بھی تھی۔
اس سے قسمیں بھی لی تھیں۔
اپنی وفا اور تقدس کا یقین دلایا تھا۔
عمیر بہت مجبور تھا اُسے واپس تو بہرحال جانا تھا۔
"میں اپنی بہنوں کی شادیاں کرلوں گا... کچھ قدم جمالوں گا گھر کے ماحول کو بھی سازگار بنالوں گا جب تک تم اپنی تعلیم مکمل کرلینا دو تین سال بعد دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔"
پھر وہ پاکستان آیا تو اپنوں کی محبت۔ شفقت ملی تو لزبتھ کے درد بھرے تڑپا دینے والے خطوط کے جواب اس نے دوہری تڑپ سے دیئے.... وہ لزبتھ کو دل میں بسائے اس کے تصورات میں گم حویلی کی روایات سے بغاوت کرنے کے

آنا پیدا کر رہا تھا.... اسی وجہ سے اس نے مریم کو بالکل بھی لفٹ نہ کرائی.... عام گفتگو سے بھی پرہیز کرتا تا کہ وہ اس سے بد دل ہو جائے اور جب عمیر کے خیالات اور فیصلے منظرِ عام پہ آئے تو حویلی میں طوفان آیا تھا.... اس زمانے میں ہر سمجھانے والا اُسے فطری طور سے دشمن معلوم ہوتا.... لزبتھ کے نشے میں سرشار اس نے ان تمام لوگوں سے ٹکر لی تھی جو اس کا اپنا خون تھے اس کے پیارے تھے مگر.....

اس وقت وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا تھا۔

لائف اُسے گزارنی ہے پسند ناپسند کا حق اُسے حاصل ہے

وعدوں کا پاس بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔"

زبردستی کے فیصلے ٹھونسے جائیں تو انجام اچھا نہیں ہوتا زندگی روگ بن جاتی ہے..... اور پھر لزبتھ میرا حق ہے اور میں اُسے لے کر رہوں گا۔

نیک و بد کی تمیز اس کی آنکھوں سے اُٹھ گئی تھی اچھا بھلا گستاخ اور بے ادب بن گیا تھا مگر آج.....

آج جب وہ لزبتھ کو سرپرائز دینے اچانک یہاں پہنچا تو اس پر جو انکشاف ہوا اس نے ذہنی طور سے اُسے بالکل ماؤف کر دیا۔

لزبتھ نے آخری خط ایک مہینے پہلے ڈالا تھا وہ اُسے خوشی سے پاگل کر دینے کے چکر میں سیدھا اس کے گھر پہنچا تھا مگر جب کال بیل کی آواز پر ایک اجنبی چہرے نے دروازہ کھولا تو وہ حیران رہ گیا.. عمیر نے اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے عمیر کہتے ہیں۔"

"رابرٹ۔"

اجنبی نے عمیر سے ہاتھ ملایا۔

"معاف کیجئے گا. یہاں مس لزبتھ رہتی ہیں نا۔"

عمیر سے پوچھا نہ گیا. لزبتھ کی شکل نہ پا کر اس کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔

"جی ہاں رہتی تھیں مگر ان کی شادی ہو گئی ہے اور اُن کے والدین ایک مہینے کے ٹور پہ پیرس گئے ہیں۔"

"شادی۔"

عمیر کو اپنے کانوں پر دھوکا ہوا لیکن اس نے اجنبی سے تکرار مناسب نہ سمجھی۔

"پلیز! آپ لزبتھ کا ایڈریس دے سکتے ہیں۔"

اس نے یقین و بے یقینی کی کیفیت میں پوچھا۔

"اوہ یس۔"

اس نے اندر سے کارڈ لا کر دیا۔

"ایک بات مسٹر عمیر پلیز! لزبتھ کو اطلاع دے دیجئے گا کہ اس کے والدین پیرس گئے ہوئے ہیں میں اُسے اطلاع نہ دے سکا تھا۔"

"تھینک یو!"

عمیر کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اس کا دل بے ایمان ہو رہا تھا یہ یقیناً جھوٹ ہے. غلط فہمی ہے امید و بیم کی کش مکش میں جب وہ لزبتھ کے گھر پہنچا تو ایک شاندار سا آدمی گول مٹول خوبصورت سے ایک سالہ بچے کو لے کر نکل رہا تھا۔

عمیر کو اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"مجھے عمیر کہتے ہیں لزبتھ کے ساتھ پڑھا تھا۔"

عمیر نے ہاتھ بڑھایا۔

"بڑی خوشی ہوئی آیئے! میں لزبتھ کا شوہر البرٹ ہوں. یہ ہمارا بچہ ہے لوٹی۔"

البرٹ نے ہاتھ ملایا۔

عمیر کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے اس نے آواز لگائی

"ڈارلنگ دیکھو کون آیا ہے۔"

لزبتھ نے عمیر کو دیکھا تو اُسے بالکل یقین نہ آیا. ایکدم اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"مسٹر عمیر آپ مائنڈ نہ کیجئے گا میں ابھی بازار سے آیا۔"

البرٹ بچے کو لے کر نکل گیا۔

"یہ سب کیا ہے۔"

عمیر نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

لزبتھ کی گھبراہٹ اس کی ساری بے وفائیوں کی داستان سنا رہی تھی. عمیر کا خون کھول گیا۔

لزبتھ نے اپنے آپ کو تھوڑا سا سنبھالا۔

"عمیر۔"

لزبتھ نے بڑی درد بھری آواز میں اُسے پکار کر اُس سے لپٹ کر رونا چاہا۔

عمیر نے اس کو دھکا دے کر ایک طرف کیا۔

"یقین جاننا عمیر میں نے بہت مجبور ہو کر البرٹ سے شادی کی ہے وہ بری طرح میرے پیچھے پڑ گیا تھا. ممی نے اس سے قرضہ لیا تھا جو اس صورت میں ادا ہوا.... میں خود البرٹ سے عاجز و پریشان ہوں.... مجھے اس سے نجات دلا دو..... میں نے

تمہیں اس لئے تو بلایا تھا کہ ہم دونوں حسب وعدہ شادی کریں گے۔"

باوجود کوشش کے وہ تھوڑے سے آنسو نکال پائی تھی۔ اور دل ہی دل میں حیران تھی کہ اُسے اس گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا۔ وہ تو خط و کتابت بھی اپنے والدین کے گھر سے کرتی تھی اور اپنے والدین سے اس حماقت کی ہرگز توقع نہ تھی۔ وہ البرٹ سے کچھ عرصے بعد علیحدگی اختیار کرنے والی تھی، تاکہ عمیر آئے تو اس کے رنگین خواب مزید پورے ہوں۔ بینک بیلنس میں اضافہ ہو۔ مگر یہ بے وقت بغیر اطلاع کے عمیر نے ڈرامے کا سارا بھرم کھول دیا تھا... وہ درمیان ہی میں تھی کہ ڈراپ سین ہوگیا۔

عمیر کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے رگیں تنی ہوئی تھیں اور وہ اُسے یک ٹک گھور رہا تھا... جھوٹ اس کے چہرے سے نمایاں تھا... ورنہ البرٹ دیکھنے میں ہی اُسے بالکل معقول انسان لگا تھا... زبتھ نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔

"ڈیئر تمہیں اس مکان کا ایڈریس کس نے دیا؟"

"تمہارے والدین پیرس گئے ہیں ایک مہینے کے لئے اور رابرٹ نامی شخص سے تمہیں اطلاع دینے کے لئے کہہ گئے ہیں۔ تم لندن میں تھیں۔ اس لئے البرٹ بھی تمہیں اطلاع نہ دے سکا۔"

"اوہ ایڈیٹ۔"

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر اس نے جلدی سے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا... رابرٹ کو بے وقوف کہنے کا مطلب صاف واضح تھا کہ عمیر کو اطلاع دے کر اس نے سخت حماقت کا ثبوت دیا ہے... وہ بے گناہی ثابت کرنا چاہ رہی تھی اور گناہ ثابت ہو رہے تھے...

عمیر کی قوت برداشت آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ میری کوئی نیکی کام آگئی تھی زبتھ... جو تم جیسی ذلیل لڑکی سے خدا نے مجھے بچا لیا... اُسے زبتھ سے گھن آرہی تھی جس کے لئے سارا زمانہ چھوڑا۔ اپنوں کی مخالفت کی... گستاخ و بے ادب بنا۔ بے دریغ پیسہ بہایا... وہ

مزے سے شادی رچائے بیٹھی ہے!

حتیٰ کہ ایک عدد بچے کی ماں بھی ہے!!

کس قدر مکاری اور صفائی سے فریب دے رہی ہے جیسے میں یقین کر لوں گا۔

کس قدر ڈرامائی انداز سے تین سال تک عُنچہ دیتی رہی...

اور ابھی بھی مجھ سے شادی پر کمربستہ ہے... اس کا دل چاہا کھڑے کھڑے اپنے ہاتھوں سے اس کا گلہ گھونٹ دے۔

اتنی ٹھوکریں مارے اتنی ٹھوکریں مارے کہ وہ بدحال ہو جائے... مگر پھر اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا وہ اپنے ہاتھوں اور ٹھوکروں کو اس کے ناپاک جسم سے ہرگز پلید نہ کریگا۔ یہ اس قابل بھی نہیں اس نے غصے سے تھوک دیا اور پھر اتنی تیزی سے اس کے گھر سے نکلا جیسے اگر ایک سیکنڈ بھی اور کھڑا رہا تو ہزاروں بدروحیں اس کے جسم سے چمٹ جائیں گی۔ اس نے ہوٹل تک پہنچنے کے لئے ٹیکسی کے چکر میں بس کو بس نہیں کیا اور راستہ پیدل چلتا ہوا ہوٹل تک پہنچا تھا۔ اور اب بستر پر پڑا بے بسی، غم و غصے اور پریشانی و پشیمانی کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

"کس منہ سے گھر جاؤں؟"

یہ سوالیہ نشان گھر کے سارے ماحول پہ محیط تھا حویلی کے ایک ایک فرد کی صورت اس کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ وہ بے ساختہ رو دیا۔ دیر تک روتا رہا... رونے سے اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو اس نے بڑی بہادری سے فیصلہ کیا... میں اسی چھاؤں میں واپس جاؤں گا ورنہ یہاں کی دھوپ مجھے جھلسا دیگی۔

سب سے معافی مانگ لوں گا۔

مریم کے قدموں میں جھک جاؤں گا۔

اپنے گناہ بخشوا لوں گا۔

اُسے پرسوں واپس جانا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے بھی یہاں رکنے کا روادار نہ تھا۔ مگر اُسے یونیورسٹی سے کچھ کام تھا سو اُسے یہ دو دن سولی پر گزارنے تھے۔

اور رات ۱۲ بجے جب وہ حویلی پہنچا تو چوکیدار سکندر خان کو اس نے منع کر دیا کہ کسی کو جگا نا مت سب ڈسٹرب ہوں گے۔ صبح ہی صبح سب سے ملاقات ہوگی... لیکن جب وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو مریم کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس سے ملنے کی خواہش نہ روک سکا۔ وہ خوش بھی تھا کہ اس سے بہتر موقع اور کون سا ہو سکتا ہے وہ مریم کو ایمانداری سے ساری داستان سنا دیگا۔

اس سے معافی مانگ لے گا۔

دل میں اُٹھتے طوفانوں کو دباتے ہوئے اس نے جھانک

کر دیکھا... اس کی منزل مقصود تو یہی تھی.... پر وہ بھٹک گیا تھا بہک گیا تھا... منزل تو اس کے سامنے تھی۔ اس کے پاس تھی مگر تیز رفتاری کے طوفان میں اپنی جھونک میں آگے نکل گیا تھا۔ اور منہ کے بل گرا تھا.... لزبتھ کی ہمراہی میں گمراہیوں کے در پہ دستک دے بیٹھا تھا مگر لزبتھ کے بظاہر خوبصورت لیکن بباطن بدہیت قید خانے میں ساری عمر کے لئے قید نہ ہوا تھا... بے دست و پا ہونے سے بچ گیا تھا... لٹتے لٹتے بچا تھا... یقیناً مریم کا پیار سچا، پوترا اور امر تھا اس نے مریم کو غور سے دیکھا۔ پھر آہستہ سے دروازے کے اندر آگیا۔

مریم آتش دان کے پاس آرام کرسی پہ نیم دراز تھی.... آنکھیں بند تھیں مگر پپوٹے متحرک تھے ڈارک گرین بوٹل کلر میں سفید کامدانی سے مزین میکسی ہلکے ہلکے سے میک اپ اور کھلے بالوں کے درمیان آتش دان کے قربت سے دمکتا ہوا اس کا ملیح چہرہ ہلکے یلو کلر کی دیواروں اور اس سے میچ کھاتے پردوں اور قالین کے درمیان اس کا وجود عمیر کو بے انتہا حسین اور معصوم لگا.....

وہ یک ٹک اُسے دیکھنے لگا۔ مریم کی کشادہ جبیں پہ پسینے کے نامحسوس سے قطرے اُسے ایسے روشن ستارے لگے جو اُسے کبھی لزبتھ کی پیشانی پر بھی نظر نہ آئے تھے......

وہ غالباً کہیں سے آئی تھی اور کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی انجانی سوچوں میں گم تھی کتنا دھیما پن اور سکون تھا اس کے کپڑوں میں۔ اس نے قدم آگے بڑھانے چاہے مگر پھر رک گیا۔ قدموں کی چاپ سے کمرے کے تقدس میں ارتعاش سا پیدا ہوتا اور ایک طویل عرصے بعد عمیر کا اس سکوت میں ڈوبے رہنے کو دل چاہ رہا تھا پھر جھجک بھی مانع تھی کیا منہ لے کر اس کے پاس جائے؟

”کہ لو وہ بے ایمان دیوتا آگیا جس کی تم پوجا کرتی تھیں؟!

وہ ڈاکو آگیا جس نے تمہارے ارمانوں پر ڈاکہ ڈالا اور سارے جذبات ایک فرنگن کے قدموں پہ نچھاور کر دیئے۔!!

وہ آگیا جو لوحِ محفوظ پہ صرف تمہاری تقدیر تھا مگر اپنے ہاتھوں سے ساری خدائی مٹاتا کاتب تقدیر بنا لزبتھ کے نام اپنی زندگی کرتے چلا تھا۔!!!

وہ آگیا جو تم سب کی نظر میں مشرق کا شہزادہ تھا مگر مغرب کی بے وفائیوں کو اپنی سلطنت اپنا تخت و تاج سونپنے چلا گیا تھا۔!!!!

مگر پھر اس نے سوچا۔

مجھے جتنے چاہو نام دے لینا مریم،

مجھے کتنا ہی برا بھلا کہہ لینا۔

مگر اعلیٰ ظرفی سے کام لے کر فراخدلی سے مجھے معاف کر دینا۔ مجھے قبول کر لینا۔ کیونکہ تجربات کی بھٹی میں سونا بن کر نکلا ہوں۔ اور اپنی تمام تر سچائیوں اور پاکیزگی سمیت تمہارے آستانے پہ کھڑا ہوں..... یہ بھی سوچ لینا کہ ایک انچ نہ ہلونگا۔ اور نہ ایک قدم آگے بڑھاؤں گا۔ جب تک میرے جذبوں کی سچائی اور تپش اور میرا وجود تمہاری آنکھوں میں عکس بن کر نہ ابھر آئے گا۔ اور میری قربت تمہیں خود ہی آنکھیں اٹھانے پر مجبور نہ کر دے گی.... اتنی دیر سے کھڑا ہوں،

اور تمہیں احساس بھی نہیں...... وہ جو صرف اپنی سانسوں کے ذریعے دل سے مخاطب تھا ایک دم چونک گیا۔

مریم کے وجود نے انگڑائی لی تھی۔ ایک تناؤ کے بعد جب اس نے جسم کو ڈھیلا کر کے آنکھیں کھولیں تو سامنے عمیر کو دیکھ کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا.... اس نے گھبرا کر آنکھیں ملیں یہ خواب تو نہ تھا.... وہ پانچ دن پہلے ہی تو لندن گیا تھا... مگر زندہ حقیقت کی طرح موجود تھا وہ ایک دم ساکت بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی.... اس کا ارادہ تو دو تین ماہ بعد آنے کا تھا مگر...

اس کے دل میں ایک لمحے کے نوٹس پہ سوال و جواب کی ایک ضخیم کتاب مرتب ہوگئی۔

یہ اکیلا کیوں ہے؟!

لزبتھ کہاں ہے۔!!

اتنی جلدی واپس کیوں آگیا۔؟!!!

لزبتھ شائد اپنے کمرے میں ہوگی!

کچھ لوگوں نے طوعاً و کرہاً ہی سہی دل سے اس کا استقبال کیا ہوگا۔!!

لزبتھ کتنی خوش ہوگی!!! پھر کیا یہ میری بے بسی کا مذاق اڑانے آیا ہے۔؟ یہ جتانے کے لئے آیا ہے کہ تمہارا وجود میرے لئے ناقابل قبول تھا اور لزبتھ میری زندگی کی صحیح اور عمدہ ساتھی ہے میری شریک حیات ہے میرے دل و جان کی مالک ہے...

اس کا دل اتنی بری طرح بھر کے آیا کہ باوجود ضبط کے آنکھوں کے کونے نم ہوگئے۔

اس کے دماغ کے بے شمار سوالات پھر خود ہی جوابات تردید، تائید تھی اور یہاں اس کے دل کی نازک سی کشتی پر آتنی تیزی سے بے شمار طوفان گزرے پوری ہستی تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنے ڈوبتے دل و دماغ کو قابو میں رکھنے کے

لئے عارضی سہارا ڈھونڈنا چاہا وہ کرسی کا ہتھا پکڑنے کے لئے
آگے جھکی تو نیم بے ہوشی میں ایک طرف گرنے لگی۔ تبھی عمیر تیر
کی طرح اس کے پاس پہنچا۔

"مریم.... مریم"

عمیر نے اُسے سہارا دیا۔ اتنی بے ہوشی پر بھی مریم کی غیرت
و خودداری نے عمیر کے ہاتھوں کو جھٹکا دیکر پرے کر دیا۔

"تم شجرِ ممنوعہ ہو میرے قریب مت آؤ۔"

اور وہ جو لزبتھ کی ہمراہی میں محبت کے تمام داؤ پیچ سے
واقف ہو چکا تھا اور کیا کیا عزائم لے کر آیا تھا ایک دم نروس
ہو گیا۔

مریم کے ہاتھوں میں چٹانوں کی سی سختی اور لہجے میں تلوار کی سی
کاٹ تھی۔ عمیر نے ہمت کر کے اُسے سنبھالنے کے لئے پھر مریم
کو شانوں سے پکڑنا چاہا۔

"خدا کے واسطے مریم میری بات سنو اپنے آپ کو سنبھالو۔"

وہ جملہ بھی پورا نہ کر پایا تھا کہ مریم کا الٹا ہاتھ عمیر کے منہ پر
پڑا۔

"خبردار جو تم نے مجھے ہاتھ لگایا۔"

اس کے لہجے میں شیرنی کی سی گرج تھی۔

عمیر ھکا بکا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

اس نے تو خلوص دل سے اُسے سنبھالنا چاہا تھا....

ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا ہو گیا۔ اس نے لاشعوری
طور پر ہاتھ پیچھے کر لئے۔

واقعی یہ ہاتھ اس قابل نہ تھے جو مریم کو چھو سکتے.......

"عمیر صاحب آپ کو میرے کمرے میں آنے کی جرأت
کیسے ہوئی۔؟

کس حق سے۔؟

کس رشتے سے۔؟

بغیر دستک دیئے۔"

وہ اگرچہ نڈھال ہو رہی تھی آرام کرسی نے اس کے بکھرے
وجود کو تھاما ہوا تھا.... اگر وہ کھڑی ہوتی تو یقیناً گر پڑتی۔

"مریم پلیز معاف کر دو۔ میری بات تو سنو ذرا ٹھنڈے
دل سے اتنی اجنبی نہ بنو... رشتوں کی بات کرتی ہو۔ اگر بھول گئی ہو
تو بتا دوں تمہارا کزن عمیر ہوں جو بھٹک گیا تھا مگر... عمیر کا جملہ
اس نے بیچ ہی میں کاٹ دیا۔

"اچھا کب سے۔؟"

وہ بے ساختہ استہزائیہ ہنسی ہنستی چلی گئی۔

عمیر کچھ نہ بول سکا بے بسی سے اس کو دیکھتا رہ گیا۔

اس کی زندگی میں زہر گھولنے والا۔

اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کو قربان کرنیوالا۔

اس کے خوابوں کا شہزادہ۔

اس کی امیدوں کا مرکز۔

آج اس کے سامنے کھڑا تھا جو پانچ دن پہلے لزبتھ کو بیاہنے
چلا تھا اور آج غالباً اس کو بیاہ لایا تھا...... اس زندہ لیکن
ڈوب جانے والی حقیقت کے ساتھ کہ وہ اس حویلی کی
ایک معصوم اور پاکباز لڑکی کو ٹھکرا چکا ہے... بزرگوں کے فیصلے
سے منکر ہو گیا ہے اس کو ذہنی اذیتیں اور کچوکے دینے والا شخص
کیونکر اس کے کمرے میں آیا۔؟

کیا کہنے کے لئے۔؟

کیا دینے کے لئے۔

رات کے بارہ بجے۔

وہ ایک دم ہی جھٹکے سے اکھڑ گئی۔

"آپ کو شرم تو نہیں آتی عمیر صاحب لزبتھ کو اپنی خوابگاہ
میں چھوڑ آئے ہیں۔ اور رات کے بارہ بجے بغیر دستک دیئے
آپ میرے کمرے میں آئے ہیں۔

کون سی ضرورت آپ کو یہاں کھینچ کر لائی ہے۔؟"

اس نے اپنی دانست میں عمیر کو تقریباً گالی ہی دی۔

عمیر کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا.......

"مریم بنت حسن آپ کی ناراضگی بجا... آپ کا غصہ سر آنکھوں
پر لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر آپ نے اس قسم کی باتیں
کرنی کہاں سے سیکھیں۔؟

کیسی لزبتھ۔؟ کہاں ہے لزبتھ میں اکیلا واپس آیا ہوں
اور سیدھا فلائٹ سے اپنے کمرے میں جا رہا تھا جو تمہارے
کمرے کی لائٹ دیکھ کر ادھر چلا آیا ابھی تک گھر والوں کو بھی خبر نہیں۔"

وہ ایک سانس میں بولتا چلا گیا۔

مریم نے بے اعتمادی سے آنکھیں کھولیں غور سے عمیر کو
دیکھا وہ ایک دم کمزور الجھا الجھا پشیمان سا نظر آ رہا تھا۔

"عمیر صاحب وقت اور حالات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے
ہیں۔ لوگ تو خاندانی عظمتوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ آپ میرا گندہ
لہجہ اور حقیقت پر مبنی الزام برداشت نہ کر سکے تو ایک لمحے بھی زحمت
نہ کریں یقیناً میں نے آپ کو دعوت نہیں دی.... لزبتھ آپ کے

ساتھ ہے یا نہیں آپ اکیلے ہیں یا دکیلے مجھے قطعی کوئی غرض نہیں ... ہیں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ جیسے ناقابلِ اعتبار شخص کا وجود ایک منٹ بھی اس کمرے میں برداشت کرنے کی روادار نہیں اور یہ چاہتی ہوں کہ بلکہ درخواست کرتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو آپ فوراً سے بیشتر تشریف لے جائیں۔"

مریم نے دوبارہ آرام کرسی سے پشت لگا کر آنکھیں بند کرلیں ان طوفانوں پر بند ھ باندھنے کے لئے جو بری طرح بپھر رہے تھے اور وہ یہ کسی قیمت پر نہیں چاہتی کہ عمیر کے سامنے کسی کمزوری کا مظاہرہ کرے۔

عمیر نے چند لمحے خاموشی سے اس پیکر کو دیکھا جس نے آنکھیں کھول کر صرف اس کا نام سنا تھا مگر اس کے غلط فیصلوں اور اس کے ارمانوں کا بت پاش پاش کرنے کی وجہ سے وہ اس کی شکل بھی دیکھنے کی روادار نہ تھی... ٹھیک تو تھا اس نے مریم کے کئی سالوں کے بنے ہوئے خوبصورت سے کعبہ کو ڈھایا تھا کس کی بے اعتباریوں کو اعتبار کیسے آسکتا تھا۔

"ٹھیک ہے مریم اس وقت تو تم میرا وجود برداشت نہیں کر پا رہیں تم حق بجانب بھی ہو... مگر اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔ اور تمہیں فتح کرکے چھوڑوں گا اس نے بڑے عزم سے سوچا۔"

"تم نے میری کوئی بات نہیں سنی مریم... مجھے کسی قابل نہ سمجھا بدقسمتی ہے میری پھر بھی تمنا ہے کہ تم مجھے معاف کردو۔"

وہ افسردہ سے لہجے میں بولا پھر چپکے سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

عمیر کے شکستہ قدموں کی چاپ پر اس نے آنکھیں نیم وا کیں وہ جو اچانک بغیر کسی اطلاع کے لندن سے طوفانی انداز میں واپس آگیا تھا بغیر شادی کئے بغیر زیب کو ساتھ لئے مریم کو بری طرح بے چین کر گیا تھا۔ اس شخص نے ساری عمر مجھے ڈسٹرب کیا ہے اور اس وقت بھی حواسوں پر چھا کر چلا گیا ہے... وہ کس چیز کی معافی مانگنا چاہتا ہے۔؟

مریم کو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس پر وہاں کیا گزری، اس نے شادی کیوں نہ کی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ اُسے یوں اچانک دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ کامیاب و کامران اس کی دنیا اجاڑ کر لوٹا ہے اور اس کے کمرے میں آیا ہے وہ اپنے حواسوں میں نہ رہی تھی۔ حالانکہ اس طویل عرصے میں اس نے آج تک عمیر سے کچھ نہیں کہا تھا نہ کچھ سنا تھا لیکن۔ اس وقت دو چار سخت جملے پڑے

روا روی میں اس کے منہ سے نکلے تھے... ورنہ وہ تو....

ان بے ضرر لڑکیوں میں سے تھی جن کی ذات کسی کے لئے باعث آزار نہیں ہوتی اس قدر پرکشش خوبصورت قد و قامت کی لڑکی تھی کہ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔ یوں سوشل بھی تھی ایکٹیو بھی حاضر جواب بھی بذلہ سنج بھی... مگر ہر چیز کو اعتدال کے دائرے میں رکھتی تھی... خاندان بھر میں اس ادب و احترام کی مثالیں دی جاتی تھیں.... وہ بڑی پر اعتماد لڑکی تھی مگر چند سالوں سے ذہنی سکون سے کوسوں دور تھی... بچپن میں بزرگوں کے کئے گئے فیصلوں سے مات کھا گئی تھی... عمیر سے اس کا نکاح نہیں ہوا تھا، منگنی نہیں ہوئی تھی مگر بچپن سے ان کے کانوں میں یہ بات پڑ گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے منسوب ہیں اور یہ نسبت وقت گزرنے کے ساتھ نرم و ملائم ریشم کے لچھوں کی طرح پروان چڑھی تھی... مگر اس ریشم کے لچھوں کو عمیر نے بڑی بے دردی سے الجھا دیا تھا...

کتنی بہاریں گزر رہی تھیں کتنے سہانے موسم بیتے تھے۔

"اس کے من مندر میں ایک ہی دیوتا نصب تھا... وہ کو ایجوکیشن میں بھی پڑھی تھی... کلب کی باقاعدہ ممبر بھی تھی... اور یوں کتنے لڑکوں سے اس کی جان پہچان بھی تھی مگر عمیر کی جگہ کوئی نہ لے سکا تھا... یوں اس کے چاہنے والے کم نہ تھے... دو سال کے عرصے میں جب عمیر لندن میں تھا تو وہ تکمیل تعلیم کے آخری مراحل میں تھی اور اس کے کتنے ہی رشتے آئے تھے مگر عمیر سے اس کی نسبت کا سن کر حسرت دل میں لئے لوٹ گئے تھے... اُسے کلب کا ذلیشان حورانی یاد آیا جس کی دو دو ملیں چل رہی تھیں۔ چاروں طرف کاروبار پھیلا ہوا تھا جو دولت میں نہایا ہوا تھا۔ اور...

خود اس قدر و ینگ قسم کی ڈیشنگ پرسنیلٹی کا مالک تھا کہ اچھی اچھی لڑکیاں آہیں بھر کے رہ جاتیں... جب وہ کلب کا نیا نیا ممبر بنا تو چاروں طرف سرگوشیاں سی پھیل گئیں ایک سے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکیاں آتی تھیں اپنی تمام تر شر سامانیوں کے ساتھ اور اب ان میں سے کتنوں کی جان سولی پر ٹنگی رہتی تھی... عجیب بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو کر رہ گئی تھیں۔

ڈریسنگ میں مقابلہ!

میک اپ میں مقابلہ!!

خود ساختہ اداؤں کے فری اسٹائل۔!!!

وہ ایک ہفتہ سے اپنی کزن کے ساتھ ان سب کا تماشا

دیکھ رہی تھی۔

" لڑکیوں کو کبھی اتنا گھٹیا نہیں ہونا چاہیئے۔"

مریم نے تاسف سے کہا۔

" ارے زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

یاسمین نے مذاق اڑایا۔

" حالانکہ ان میں سے کسی میں کوئی خامی نہیں سب اپنی اپنی جگہ فٹ ہیں۔ مگر اس جفادری بلے کے پیچھے پاگل ہوئی جارہی ہیں۔"

" جفادری بلا تو نہ کہو ہے تو آفت چیز۔"

صدف باجی نے انصاف کیا۔

" اس کے آفت ہونے میں بے شک کوئی شک نہیں مگر سلیقے سے اپنی اپنی جگہ بیٹھی رہیں جس کی قسمت کا ہوگا اس کی جھولی میں آگرے گا۔"

روحی نے بھی مریم کی تائید کی۔

" جی نہیں! یہاں تو معاملہ پہلے آیئے پہلے پایئے کا ہے۔"

صدف باجی ہنسیں۔

" صدف باجی یہاں معاملہ اول و آخر کا نہیں اس طرح کے ماحول میں جہاں لڑکیاں بغیر کسی حد وجہ کے دامن میں آگریں وہاں کچھ لوگ اس بے ترتیبی میں بھی خوب انجوائے کرتے ہیں اور صفائی سے نکل جاتے ہیں اس لیئے لائن لگانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

مریم نے تقریر جھاڑ دی۔

" بھئی اب دل ہی تو ہے۔"

صدف باجی کو نفی کرنے میں مزا آرہا تھا۔

" ٹھیک ہے میرے بھائی سے کہدوں گی ذیشان حورانی صدف باجی کے ایمان میں دراڑیں ڈال رہا ہے۔ سنت و شریعت کی روشنی میں ان کو فوراً "زوجہ بنالیں"

مریم نے اتنے بے ساختہ کہا کہ سب کے قہقہے ابل پڑے۔

صدف باجی ایک دم کھسیا گئیں۔ چڑ کر بولیں۔

" اچھی چیز کو تو اچھا کہا ہی جاتا ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم مجھ پر الزام لگادو۔۔۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار ہے تم کہدو کہ جھوٹ ہے یا پھر تمہیں اپنے حسن کے آگے سب ماند نظر آتے ہیں۔"

مریم نے بے ساختہ صدف باجی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

" ناراض نہ ہوں میری اچھی سی بجو ایسی کوئی بات نہیں ہم میں سے تو کسی کے ایمان کو کوئی خطرہ ہی نہیں سب کے ایمان منسوب ہیں۔"

مریم نے کہا تو صدف باجی کو منانے کے لئے تھا مگر جھونک میں کیا کہہ گئی تھی اس پر پھر ایک قہقہہ پڑا۔

" تو یوں کہو کہ عمیر یاد آگیا سچ ہے تجھے اپنے ہیرو کے آگے کون نظر آئے گا۔"

کرن نے اس کے کان کھینچے۔

عمیر کے نام پر اس کے حسین چہرے پہ قوس وقزح کے رنگ بکھر گئے اور تبھی بالکل اچانک ذیشان کہاں سے آٹپکا کسی کی سمجھ میں نہ آیا دراصل وہ اپنی دنیا میں اتنی مست تھیں ذیشان نے مریم کو دھانی کپڑوں میں پیر پھولی تتے دیکھا تو ایک لمحہ کو ششدر رہ گیا۔ پھر ایک دم ہی اس نے سکھ کا سانس لیا اس کی تلاش کو قرار آگیا تھا۔۔۔ کئی بھانت بھانت کی لڑکیاں آتے ہی چمٹی تھیں اُسے کلب کا جائزہ لینے کا موقع ہی نہ ملا۔۔۔ بڑی شائستگی سے اس نے ان سب سے شکوہ کیا۔

" غالباً کلب کے آداب میں شامل ہے نئے ممبر کو خوش آمدید کہنا۔"

" مجھے ذیشان کہتے ہیں۔"

" ہاں! لیکن، اس صورت میں جب نوکر باضابطہ طریقے سے اپنا تعارف کرائے اور کسی ایک کونے میں فٹ ہو کر رہ جائے۔"

مریم نے بلا توقف مگر شائستگی سے نہلے پہ دہلا مارا۔

ذیشان نے گہری نظروں سے اُسے جانچا اس کے دل نے چپکے چپکے کہا۔ اتنی نسوانی آواز کے ساتھ اتنے برجستہ مگر شائستہ انداز میں جواب دینا بھی آتا ہے۔ آپ کو میں تو سمجھا تھا شاید آپکو بولنا بھی نہیں آتا۔

مگر وہ صرف "بہت خوب بہت خوب" کہہ کر رہ گیا۔

" بہرحال موسٹ ویلکم" سب ایک ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئیں

" تشریف رکھئے پلیز!"

روحی نے ہلکے سے ورش کے ساتھ دائیں ہاتھ کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

" بے حد شکریہ!"

تعارف کے تکمیل دہ مراحل سے گزرے تو آخر میں وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

" تو گویا پوری حویلی موجود ہے اس میز پر۔"

"جی خدا نظرِ بد سے بچائے۔"
مریم زیرِ لب مسکرائی۔
مسکرانے سے اس کے تراشیدہ لبوں کے گوشوں پر ذیشان کو ننھے ننھے ڈمپل نظر آئے بالکل نئی چیز۔
بات کرتی ہو تو آواز کا طلسم چھا جاتا ہے۔ مسکراتی ہو تو برق سی لہرا دیتی ہو۔ اتنے غضب ایک ساتھ کرو گی۔ تب بے موت مارا جاؤں گا.... ذیشان نے دل ہی میں اسے سراہا۔
کلب کی جلتی بجھتی روشنیوں کے سفر میں ذیشان اپنی دلچسپ باتوں کی وجہ سے جلد ہی گھل مل گیا۔ اس دوران ذیشان کو ایک بات بہت عجیب سی بھی لگی اور اچھی بھی کہ کلب کے نا طے لڑکوں وہ سب بڑی خندہ پیشانی سے ملتیں مگر شروع دن سے جو حدیں اور دائرے انہوں نے مقرر کر رکھے تھے اس کی باؤنڈری پر کسی کو پر بھی مارنے نہ دیتیں۔
اور وہ جو مریم کو دیکھتے ہی فیصلہ کر بیٹھا تھا کہ اب بیچ سونی رکھنے کا نہ کوئی جواز ہے نہ عذر۔ ابھی تک دل کی بات زبان پہ نہ لا سکا تھا.... وہ سب ہمیشہ گروپ کی صورت میں آتی تھیں۔ سب کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت تو ذیشان میں نہ تھی اور یوں اس کی آنکھیں دکھ گئی تھیں مریم کو سمجھاتے سمجھاتے اور مریم تھی کہ سمجھ کر بھی نہ سمجھ پا رہی تھی.... اور تب ذیشان کو اپنی قسمت کا فیصلہ ہی سننا تھا جو ایک دن مریم سے تنہائی میں جا ٹکرایا.... پہلے تو وہ اسے اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتا تھا پر جب اس نے دل کے چاروں خانے کھول کر پیراگراف کی صورت میں مریم کو سُنا دیئے تب مریم نے دھیرے سے اتنا بڑا انکشاف کیا کہ۔
وہ عمیر کی ہے....
تو ذیشان کو اتنا جذباتی صدمہ پہنچا کہ جو اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے ہر طرح مریم کو سمجھایا۔
"تمہارا نکاح تو نہیں ہوا نا۔ منگنی تو نہیں ہوئی نا بچپن کی نسبتوں کا کون پاس کرتا ہے۔"
مگر!
مریم کے پاس ایک ہی جواب تھا۔
جب کافی عرصے تک ذیشان اس کے پیچھے پڑا رہا تب اس نے مجبور ہو کر ذیشان سے وہ بات کہی جو اس نے آج تک عمیر سے بھی نہ کہی تھی۔
"آپ کے تمام دلائل اپنی جگہ ٹھیک ہیں میں آپ کے خلوص سے بھی منکر نہیں پر اس کا کیا کیا جائے کہ میں عمیر کو چاہتی ہوں۔

تب وہ اُسے آنکھیں کھولے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔
اگر مریم اتنے مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی اور اُسے حقیقتاً عمیر سے محبت نہ ہوتی تو ہزار نازک دوراہے آتے جہاں وہ متزلزل ہو سکتی تھی۔ ہر لحاظ سے فٹ اور معقول شخص کو ہر مرتبہ کورا سا جواب دینا صرف اسی کا کام تھا.... ایسے میں جبکہ عمیر بھی دور تھا۔ اور نہ کبھی عمیر نے ذیشان کی طرح اتنے لُوٹ لینے والے انداز سے اس کی تعریف کی تھی اور نہ ایسے جذباتی انداز میں حالِ دل کہا تھا.... ہمیشہ پاک اور صاف نگاہوں سے دیکھا تھا جس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ نہ نگاہوں میں ہوس تھا اور نہ دلوں کو دھڑکا.... پھر وہ....
ان پاک و صاف لڑکیوں میں سی تھی جو ایک مرتبہ کسی کا عکس آنکھوں کی راہ دل میں اتار کر چاروں طرف سے دل کے دروازے یوں بند کر لیتی ہیں کہ ہزار طوفان اور زلزلے بھی ان بند دیواروں میں دراڑیں نہیں ڈال سکتے....
ذیشان اتنا دل برداشتہ ہوا۔ کلب ہی چھوڑ گیا۔ آخری دفعہ اس سے ملا تو اتنا لٹا لٹا، مایوس، پژمردہ تھا مریم کا دل کانپ کر رہ گیا۔
"خدارا! تو اُسے ضبط دے اور مجھے آزمائشوں سے بچا۔
مگر جو کچھ ہوا.... اس کا مریم تو کیا کسی کو بھی وہم و گمان نہ تھا۔ جس کے نام پر وہ اتنا تن من سب کچھ نثار کر چکی تھی۔
اس نے۔
سارہ اسے یوں لوٹا کہ وہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔
دو سال بعد جب عمیر ایم ایس سی کر کے لوٹا تو حویلی کا چراغاں دیکھنے کے قابل تھا.... سب کے چہروں پر گلاب کھلے تھے بات بے بات قہقہے لگ رہے تھے ایک دفعہ جو اُسے گلے لگاتا چھوڑنے کا نام نہ لیتا۔ وہ خود بھی اس قدر مسرور و شاد ماں لگ رہا تھا اس کی صحت اور رنگت پہ مزید نکھار آ گیا تھا۔
مزے مزے کی باتیں بتا کر وہ اپنی بہنوں اور کزنز کے تحفے تحائف ان کو دیتا جا رہا تھا.... دلچسپ جملوں، پرلطف فقروں اور حسین سی چھیڑ چھاڑ کے درمیان وہ راجہ اندر بنا بیٹھا تھا وہ جو سب کی آنکھوں کا تارا ہے میرے دل کا چاند ہے جو اتنا ذہین ہے خوبصورت ہے صرف میرا ہے میرا.... مریم کی نس نس میں یہ خیال شرارے بن کے دوڑ رہا تھا۔ اور وہ سرخ سرخ چہرے کے ساتھ دور بیٹھی نگاہوں ہی نگاہوں میں اُسے سراہ رہی تھی۔

عمیر کے اعزاز میں شاندار جشن کا اہتمام ہو رہا تھا ایک دن دادی ماں نے اُسے پاس بلا کر برسوں کے فیصلے کو حقیقی رنگ دینا چاہا۔

"بیٹا اس خوبصورت موقع پر تمہاری اور مریم کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے تو کیسا رہے گا۔"

وہ جو بڑے لاڈ سے دادی ماں کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح پڑا تھا ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔

"نہیں دادی ماں نہیں۔"

اس کی نگاہوں میں تذبذب کا سرا یا گھوم گیا۔

"کیوں بیٹا۔"؟

دادی ماں کی نگاہوں ہی میں نہیں لہجے میں بھی حیرت تھی تو وہ ایک دم سنبھل گیا۔

واہ دادی ماں آخر جیب بچانا چاہتی ہیں۔ ارے اس جشن کو خالصتاً ہماری کامیابی کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔"

"ارے تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے میرے چاند۔"

دادی ماں نے اس کی شوخی پر اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"واہ دادی ماں فرق کیسے نہیں پڑتا۔"

کہیں دور سات سمندر پار سے تذبذب کے سراپے نے اُسے اپنے وعدے یاد دلا دیئے۔۔۔ پھر دادی ماں نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا ٹھیک ہے بعد میں دیکھا جائے گا۔

عمیر کی وجہ سے شادیاں رکی پڑی تھیں۔۔۔ کچھ عرصے بعد جب خوشیوں کو قرار آ گیا اور عمیر کا تقرر بھی ملک کی مشہور کمپنی میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے ہو گیا تو شادی کے ہنگامے جاگ اُٹھے حویلی کی دو لڑکیاں صدف اور کرن حویلی ہی کے لڑکوں منیر اور جنید سے بیاہی جا رہی تھیں۔۔۔ خوشیوں اور ہنگاموں نے دوہرے رنگ لئے ہوتے تھے۔۔۔ بزرگوں کی اپنی محفلیں تھیں۔ اور جوانوں کے اپنے کاشانے۔ کون سا ہلا گلا تھا جو انہوں نے بپا نہ کیا ہو۔ عمیر نے تو مغرب کے سارے رنگ ہی چرا لئے تھے انگلش میوزک، انگلش گانے انگلش ڈانس وہ ہنگامہ کرتا کہ ہنس ہنس کے پیٹ دکھ جاتے۔۔ جب شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا۔ تو بزرگوں نے قدغن لگانی چاہی کہ اب تو پردہ کرا دو سب نے فرمانبرداری سے ایک لائن میں کھڑے ہو کر باادب سیدھے کان سے سنا اور ان کے جاتے ہی اُلٹے کان سے خارج کر دیا بزرگوں نے بھی نگاہیں چرا لیں۔

"ارے کر لو من مانی سب تمہارا ہی ہے۔"

ایک سال پلک جھپکتے گزر گیا تو روحی اور نبیلہ کی شامت آئی۔۔۔ ان کی شادیاں کیونکہ باہر ہو رہی تھیں اس لئے ہنگامے اور خوشیاں تو اسی عروج پر تھیں مگر جدائی کے تصور سے چہرے اتر جاتے تھے۔۔۔ دو لڑکیاں رخصت ہوئیں تو حویلی پہ تھوڑا سا سناٹا چھا گیا۔

اس ایک دو سالوں میں کیونکہ وقفہ وقفہ سے چار شادیاں ہوئی تھیں اس لئے جاگتے ہنگاموں میں لوگوں نے عمیر کے انکار کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی جبکہ مریم۔

وہ اسی دن سے بجھ گئی تھی جس دن دادی ماں سے عمیر نے جشن کا بہانہ لیا تھا۔ وہ اتفاق سے ادھر سے گزر رہی تھی چاچا نام سن کر رک گئی تھی۔۔۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ عمیر بچوں کی طرح دادی ماں کی گود میں لیٹا تھا۔۔۔ منگنی کا سن کر اس کا ایک دم چونک جانا اور بلا تردد انکار کر دینا۔۔۔ مریم کو بُری طرح محسوس ہوا تھا۔ وہ تو متوقع تھی کہ عمیر دادی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر دمکتے چہرے کے ساتھ کہے گا۔

"دادی ماں نیک کام میں دیر کیوں۔"؟

مگر اس کے برخلاف عمیر کے چہرے پہ شوق و اشتیاق کی پرچھائیاں نہیں لہرائی تھیں بلکہ اس موضوع سے کترا جانے کے واضح نشانات موجود تھے۔۔۔ وہ مرے مرے قدموں سے وہاں سے ہٹی تو عجیب سی گھٹن محسوس کر رہی تھی۔۔۔ لندن سے آنے کے بعد عمیر نے کسی شوق یا گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا جشن بھی گزر گیا تھا۔۔ آہستہ آہستہ شادی کے ہنگامے بھی جاگ گئے تھے ہزار موقع ایسے آئے تھے جب وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کو چھیڑ سکتا تھا۔ اس کے حسن کو سراہ سکتا تھا۔۔۔ ویسے بھی ان کے یہاں کوئی قید و بند تو نہیں تھی وہ طالب علمی کا زمانہ تو نہ تھا جہاں مریم کو ان اشاروں کی ضرورت تھی نہ عمیر کو فرصت۔۔۔ مگر اب۔۔۔ کوئی تو جملہ ایسا ہوتا۔۔۔

کوئی تو اشارہ ایسا ہوتا جس سے اس کے دل کو اطمینان ہوتا کہ عمیر بھی اس معاملے سے کوئی دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ جتنی سچائیوں سے اس نے عمیر کو چاہا ہے وہ بھی عمیر کی چاہت ہو گی۔۔۔ مگر!

یوں اس کے مقابلے میں شادی سے ایک ہفتے پہلے تک منیر بھائی اور جنید بھائی نے صدف اور کرن کا ناطقہ بند کر رکھا تھا ایسی حسین چھیڑ چھاڑ کہ ان کے چہرے گلگوں ہو جاتے اور

آس پاس کی فضا سہانی۔

پھر!

کیا عمیر جذباتی اعتبار سے بالکل ٹھس تھا؟

یا حنیط کی اوور ایکٹنگ کر رہا تھا۔؟

مریم بہت کچھ سمجھنے اور جاننے کے چکر میں الجھتی جا رہی تھی یوں بظاہر خوشدلی سے ہر چیز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی وہ عمیر سے اور عمیر اس سے نارمل بات بھی کرتے تھے لیکن دل و دماغ پہ اداسی کے ڈیرے سے تھے کیونکہ کسی اور نے بھی کبھی خدشے کا اظہار نہ کیا تھا سو وہ بالکل چپ تھی اس معاملے میں۔۔۔

ان شادیوں کے درمیان دو تین مرتبہ ان کی منگنی کا چرچا بھی ہوا تھا مگر عمیر بڑی صفائی سے دامن بچا جاتا۔۔۔ لیکن جب شادیاں بھی ہو گئیں اور فرصت ہی فرصت ملی تب بھی اس کے حیلے بہانے جاری تھے۔ دادی ماں کے کان کھڑے ہوئے۔

"کیا چیز مانع ہے۔؟

"بہو تم معلوم تو کرو کیا بات ہے تمہارا بیٹا ہے کیا چاہتا ہے۔؟"

دادی ماں نے فکرمند ہو کر فیروزہ بیگم سے پوچھا۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں اماں عمیر مجھ سے زیادہ آپ کے قریب ہے آپ سے فری ہے۔"

فیروزہ بیگم روہانسی ہو رہی تھیں۔۔۔ وہ بھی بہت دنوں سے اس کے ٹال مٹول کو دیکھ رہی تھیں مگر اپنے ہی بیٹے کا معاملہ تھا اس لئے چپ تھیں۔

"تم نے رفعت جہاں کا اترا اترا چہرہ دیکھا مریم میں کچھ بھی وہ بات نہیں ہے آخر کب تک حقیقت سے دور بھاگیں گے۔"

دادی اماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ابھی تک یہ خدشے صرف ان ہی دو کے درمیان تھے ایک دم کھل جانا بھی مناسب نہ تھا۔۔۔ فیروزہ بیگم چپکے چپکے رونے لگیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ فضا میں کثافت تھی اور وہ بے انتہا شرمسار تھیں کہ ان کا بیٹا ان مسائل کا سبب بن رہا ہے۔

پھر یہ طے ہوا کہ یاسمین عمیر سے کافی فری ہے وہی باتوں باتوں میں عمیر سے کچھ پوچھے۔۔۔۔ یا کوئی ایسا اتہ پتہ ملے جو صورتِ حال پہ روشنی ڈال سکے۔

یاسمین نے بڑی جانفشانی سے وجہ تلاش کی اور انکار کا جواز جب اس کے ہاتھ لگا تو وہ ششدر کھڑی کی کھڑی رہ گئی ۔۔۔۔لزبتھ نامی لڑکی کی تصویر اور بے شمار خطوط کا پلندہ اس کے ہاتھ میں تھا۔۔۔ اور وہ یقین و بے یقینی کے تکلیف دہ مراحل سے گزر رہی تھی۔۔۔۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا دوڑ کر دروازہ بند کر لیا۔۔ وہ صفائی کے لئے عمیر کے کمرے میں آئی تھی صفائی کے دوران مسہری کے سرہانے چابی دیکھ کر اُسے تعجب ہوا غالباً بھائی جان جلدی میں بھول گئے اس نے چابی لے کر ہاتھوں میں گھمائی پھر ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا آج ان کی الماری کی تلاشی لی جائے شاید کوئی راز ہاتھ لگے اور "لاکر" نے اُسے مایوس نہیں کیا تھا۔۔۔ بے شمار خطوط اور تصاویر۔۔۔۔

وہ مغرب کی تتلی ہرا ہرا دیئے سے عمیر کے ساتھ موجود تھی۔ یاسمین نے دو چار خط پڑھے تو سناٹے میں رہ گئی مریم کے بجائے۔

لزبتھ عمیر کی منزل تھی۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے لاکر بند کیا چابی سرہانے اسی طرح ڈال دی اور تمام بہنوں کو مجتمع کر کے دادی ماں کے پاس پہنچی دادی ماں اپنے کمرے میں اتفاق سے اکیلی تھیں۔

یاسمین سے اور تو کچھ بن نہ پڑا دادی ماں کی گود میں منہ چھپا کر رو پڑی۔۔۔ دادی ماں پہ آنسوؤں کی وجہ معلوم کر کے سکتہ سا ہو گیا چھپنے والی بات تو نہ تھی رات عمیر کے آنے تک پوری حویلی میں بم پھٹنے کے باوجود سناٹے کی کیفیت تھی جیسے کوئی قیمتی شے کھو گئی ہو۔!

کسی نے ڈاکہ ڈال دیا ہو۔!!

دادی ماں شجاعت علی اور وجاہت علی کو ٹھنڈا کرنے میں لگی تھی۔

"دیکھو جوان خون ہے منہ مت لگنا ہماری سات پشتوں میں کبھی ایسا غلیظ پیوند نہ لگا جو کبھی نہ ہوا وہ آج ہو گیا مگر ذرا برداشت سے کام لینا" یوں دادی اماں ساری جان سے کانپ رہی تھیں مگر تحمل اور برداشت کا درس بھی دیتی جا رہی تھیں

"رفعت اور حسن صبح سے کمرے سے باہر نہیں نکلے میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔۔۔۔ مریم پہ کیا ظلم ہوا ہے ماں۔"

شجاعت بے بسی سے ہاتھ مل رہے تھے۔۔۔ پھر ایک دم ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے اس ناہنجار کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹوں اور مریم کے قدموں میں ڈال دوں۔"

"نہ بیٹا نہ! اولاد کا گلا کوئی نہ گھونٹتا۔ مجھے تو لگتا ہے میری تربیت ہی میں کوئی کسر رہ گئی ہوگی۔"

دادی ماں زور زور سے رونے لگیں... شجاعت اور وجاہت دوڑ کر اماں کی طرف بڑھے ان کے بوڑھے کانپتے وجود کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔

"نہیں اماں ایسی بات نہیں.. کچھ لوگ خود سر اور ضدی ہوتے ہیں۔
بات فطرتوں کی بھی ہوتی ہے.... وہ اتنا کمزور نکلا دیکھ لینا اماں وہ نقصان اٹھائے گا۔"

شجاعت علی بے تاسف سے کہہ رہے تھے۔

"منیر یا جنید سے کہو عمیر سے صاف صاف بات کرے ہو سکتا ہے۔ شروع کا معاملہ ہو اور اب اس کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہو۔"

وجاہت نے مشورہ دیا۔

اور جب منیر نے عمیر سے اس سلسلے میں بات کی تو خود عمیر جو اس موقع کی تلاش میں تھا ایک دم کھل گیا حالانکہ منیر نے اسے تصاویر اور خطوط کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا مگر عمیر نے خود ہی لزبتھ کی تصاویر منیر کو دکھائی۔

منیر کا خون عمیر کی اس بے غیرتی پر کھول کر رہ گیا وہ اپنے طور سے اسے جتنا سمجھا سکتا تھا سمجھایا۔

"دیکھو مشرق مشرق ہوتا ہے مغرب مغرب۔ وہ وقتی طور سے ہمارا معاشرہ قبول کرلے گی مگر جلد ہی یہاں کے ڈھکے چھپے ماحول، پاکیزگی اور مخصوص حدود سے گھبرا جائے گی... اکتا جائے گی مچھلی کو پانی سے باہر نکالو تو وہ مر جاتی ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو وہ آزاد فضا میں سانس لینے کی عادی ہوگی۔"

منیر بھائی نے اونچ نیچ سمجھائی۔

"جب وہ اپنا ملک چھوڑنے کی قربانی دے سکتی ہے تو اس کو یہ تمام باتیں برداشت کرنا کوئی مشکل نہ ہو گا۔ میں اس سلسلے میں اس سے بات کر چکا ہوں وہ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرے گی۔"

عمیر نے لزبتھ کی وکالت کی۔

"یار تمہارے اپنے دیس میں کیا لڑکیوں کا کال پڑا ہے جو تم وہاں کی بھیک اپنی جھولی میں بھر کر اعزاز سمجھتے ہو۔"

منیر بھائی نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"میرا فیصلہ اٹل ہے اور آخری.... اس سے زیادہ کی کوئی گنجائش نہیں... میں خود مختار ہوں ہر طرح سے آزاد ہوں۔ یہ بڑی بات نہیں کہ میں پاکستان چھوڑ کر نہیں جا رہا اور ہمارا قیام ہمارا گھر یہی حویلی میں ہوگا۔"

عمیر اپنی دانست میں بڑی قربانی دے رہا تھا۔

ساری عمر سینے پہ مونگ دلنے اور اتنے جارحانہ انداز سے سہنے سے بہتر تو یہ ہے کہ تم حویلی کے ساتھ ساتھ پاکستان بھی چھوڑ جاؤ منیر بھائی نے طنزیہ سوچا پھر چپ چاپ واپس آگئے انہوں نے تمام گفتگو سب کے گوش گزار کر دی۔

بزرگوں کی وہ امید بھی ختم ہو گئی کہ شاید وہ مان جائے.... لزبتھ سے پیچھا چھڑانے۔ حویلی کے ہر فرد نے اپنے اپنے طور سے سمجھایا، غصے سے پیار سے مگر

نہ دودھ بخشوانے کی دھمکی کارگر ہوئی۔

نہ کسی کا آنسوؤں سے تر دامن اس کی راہیں روک سکا۔

وہی عمیر تھا مگر ایک دم کتنا بدل گیا تھا۔ اتنا گستاخ تو اسے زندگی میں کسی نے نہ دیکھا تھا۔

"بیٹا گھر کے لڑکے اگر گھر کی لڑکی کو ٹھکرا دیں تو اس سے بڑی بے عزتی اور کیا ہے اور پھر وہ تو بچپن سے تم سے منسوب ہے بیٹا۔"

دادی اماں نے اسے شفقت سے اس کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔

"بچپن کے فیصلوں کو میں نہیں مانتا دادی ماں یہ فرسودہ رسم و رواج ابھی بھی ہمارے معاشرے سے جونک کی طرح چمٹے ہیں۔ میرا کون سا مریم سے نکاح ہو گیا تھا۔ ایسے تو ہنسی مذاق میں بڑے کہہ ہی دیا کرتے ہیں۔"

"بیٹا۔ ہنسی مذاق۔"

مارے رنج کے دادی ماں سفید پڑ گئیں یہاں خاندانی عظمت داؤ پہ لگی تھی اور وہ اسے کھیل سمجھ رہا تھا۔

"تم نے زندگی اتنے سالوں تک اس کو مذاق نہ جانا اور صرف تین چار سال میں تمہیں سارے رشتے مذاق لگنے لگے.... اگر تمہیں اعتراض تھا تو پہلے کہا ہوتا... اپنے کسی عمل سے ظاہر کیا ہوتا.... تم تو ہمیں اب تک دھوکا دیتے چلے آرہے ہو لندن سے آئے تمہیں دو سال ہو چکے ہیں اس دوران تم ٹالتے بے شک رہے مگر پھر بھی تم نے یہ نہ کہا کہ یہ مذاق تھا.... اس لئے کہ تم میں ہمت نہ تھی۔ عمیر.... مگر یہ تو سوچا ہوتا کہ مریم کا کیا بنے گا۔"

دادی اماں کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔

"تو ابھی مریم کا بگڑا کیا ہے۔"

دادی ماں وہ حسین ہے خوبصورت ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ ایک اشارہ کریں ہزار رشتے آنے کے لئے تیار ہیں۔"

عمیر نے لاپرواہی سے کہا۔

"حویلی کی عزت اب اتنی سستی ہو گئی ہے تمہاری نظر میں یا تمہاری غیرت کے سارے جنازے وہ فرنگن نکال چکی ہے۔ پوری دنیا کو خبر ہے کہ مریم تم سے منسوب ہے اگر ایسا نہیں ہوا تو کس کس کی زبان پکڑوں گی... جس نے شرافت سے بزرگوں کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دیا اور تمہارے نام پر زندگی گزار دی اُسے کسی اور کے دامن میں ڈال دوں۔"

دادی ماں نے غصے کی شدت میں عمیر کو پیٹ ڈالا۔

مگر......

عمیر پہ نہ کسی کی مار کا اثر ہوا نہ کسی کی شفقتوں کا نہ تبسم سے بھرے کٹوروں کا۔ وہ اور بھی خود سر اور لاپرواہ ہوتا چلا گیا زیادہ کسی کو لفٹ نہ دیتا۔

شجاعت علی بہن کے قدموں میں جھک گئے۔

"مجھے معاف کر دو رفعت جہاں... مریم کو میں نے ہی اپنی بیٹی بنایا تھا۔ وہ تو میری بن گئی ہے مگر عمیر تمہارا بیٹا نہ بن سکا۔ وہ تمہارا کیا میرا بھی نہ رہا کیوں کہ وہ مر چکا ہے رفعت وہ مر چکا ہے۔"

رفعت نے بھائی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا نہیں بھائی جان ایسا نہیں۔ خدا اُسے سلامت رکھے وہ میری مریم کی قسمت میں نہیں ہے۔"

وہ زار و قطار رو رہی تھیں..... حسن دانش سے تو دادی ماں تک نے معافی مانگی... وہ دکھ کے مارے بیمار پڑ گئے۔

حویلی کا ماحول بہاروں کی گود میں پروان چڑھا تھا خزاں کی وحشت ہر کسی کی برداشت کا امتحان تھی۔

ان سب کے دکھ مشترک تھے۔

مگر!

قدرتی طور پر سب سے زیادہ سخت لمحے مریم کے گزر رہے تھے......

جو منزل تک بڑے یقین کے ساتھ آنکھیں بند کر کے دل کی صداقتوں سمیت ہواؤں کے دوش پہ محو پرواز رہی تھی۔

لزبتھ کے تیز اور نیلے کانچ کے مانجھے سے بری طرح کاٹ دی گئی تھی۔

وہ اپنی ہتک اور بے عزتی کی جس آگ میں جل رہی تھی کسی کی ہمت نہ تھی کہ دو بول ہی اس سے بول دے......

وہ جو بڑی حساس تھی!

بڑی خود دار تھی...!!

اس معاملے میں کسی کا پیار سے کہا ہوا ایک جملہ بھی برداشت نہ کر پاتی... سب اس کے سامنے چپ سے بنے ہوئے تھے۔ عمیر صدیقی... کرن اور یاسمین کا اکلوتا بھائی تھا مگر کیا خوبصورت کردار ادا کیا تھا وہ اتنی شرمسار تھیں کہ مریم سے نظریں ملا کر بات نہ کرتیں۔

دادی ماں اس دم گھونٹ دینے والے ماحول میں اندر ہی اندر گھٹتی چلی گئیں... جہاں کے در و دیوار سے موسیقی پھوٹتی تھی وہاں سے المیہ نغموں کی دل تڑپا دینے والی صدائیں گونجتی تھیں... وقت بری طرح سے کانٹے چبھوتا ہوا گزر رہا تھا... ایک سال صدیوں میں ہوا تھا۔ عمیر کی گھر والوں سے واجبی سی بات ہوتی۔ یاسمین البتہ اس کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی... وہ بھی کبھی ہوا میں ہوتا تو اپنے پروگرام سے اُسے آگاہ کر دیتا۔

اس ایک سال کے دوران ایک ہی جگہ رہتے ہوئے بہت کم لمحے ایسے آئے تھے جو عمیر کو اپنے فیصلے پر نادم ہوا وہ بھی مریم کی شکل دیکھ کر... یوں تو مریم کی آنکھوں میں وحشتوں کے غبار مگر چہرے پر چٹانوں کی سی سختی دیکھی تھی یوں اس کی کبھی ہمت نہ پڑی کہ اخلاقاً ہی اس سے معذرت کر لے دو تین مرتبہ اس نے مریم کو اپنے کمرے کے دریچے پر بے اختیار روتے دیکھا تھا۔ تب اس کے سینے میں ہلکا سا ارتعاش بھی ہوا مگر دو پل لمحے ہی۔

لزبتھ اپنی تمام ستر سامانیوں کے ساتھ موجود ہوتی تھی۔ پاکستان آئے تین سال ہو چکے تھے اور اس دوران خط و کتابت میں کسی قسم کا خلل نہ ہوا تھا۔ لزبتھ اُسے اس کے وعدے یاد دلاتی اور وہ کسی مناسب موقع کا منتظر تھا۔

اور جب یاسمین کے ذریعے سب کو اطلاع ملی کہ عمیر لندن جا رہا ہے لزبتھ سے شادی کرنے تو پھر ایک دفعہ حویلی کی دیواریں ہل کر رہ گئیں... پھر حویلی کے باسیوں نے اپنی قوتیں مجتمع کیں اور اسے آخری بار سمجھایا مگر.....

لزبتھ کیسا نشہ تھا جس میں عمیر سر سے پیر تک غرق تھا اور کسی کی کوئی بات ہی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ سب کے دل توڑ کر لندن گیا... نہ بارات سجی نہ شادیانے بجے نہ حسین و خوبصورت چھیڑ چھاڑ کی رسمیں ہوئیں... نہ بہنوں کے ارمان نکلے نہ شجاعت اور فیروزہ بیگم کے مان پورے ہوئے۔

مریم پہ اپنی وحشت چھائی کہ اس نے بے اختیار دریچے سے ٹکرا دیا۔ پانچ سال سے فطری شرم اپنی انا خودداری کے

بند اس نے اپنے چاروں طرف باندھ رکھے تھے وہ زبردست دھماکے سے ٹوٹے تھے اور مدتوں کا لاوا سب کے سامنے بہہ نکلا تھا۔ وہ دادی ماں کی گود میں سر رکھ کر بری طرح روئی تھی.....

عمیر کو لندن گئے پانچواں دن تھا اور اس پانچ دنوں سے حویلی پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

سب اس قیامت کے منتظر تھے

جو لزبتھ کی صورت میں اس پاک و صاف حویلی کے در و بام لانے والی تھی۔!

اس سنہری گرد و غبار کے طوفان سے خوفزدہ تھے جس نے آنے سے پہلے ہی مشرق کی پاکیزہ اور مقدس و معصوم آئینوں کو دھندلا دیا تھا۔!!

مریم بالکل خالی الذہن تھی..... اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود تھیں یا ذہن سے اس نے نہ تو زندگی کے متعلق کچھ سوچا نہ مرنے کے متعلق..... یوں دو تین دن تک اس سے کچھ کھایا پیا نہ گیا یا تو دریچے سے ٹنگی رہتی یا کمرے میں ٹہل ٹہل کر ٹانگیں شل کر لیتی..... وہ اپنے کمرے سے باہر ہی نہ نکلی۔ کسی کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی..... نیند اس کی آنکھوں سے غائب تھی وہ پانچ راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی۔

کیوں۔؟

یہ وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔

فیصلہ تو ہو چکا تھا..... پھر؟

اور آج عمیر کو گئے پانچواں دن تھا۔ مریم اور یاسمین کی بے تحاشا گہری مشترکہ دوست حلیمہ کی شادی تھی آج اس کی مہندی تھی۔ مریم کے لاکھ انکار کے باوجود یاسمین نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا..... پھر خود مریم نے سوچا۔

وہ کیوں نہیں جا رہی۔ حلیمہ اور اس کی سہیلیاں کیا سوچیں گی؟

وہ اپنا تماشا بنوانا چاہتی ہے۔ تاکہ لوگ اس سے ہمدردی کریں۔ اس پہ رحم کھائیں نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ ایسے نکلوں گی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں سمندر بن کے اپنے سارے راز اپنی تہہ میں چھپا لوں گی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ پرسکون بن جاؤں گی..... وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی.....

رات دس بجے واپسی ہوئی..... واپسی پر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی کپڑے تبدیل کئے بغیر ایزی چیئر پہ نیم دراز تھی..... مہندی کی رسومات شادی بیاہ کے رسیلے نغموں حسین سی چھیڑ چھاڑ نے اس کی روح پہ مزید چرکے لگائے تھے۔ عمیر اور لزبتھ اس وقت زندگی کے

بھرپور حسین دن گزار رہے ہوں گے۔ اور وہ خود؟

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

اگر لزبتھ درمیان میں نہ ہوتی تو حالات ہی دوسرے ہوتے..... وہ ماضی حال اور مستقبل کی خاردار شاہراہوں پر اور پگڈنڈیوں پر تنہا گھوم رہی تھی اور اپنے آپ سے لڑ لڑ کے نڈھال ہو رہی تھی.....

بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو تھوڑا سا آمادہ کیا کہ اسے حقائق کا سامنا کرنا ہے وہ پڑے پڑے شل ہو گئی تھی جو اس نے تھکی تھکی سی انگڑائی لی تھی مگر آنکھیں کھولنے پہ عمیر کو دیکھ کر اسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔

وہ کیا کرنے گیا تھا؟ اور خالی کیونکر لوٹ آیا!!

مریم جھکرا کر رہ گئی تھی اس نے عمیر کو دھتکار کر کمرے سے نکل جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اس سے اس کی کہیں انا تسکین ہو گئی تھی یہ جاننے کی اسے نہ فرصت تھی نہ ضرورت البتہ۔

تلخ حقائق کے کچھ دائرے اس کی آنکھوں میں ضرور پھیل اور سکڑ رہے تھے۔

اس عظیم خاندان کا ایک معقول لڑکا پھر یانکی کی گڑیا بن گیا تھا..... مریم سے بڑے ترم و ملائم انداز سے چھڑا کر وہ پوری قوت سے لزبتھ سے ٹکرایا تھا اور اس کی کھلی دعوت زدہ باہوں میں بے ساختہ سما گیا تھا اور اب یا تو لزبتھ نے اسے اگل دیا تھا یا پھر وہ خود کسی وجہ سے اسے ٹھکرا کر چلا آیا تھا۔

تاکہ مریم کے تقدس کی آبشار میں اپنا آلودہ وجود دھولے..... مریم کے دل میں ہلکی سی نفرت کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں..... ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو حقائق کا سامنا کرنے پہ آمادہ کیا تھا مگر۔

چند لمحے پہلے وہ ستمگر آیا تھا اور پھر اسے بے چین کر گیا تھا

اس نے زندگی کو تماشا سمجھ لیا ہے مریم نے دکھ سے سوچا کبھی کو اپنا لیا جب چاہا کسی کو ٹھکرا دیا۔

اس نے لزبتھ کے آگے میری ذات کی نفی کی تھی۔

میرے آشیانے کو آگ لگا کر بڑی صفائی سے اپنا دامن بچا گیا یہ دیکھے بغیر کہ کون مر گیا۔؟

کون جل گیا۔؟!

اور اب خود کو چوٹ لگی تو راکھ کریدنے آیا ہے۔

ساری رات مریم کے خیالات کے ہجوم میں گھری رہی۔

جذبات کی تند و تیز لہروں میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔

دوسرے روز کا سورج حویلی کے لئے ایک روشن انقلاب لایا۔

یاسمین

حسب معمول عمیر کے کمرے کی صفائی کرنے گئی تو مسہری پر عمیر منہ لپیٹے پڑا تھا اس کی چیخ نکل گئی۔

"بھائی جان آپ۔"

اس نے لاشعوری طور پر کمرے میں نزہت کو تلاش کیا۔

عمیر نے نظریں چرالیں کچھ بولا نہیں.... وہ بجائے کچھ پوچھنے کے حواس باختہ کمرے سے باہر بھاگی اور تھوڑی دیر بعد سارے ہی لوگ اس کے کمرے میں جمع تھے۔

وہ ان سب کو دیکھ کر بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا مگر اس کا جھکا سر نہ اٹھ سکا کسی نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو کسی نے پیٹھ تھپتھپائی۔ دادی ماں اور فیروزہ بیگم نے بلائیں لے کر اسے گلے لگا لیا.....

اس کی صورت بتارہی تھی کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

مگر ان کے لئے تو خوشی کا مقام تھا۔ حویلی کے مینارے بلند رہے تھے آسمان سے شرمندہ نہ ہوتے تھے سب کے چہروں سے بے چینیاں عیاں تھیں وہ چاروں طرف سے سوالات کی بوچھاڑیں ہوا پایا ہوا تھا.... وہ سب صورت حال معلوم کرنے کے منتظر تھے مگر عمیر بالکل چپ تھا اور چہرے سے اتنا شرمندہ پشیمان و کمزور لگ رہا تھا کہ بزرگوں کو خود ہی اس پر ترس آگیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے ایک دوسرے کو باہر چلے جانے کا اشارہ کیا اور ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے صرف دادی ماں اور فیروزہ بیگم رہ گئیں۔

تب دادی ماں نے اسے پچکارا

"بیٹا کوئی بات تو کر دل تو بھرے۔"

عمیر نے کوئی بات نہیں چھپائی لندن میں دو سال کے دوران وہ کس طرح نزہت کے چکر میں پھنسا اور بعد میں کیونکر وہ اسے خطوط لکھ کر پاگل بناتی رہی دھوکہ دیتی رہی اور ان تین سالوں میں کس طرح اس نے البرٹ سے شادی کی جس سے ایک بیٹا بھی ہے اور ابھی بھی جھوٹ موٹ کی داستان سنا کر وہ عمیر سے شادی پر دل و جان سے راضی تھی۔ عمیر دھیرے دھیرے ان چھ سالوں کی روئیداد سنا رہا تھا۔

"تم نے اچھا کیا چند لاتیں مار کر آگیا اس بے غیرت نے تیرا انتظار بھی نہ کیا۔ اور شادی رچالی۔ اور پتہ نہیں بیٹا پہلے کتنی کرلی ہوگی ان موئی فرنگنوں کا کیا اعتبار۔"

دادی ماں نے بڑے پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اس کا دل بھرا۔

"اور کم بخت تین سال سے میرے بچے کو دھوکے میں رکھے تھی۔"

فیروزہ بیگم نے دھائی دی۔

"اے میں تو کہتی ہوں ہوا اللہ سب کے ایمان سلامت رکھے اس دیس میں جا کر تو اچھے اچھوں کی کھوپڑی الٹ جاتی ہے میرا بچہ تو چھوٹی عمر میں گیا تھا جو اس کے چنگل میں پھنس گیا۔"

دادی اماں نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

بڑے لوگوں کے بڑے ظرف ہوتے ہیں۔ عمیر خلوص کی گھنی چھاؤں میں آگیا تھا۔

نہ کسی نے ملامت کی!

نہ اسے ڈانٹا!!

نہ چڑایا!!!

نہ اس کے میرے چیرکوں کے طعنے دیئے!!!!

اس کی تمام کوتاہیوں کو بڑی خوبصورتی سے نظر انداز کر دیا۔

اس صبح کی چمکیلی خوشگوار کرنیں شام کے شنگرفی رنگوں میں گھل مل گئیں۔ اور کسی کو وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

عمیر نے ایک ایک سے معافی مانگی۔ رفعت جہاں اور حسن دانش کے آگے سر جھکا دیا... انہوں نے بڑی فراخدلی سے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ان کا اپنا خون تھا ان کا بیٹا تھا... صبح کا بھولا شام گھر آگیا تھا بڑی بات تھی بھول بھلیوں میں گم نہ ہوا تھا۔

ان ہنگاموں میں مریم کی غیر حاضری کو اس کے نازک جذبات کی بنا پر نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن جب رات کے کھانے پر بھی اس نے آنے سے انکار کر دیا تو یاسمین اسے بلانے گئی مگر منہ کی کھا کے آئی۔

"پھوپھی اماں وہ تو دروازہ ہی نہیں کھول رہی۔"

یاسمین نے رفعت جہاں کے کان میں تو پھونکا۔ تو ان کے پیٹ میں ایک دم ہڑبڑا اٹھا۔

"اے کیا ہو گیا میری بچی کو۔"

وہ ایک دم اٹھ کے بھاگیں۔

"مریم دروازہ کھولو میری گڑیا۔"

رفعت جہاں کی آواز پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی سوجی سوجی آنکھیں۔ اور ستا ستا چہرہ دیکھ کر رفعت جہاں کا کلیجہ کٹ گیا۔

"بیٹے کھانا نہیں کھانا؟"

رفعت جہاں نے اُسے سینے سے لگالیا اس کا دل چڑیا کی طرح کانپ رہا تھا اور وہ پوری جان سے ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

"اَتی جانی مجھے بھوک نہیں اگر آپ زبردستی کھلانا ہی چاہتی ہیں تو اوپر ہی بھیج دیں۔"

اس نے دھیرے سے کہا۔

"شہزادی تمہاری گیارہ نمبر بس کا کیا ہوا جو تم ڈائننگ حال تک نہیں جاسکتیں۔"

یاسمین نے اس کی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔

"بکواس مت کرو۔"

مریم کو غصہ آگیا۔

"ہائیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ چلو شاباش سب وہاں انتظار کررہے ہیں"

رفعت جہاں بیٹی کے تمام آثار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ایسا کرتے ہیں پھوپھی اماں عمیر بھائی ہی کو یہاں بھیج دیتے ہیں وہ اُسے لے کر آئیں گے۔"

یاسمین کھل پڑ رہی تھی۔

"کیا؟"

مریم اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ یاسمین کی بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

"جس شخص کی شکل سے مجھے نفرت ہے جس کی وجہ سے میں نیچے نہیں جارہی تم اُسے یہاں بھیجنا چاہتی ہو کس خوشی میں کس رشتے سے۔"

وہ غصے میں ایک دم لال پیلی ہورہی تھی رفعت جہاں اور یاسمین ایک دم چپ ہوگئیں۔ کمرے میں ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔

"آپ میں سے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میری حد سے زیادہ شرافت اور فرمانبرداری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس شخص کے لئے مجھے راضی کیا جاسکتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے مجھے نفرت ہے اس سے نفرت۔"

اس نے دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے سرخ سرخ چہرے کے ساتھ بڑے جذب کے عالم میں کہا۔

"تم کس شریف خاندان کی بیٹی ہو۔ مریم یہ مت بھولو اور شاید تم یہ بھی بھول رہی ہو کہ تم نے کبھی اپنی ماں کے آگے اونچی آواز سے بات نہیں کی۔"

رفعت جہاں نے بے حد قلق سے کہا۔

"وہ مریم مرگئی اَتی وہ مریم مرگئی۔۔۔ اب صرف وہ مریم رہ گئی ہے جو ٹھکرائی گئی ہے توڑی گئی ہے۔"

مریم بری طرح رو دی۔

یاسمین نے رفعت جہاں کو نیچے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا کھانا اوپر ہی بھیج دیا گیا۔ اس نے تھوڑا بہت زہر مار کرلیا۔

وہ سب عمیر کے آنے سے جتنا خوش تھے اب مریم کے رونے سے پریشان تھے وہ عمیر سے بات کرنا تو درکنار اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہ تھی۔۔۔ یوں عمیر نے حتی الامکان کوشش کی کہ کسی طرح اس کا سامنا ہو جائے۔ وہ کسی طرح بھی اُسے منالے گا مگر ایسا کوئی موقع اس کے ہاتھ نہ آسکا اتنا حوصلہ شکن اس کا انداز ہوتا کہ عمیر کی ہمت نہ پڑتی۔

مریم نے دیکھتے دیکھتے فائن آرٹ میں داخلہ لے لیا۔ وہ کمرشل بیس پہ کپڑوں کے ڈیزائن سیکھ رہی تھی۔۔۔ گھر سے فرار کا اس نے اچھا راستہ ڈھونڈا تھا۔ گھر والے اس کی اس روش سے پریشان تھے۔ سب سمجھا سمجھا کر عاجز آگئے تھے مگر اس کی "ناں" کو "ہاں" میں نہ بدل سکے تھے۔ چھ مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے وہ عمیر سے جتنا دور بھاگتی عمیر اتنا ہی اس کے قریب آرہا تھا۔ عمیر محسوس کرتا کہ وہ کو ہمیشہ سے اس کے قریب تھا۔ مگر جذبوں کو زبان نہ ملی تھی اور چند کمزور لمحوں کی جذباتیت نے وقتی دوریاں پیدا کردی تھیں۔ اور اب۔

عمیر مریم کے لئے اپنے دل میں وہ جذبات پاتا جو کبھی اس نے نرجس کے لئے بھی محسوس نہ کئے تھے۔

ملنے پاکیزگی کے ساتھ محبت کا تصور ہی کتنا اچھوتا اور مقدس ہے۔

ان چھ مہینوں میں اس نے ایک ایک کی خوشامد کی تھی مگر مریم کے دربار میں کسی کی شنوائی نہ ہوتی تھی۔۔۔ گھر کے مرد تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے تھے۔ کہ جب تم سب کے بھوت اتر جائیں تو اطلاع کردینا پتہ نہیں یہ ڈرامہ بازی ہمارے گھر میں کہاں سے پیدا ہوگئے۔۔۔۔

وہ زیادہ تر دادی ماں کی خوشامد میں لگا رہتا تھا۔

"دادی ماں خدا کے واسطے مریم سے میرے گناہ ایک مرتبہ بخشوادیں۔ ساری زندگی گناہ نہیں کروں گا۔"

وہ دادی اماں کے پیر دبا رہا تھا۔

"بیٹا وہ بھلی تمہارا جواب ہے سب ہار گئے وہ کسی کی نہیں سنتی۔"

دادی اماں نے آنکھیں بند کرکے ٹھنڈا سانس لیا۔

"دادی ماں کسی دن غصہ آگیا نا تو دیکھنا ایک گولی اس کے سینے میں اتار دوں گا اور ایک اپنے سینے میں نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

وہ جوش میں بولا۔

"ویری گڈ... ویری گڈ حویلی کے تمام شرفائ کے لئے یہ بہترین آئیڈیا ہوگا۔"

منیر بھائی پتہ نہیں کہاں سے آگئے تھے...

"اڑالو مذاق برا وقت پڑا ہے نا منیر بھائی تم میں سے کوئی نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔"

عمیر درد بھری آواز میں بولا۔

"نہ رومیرے چندا نہ رو اللہ تم جیسے کوؤں کے ساتھ بھی ہے جو ہنس کی چال چلتے ہیں اور اپنی بھول جاتے ہیں۔ بیٹا اسی دن کے لئے سمجھاتے تھے وہ سراب ہے اس کے پیچھے مت بھاگو....."

منیر بھائی نے اس کی ٹھوڑی ہلائی۔

"یار اگر آپ مدد نہیں کر سکتے تو پلیز! مجھے چڑائیں بھی مت۔"

وہ کھسیا رہا تھا۔

"تم کس مرض کی دوا ہو ایک لڑکی تمہارے قابو میں نہیں آ رہی۔"

صدف باجی کو بھی ابھی آنا تھا۔

"کیا بتاؤں صدف باجی وہ تو کسی طرح صفائی کا موقع نہیں دیتی اُسے قابو میں کیسے کروں۔"

عمیر نے لاشعوری طور پر اپنا دایاں رخسار سہلایا... اگر وہ یہ بتا دیتا کہ ایک عدد تھپڑ سے بھی نوازا گیا ہے تو اس کا ریکارڈ لگ جاتا۔

"برخوردار یہ ہمارے یہاں کی لڑکیاں ہیں پکے آم کی طرح کسی کی جھولی میں نہیں گرتیں۔"

منیر بھائی نے فخر سے کہا۔ عمیر سر کھجا کر رہ گیا۔

ادھر مریم کے بھیرے ہوئے جذبات ابھی تک ٹھنڈے نہ ہوئے تھے... دن بھر وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتی مگر جب رات آتی تو

دن تو کٹ جاتا ہے فرصت میں کسی طرح سے
رات آتی ہے تو بس آ کے ٹھہر جاتی ہے
نیند تو خیر ان آنکھوں کے مقدر میں نہیں
کیا شب غم میں کہیں موت بھی مر جاتی ہے

وہ اپنے آپ کو بہلا رہی تھی۔

دھوکا دے رہی تھی۔

وہ سمجھتا ہوگا نا کہ میں واپس آؤں گا تو مریم میرے سر تاج کہہ کر میرے قدموں سے لپٹ جائے گی۔

میں ایک دفعہ معافی مانگوں گا وہ سو دفعہ معاف کر دے گی مگر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ مریم مر جائے گی اس کے نام پہ زندگی گزار دیگی مگر اس سے شادی ہرگز نہیں کرے گی۔ وہ بے بس ہوتی مریم کو نئے سرے سے تسلیاں دیتی کیونکہ گھر والوں کا مسلسل اصرار عمیر کی بے قراریاں خود اس کے اندر کا طوفان.... وہ تنہا مقابلہ کر رہی تھی۔

مگر جب سب ناکام ہوگئے تو ایک قدرتی سبب نکل آیا۔

دو تین موسم گلے مل رہے تھے اور ان کی لپیٹ میں دادی ماں بری طرح آگئیں... اتنا تیز بخار چڑھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے... پوری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ ہر کوئی ان کی پٹی سے لگا بیٹھا تھا۔ ڈاکٹروں کی لائن لگی تھی ایسے ہنگامے میں مریم اور عمیر کا خوب سامنا ہوا۔ دادی ماں کے پیچھے کسی کو ہوش نہ تھا۔ وہ ایسی شفیق ہستی تھیں جو بیٹے بیٹیوں ہی کے لئے نہیں بہوؤں کے لئے بھی محبت و خلوص کا دامن کشادہ رکھتی تھیں وہ سب کی ماں تھیں ہر ایک کے لبوں پر ان کے لئے دعائیں تھیں۔ خدا خدا کر کے ان کا بخار اترا اور وہ تھوڑی بات کرنے کے قابل ہوئیں۔ تو سب سے پہلے انہوں نے مریم کو یاد کیا۔

"بیٹا زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

دادی ماں نے تمہید ہی باندھی تھی کہ مریم نے ان کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسی باتیں نہ کریں دادی ماں۔ آپ کا سایہ خدا ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"نہیں بیٹا موت تو برحق ہے پر وہ انسان کتنا خوش نصیب ہے جو دنیا سے دل و دماغ پہ کوئی بوجھ لے کر نہ جائے... میں اپنے تمام بچوں کی طرف سے مطمئن ہوں مگر ایک خلش اور تڑپ مجھے چین نہ لینے دیتے ہیں۔

دیکھو بیٹا خطا انسان سے ہوتی ہے لیکن جب وہ سچے دل سے معافی مانگ لے تو دل بڑا رکھنا چاہیئے۔ اس کو معاف کر دینا۔ وہ سانس لینے کے لئے رکیں۔ کمرے میں ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی۔ مریم ہاتھ مسل رہی تھی۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کے صبیح رخساروں سے بے تحاشا پھسل رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ مچل جاتی، بگڑ جاتی اس سلسلے میں ایک لفظ بھی سننے کی روادار نہ ہوتی مگر دادی ماں کی بیماری نے اُسے بھی نرم دل بنا دیا تھا واقعی زندگی اور موت کا کیا بھروسہ.... کس وقت کس کے ساتھ

جائے۔ جو وقت بھی اچھا گزر جائے غنیمت ہے وہ بھی تو اپنی ماں کے لئے عمیر کے لئے سب کے لئے مہینوں سے مسئلہ بنی ہوئی تھی.... حالات نے اسے کیٹر بنا دیا تھا اور یوں وہ حق بجانب بھی تھی۔ مگر اب تو حالات کافی خوشگوار ہو گئے تھے حویلی کی کھوئی ہوئی خوشیاں دوبارہ مل گئی تھیں۔ سب کی دلی خواہش تھی جس نے فضا میں ایک تعطل پیدا کر دیا تھا اور حویلی کے ماحول میں بوجھل پن تھا۔

دادی ماں نے ہنکارا بھرا تو اس کے خیالات کی کشتی سوچ کے سمندر میں غوطہ مار کر سطح آب پہ ابھر آئی۔

"عمیر نے جو بھی حماقت کی وہ اس پہ بے انتہا شرمسار ہے نادم ہے اس نے سب سے سچے دل سے معافی مانگی ہے بیٹا.. جوان خون تھا اکڑ جاتا تو یہ نہ سہی اس جیسی کوئی اور اٹھا لاتا یا ناکامی سے اس قدر دل برداشتہ ہوتا کہ واپس ہی نہ آتا اور وہیں گناہوں کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا پھر ہم کیا کر لیتے۔ یہ وہ کچھ سوچ کر ہی تو گھر آیا ہو گا منہ چھپا کر تو نہیں بیٹھ گیا.... وقتی طور سے بہک گیا تھا مگر اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے نا بیٹا اس لئے وہ ایمان سلامت لے آیا ہے.... تو نے دیکھا نہیں میرے بچے کے چہرے پر ابھی بھی وہی معصومیت ہے چھ مہینے سے میرے پیچھے پڑا ہے کسی طرح مریم سے معاف کرا دو.... اسے معاف کر دے میری بچی اسے معاف کر دے ہم اپنے بگڑے بچوں کو اگر سینے سے نہیں لگائیں گے تو پھر وہ کہاں جائیں گے پھر وہ بگڑ جاتے ہیں نا بیٹا.... اسے معاف کر دے.... میرے کہنے سے.... صرف میرے کہنے سے۔ میں تیرا برا تو نہیں چاہوں گی نا...."

دادی ماں نے مریم کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کے زخموں پر جیسے کسی نے ٹھنڈے پھاہے رکھ دیئے ہوں.... وہ تڑپ کر رو دی....

"دادی ماں آپ جیسا کہیں گی ویسا ہی کروں گی۔"

وہ بری طرح رو رہی تھی۔

عمیر کمرے کا پردہ تھامے کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا وہ دوائی دینے دادی ماں کے پاس آ رہا تھا۔ مگر مریم اور انہیں گفتگو کرتے دیکھ کر اس کے قدم جم گئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو جی بھر کے ملامت کی ذرا سی جذباتیت اور حماقت سے اس نے ان سب کو کتنے دکھ دیئے تھے.... ندامت کے آنسو اس کی آنکھوں میں آ گئے.... وہ چپکے سے کمرے میں آیا دوائیاں زور سے میز پر رکھیں متوجہ کرنے کے لئے۔ مریم نے اور دادی ماں نے چونک کر دیکھا عمیر کھڑا تھا۔

مریم کی نگاہیں عمیر سے ملیں۔

ایک آنکھ میں عرق انفعال تھے۔!

دوسری آنکھ میں درگزر کے موتی!!

مریم سے کھڑا نہ ہوا گیا وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"عمیر بیٹا مریم سے معافی مانگ لے.... معافی مانگنا شرم کی بات نہیں ہوتی چاند.... اس میں چھوٹا بڑا نہیں دیکھتے جس کی خطا ہو اسے آگے بڑھ کر معافی مانگ لینی چاہیئے۔ اس سے دلوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔"

دادی ماں کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو دائیں بائیں تکیہ بھگو رہے تھے۔

"دادی ماں میں تو چھ مہینے سے ہاتھ جوڑے پھر رہا ہوں مگر یہ لفٹ ہی نہیں کرا رہیں۔"

عمیر ایک دم سے مریم کی کرسی کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اس نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

"معاف کر دو مریم جی!"

اس نے دھیرے سے پیار سے نادم سے لہجے میں کہا۔

مریم کا دل اتنا بھرا ہوا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی.... ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔

"اچھا چلو ایک تھپڑ اور مار لو مگر مان تو جاؤ۔"

عمیر نے دوسرا گال بھی پیش کر دیا اس کی آنکھوں میں شرارت بھی تھی اور شکوہ بھی۔ مریم ایک دم جھینپ گئی جلدی سے اس کے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ دیئے وہ اسے معصوم سادہ بچہ لگا جو تتلی کے پیچھے بے تحاشا دوڑا تھا مگر منہ کے بل گرا تھا اور اب چوٹوں پر مرہم لگوانا چاہ رہا تھا.... ایسا بچہ جس سے انجانے میں کوئی شرارت سرزد ہو گئی ہو اور وہ اپنی خطا پر پشیمان ہو.... مشرق کی فراخدلی اور پاکیزگی نے عمیر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا کبھی نہ بکھرنے کے لئے۔

"کٹ" پیچھے سے کئی آوازیں ابھریں ساتھ ہی شیطانوں کی ٹولی دھم دھم کرتی اندر گھس آئی یاسمین نے یہ تماشا دیکھا تھا اور سب کو بلا لائی تھی۔

بازی مات ہوئی

فوزیہ خان

کھلے آنگن میں پیپل کے چھوٹے سے درخت کے نیچے بچھے ہوئے ڈھیلے سے پلنگ پر وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے یونہی لیٹی تھی۔ بس ایک ٹک درخت سے گرتے سوکھے پتوں کو دیکھ رہی تھی جو ہوا کے زور سے ٹوٹ ٹوٹ کر آنگن میں پھیل رہے تھے۔ یہ سب یونہی ہوتا ہے تارہ بیگم اور ہوتا رہے گا۔ اس نے خود ہی دل میں سوچا اور پھر تم بھی تو اک سوکھے پتے کی مانند اس آنگن میں آ گری ہو۔ ہرے بھرے درختوں سے بہت دور پچھلے ایک مہینے میں اس کی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب آگیا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے۔ دروازے پر زور سے دستک ہوئی مگر وہ یوں ہی ساکت لیٹی تھی، سوچوں میں گم دروازہ دوبارہ زور سے بجا اور اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے جلدی سے بیٹھتے ہوئے آنکھوں میں آتے ہوئے آنسو دوپٹے سے پونچھے جو معلوم نہیں کب چپکے سے بہہ نکلے تھے۔

آجائیے ماموں میاں دروازہ کھلا ہے۔ اس نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ دروازہ آواز کے ساتھ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔

”آپ!“

تارہ کے منہ سے صرف یہی نکلا۔ خوف کے مارے اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ مگر وہ یونہی چٹان کی طرح دروازے کے بیچ میں خاموش کھڑا تھا۔ تارہ کو اس کی خاموشی سے خوف محسوس ہونے لگا

”یہاں کیا لینے آئے ہیں آپ؟“

اس نے حواس جمع کر کے بڑی ہمت سے پوچھا۔ مگر وہ اب بھی خاموش اپنی گہری گہری آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ زور سے چیخے چلائے۔ مگر اس کی آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ دروازے سے دو قدم آگے بڑھا۔

”میں تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں تارہ کہ تم کس کی اجازت سے یہاں آئی ہو؟“

وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نہایت کرخت آواز میں بولا۔ تارہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

”تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟“

وہ کیپ اتارتے ہوئے چیخا۔

”مجھے اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے کیپٹن علی۔“

وہ نہایت حقارت سے بولی۔

”شاید تم یہ بھول رہی ہو تارہ کہ تم میری منگیتر ہو۔“

وہ غصے سے بولا۔

”معاف کیجئے گا کیپٹن علی، میں وہ رشتہ توڑ کے یہاں آئی ہوں۔“

وہ طنز سے بولی۔

”کس نے دیا ہے تمہیں وہ رشتہ توڑنے کا حق؟“

وہ پھر دھاڑا۔

”میں اپنے ہر معاملے میں خود مختار ہوں۔“

وہ دھیمے لہجے میں بولی

”نہ جانے اس میں اتنی باتیں کرنے کی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔

”تو تم اس طرح باز نہیں آؤ گی۔“

علی منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ غصے میں اس کا رنگ اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت گھر لے کر جاؤں گا۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”میں..... میں اس گھر میں کبھی نہیں جاؤں گی۔“

تارہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو تارہ کہ علی آفندی کے فیصلے کسی صورت میں نہیں بدلا کرتے۔ یاد رکھو تارہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو مجھ سے نہیں چھین سکتی۔ اور تم اس گھر میں ضرور آؤ گی۔ تمہاری شادی علی کے علاوہ کسی سے نہیں ہو سکتی۔“

وہ دیوانوں کی طرح بولے جا رہا تھا اور اس کی آ

شعلے برسا رہی تھیں۔ بولتے بولتے وہ چند لمحوں کو رکا۔

"میں اس گھر میں۔"

تارہ نے ہمت کر کے زبان کھولی مگر اس کے جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی علی دھاڑا۔

"ہاں ہاں اسی گھر میں۔ وقت آنے دو تارہ دیکھ لوں گا میں سب کو۔"

وہ غصے سے پیر مار کر بولا۔ پھر چند سیکنڈ کچھ سوچا اور دروازے کو لات مار کر کھولتا ہوا باہر نکل گیا

"رک جاؤ آفی۔ رک جاؤ۔"

تارہ سسکتے ہوئے بولی مگر وہ تو کب کا جا چکا تھا۔

اس کے جاتے ہی آنسوؤں کا نہ رکنے والا سیلاب اس کی آنکھوں سے امنڈنے لگا۔ ڈھیروں آنسو گالوں سے پھسل پھسل کر نیچے گرنے لگے اور آنسوؤں کی دھند سے اس کا حسین ماضی جھلکنے لگا۔

"امی.... امی تارہ رو رہی ہے۔"
ننھی دانش نے پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟"
سبزی کاٹتے کاٹتے انھوں نے پوچھا۔

"امی، آفی بھیا نے ان کی گڑیا جو توڑ دی۔"
اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

"امی۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ جھوٹی کہیں کی۔"
قریب کھڑے آفی نے دھپ سے اس کی کمر پر ایک مکہ جڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے امی یہ آفی بھیا۔"
دانش منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"علی، خدا کے واسطے بیٹا اب تم اتنے بچے تو نہیں۔ کیوں تنگ کرتے ہو بہنوں کو۔"

"واہ امی۔ میں نے کیا کیا ہے بھلا۔"
وہ منہ پھلا کر بولا۔

"آپ نے تارہ کی گڑیا نہیں توڑی؟"

"چپ رہو تم جھوٹی۔"
وہ دانش کی طرف آنکھیں نکالتا ہوا بولا

"اچھا ذرا قسم تو کھائیے آپ نے نہیں توڑی۔"
دانش اس کے کندھے پر لٹکتے ہوئے بولی

"ہاں۔ توڑی ہے میں نے۔"
وہ اسے دھکا دیتے ہوئے بولا۔ امی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔

"کیوں توڑی ہے بیٹا تم نے؟"
پھوپو جان جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی تھیں اچانک بولیں۔

پھوپو جی دیکھئے نا۔ یہ تارہ کی بچی ہے نا اس کو ہزار بار منع کیا ہے کہ برابر کے مکان والا اسعاد ہے نا وہی اُلّو جیسی آنکھوں والا اس سے مت بات کیا کرو۔ مگر یہ مانتی ہی نہیں۔ آج اس اُلّو نے اسے گڑیا دی اور تارہ نے لے لی۔ بس میں نے چھین کر توڑ دی۔"
وہ پھوپو کے گلے میں بانہیں ڈالتا ہوا بولا

"اچھا اب یہاں سے جاؤ بھی۔"
امی جان اسے گھورتے ہوئے بولیں، وہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر جلدی جلدی مٹر کے دانے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔

"ارے کھانے دو بھابی۔ کیوں ٹوکتی ہو۔"
پھوپو فوراً اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولیں۔ اور وہ بدتمیز ذرا سی شہ پا کر مٹھی بھر دانے جیب میں ٹھونستے ہوئے باہر نکل گیا۔

آفی گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ ذرا سی دیر کے لئے آنکھوں سے اوجھ ہوجاتا تو دادی اماں کو گھبراہٹ ہونے لگتی۔ پھوپیوں کا کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا اور امی کا یہ حال تھا کہ اسکول سے آنے میں ذرا دیر ہو جاتی دروازے پر کھڑی ہو جاتیں۔ باپ اور چچا کی آنکھوں کا تا تھا۔ آفی کے اتنے لاڈ پیار کی وجہ دراصل یہ تھی کہ سارے ددھیال میں وہ اکیلا ہی لڑکا تھا۔ بڑی پھوپو کے تین بیٹیاں، چھوٹی پھوپو کے ایک بیٹی۔ چچا کے ایک بیٹی، چھوٹے چچا کے کوئی بچہ ہی نہ تھ پھر خود اس کی دو بہنیں موجود تھیں۔ لڑکیوں کی اتنی بڑی فوج کے درمیان وہ اکیلا لڑکا تھا پھر کیوں نہ سارے گھر بھر کا لاڈلا ہ اس کی ہر ضد پوری کی جاتی۔ وہ بچپن ہی سے اپنی ہر بات منوانے عادی تھا اور اس بے جا لاڈ پیار نے اسے خودسر بنا دیا تھا۔ دا ابو نے اس کا نام علی آفندی رکھا تھا۔ مگر نام اتنا لمبا چوڑا تھا کہ گھر کے سارے بڑوں کے لئے علی اور سارے چھوٹوں کے ل آفی بھیا بن گیا تھا۔ کسی بات پر اڑنا اور ضد کرنا اس کی طبیعت میں بچپن ہی سے رچ بس گیا تھا۔ بے چاری لڑکیاں اور گھر ملازم اس کی ہر شرارت کا نشانہ بنتے تھے۔ پھوپو کی بیٹیاں اور خو اس کی بہنیں تو موقع دیکھ کر اس کا بدلہ لے لیتی تھیں مگر زمان کی تارہ تو سدا کی ڈرپوک تھی اور آفی کی زیادہ تر شرارتوں کا نشا وہی بنتی تھی۔ بزدل ایسی کہ ڈر کے مارے شکایت بھی نہیں کرتی ماں باپ کی غیر موجودگی نے اسے یونہی ڈرپوک سا بنا دیا تھا۔ گو دادی پھوپیوں نے پیار سے رکھا مگر ماں باپ کی محرومی کو نظرا نہ کر سکی۔ کیونکہ بچپن ہی سے ماں باپ کے سائے سے محروم ہوگئی لہٰذا تمام زندگی ماں باپ کے پیار کی پیاسی رہی اور دادی پھوپو کی لاکھ محبت و شفقت بھی اس کی پیاس کو نہ بجھا سکی۔ شام کو جب تایا ابو اور پھوپھا جان گھر کو لوٹتے اور ارم، دانش، شیریں وغیرہ تالیاں بجا بجا کر ابو آ گئے۔ ابو آ گئے کا شور مچاتیں تو اس کا بھی بے ساختہ جی چاہتا کہ وہ بھی تالیاں بجا بجا کر چلائے۔ مگر اس ابو تو جانے کہاں کھو گئے تھے۔ اب تو اس نے دادی اماں سے پو بھی چھوڑ دیا تھا کہ دادی اماں میرے ابو کیوں نہیں آتے۔ اور پر بیٹھی تسبیح کے دانے کھڑکھڑاتی دادی اماں ڈبڈبائی آنکھو اس کی طرف دیکھتیں اور اس کی پیشانی چوم لیتیں اور پھر جھٹ پھوپو اسے گود میں اٹھا کر کوئی بھی کہانی سنانا شروع کر د اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنے سوال کا جواب نہ لے پاتی۔ آفی ان س

لڑکیوں سے بڑا تھا۔ کسی سے دو سال کسی سے چار سال۔ تارہ اور شیریں ہم عمر تھیں اور آفی سے تقریباً دس سال چھوٹی تھیں۔ شیریں بچپن ہی سے بلا کی شریر تھی۔

"تارہ... او... تارہ کی بچی اٹھ نا جلدی سے۔"

شیریں اور دانش نے دبی دبی آواز میں کہا۔ اور وہ جھٹ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" اس نے حیرت سے اُن دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آفی بھیا کہاں ہیں؟"

اس نے خوف سے پوچھا

"ارے وہ تو سو رہے ہیں"

دانش نے جواب دیا۔

"مگر پیڑ پر کون چڑھے گا؟"

ارے بابا! سعاد باہر کھڑا ہے۔" دانش غصے سے بولی

"نہیں نہیں۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔" آفی بھیا ماریں گے۔"

تارہ نے پھر جواب دیا۔

"بے وقوف۔ آفی بھیا تو سو رہے ہیں۔"

دانش نے جھنجلاتے ہوئے کہا

"اگر انھیں پتہ چل گیا تو وہ مجھے نیلی آنکھوں اور کالے بالوں والی گڑیا کبھی لاکر نہیں دیں گے۔"

"تم بہت بے وقوف ہو تارہ۔ وہ بھیا تو تمھیں یونہی بیوقوف بناتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ہم چلے جاتے ہیں مگر تمھیں ایک کیری بھی نہیں ملے گی۔"

شیریں نے کہا اور وہ دونوں باہر نکل گئیں۔ اور تارہ کافی دیر تک آنکھیں بند کیے نیلی آنکھوں والی گڑیا کو دیکھتی رہی۔ جو علی نے لانے کا وعدہ کیا تھا

○

یونہی لڑتے جھگڑتے کھیلتے کودتے دن گزرتے گئے اور بچپن رخصت ہوا۔ بچے بڑے ہو چکے تھے۔ اب وہ توتلی زبانوں سے بولنے والی تارہ اور شیریں تک فرسٹ ایئر میں آ گئی تھیں۔ تایا ابو کی ارم اور دانش تھرڈ ایئر میں، بڑی پھوپھو کی عالیہ شمع انٹر میں اور رخشی تھرڈ ایئر میں پہنچ گئے تھے اور وہ بدتمیز ضدی سا آفی بی۔ ایس سی کر کے تایا ابو کی زمینوں کی طرف لگ گیا تھا۔ بلکہ لگ کیا گیا تھا زبردستی لگا دیا گیا تھا۔ اس کی ضد کا اب بھی وہی عالم تھا۔

ارم کچھ سنا تم نے؟"

ناخن پر کیوٹیکس لگاتی ہوئی عالیہ نے ارم کو مخاطب کیا جو نہ جانے باہر کھڑکی میں کافی دیر سے کسے دیکھ رہی تھی۔

"کس بارے میں؟"

اس نے وہیں سے جواب دیا۔

"سنا ہے اس بار آفی بھیا جب زمینوں سے لوٹیں گے تو تارہ کے لئے زبردست سی گڑیا ضرور لائیں گے۔"

اس نے جواب دیا اور سامنے ہی قالین پر بیٹھی میگزین دیکھتی تارہ بری طرح جھینپ گئی۔ قریب ہی بیٹھی شیریں نے زبردست قہقہہ لگایا۔

تارہ یاد ہے جب آفی بھیا پہلی بار زمینوں سے واپس آئے تھے اور انھوں نے آتے ہی تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے کہا تھا کہ میرا سوٹ کیس ذرا سنبھال کے رکھنا اس میں بڑی نازک چیز ہے تو تم نے گڑیا سمجھ کر بکس کی کتنی حفاظت کی تھی۔

ارم بولی "ہائے ارم بس بھی کرو۔ کیوں شرمندہ کر رہی ہو بے چاری کو۔"

شیریں پھر ہنستے ہوئے بولی۔ اور تارہ نے ہاتھ کے نیچے دبا ہوا کشن نکال کر دے مارا۔

"مان لو تارہ بیگم کہ تم حد درجہ احمق ہو اور آفی بھیا کے آگے تم مزید احمق بن جاتی ہو۔"

عالیہ بولی اور تارہ کو واقعی خود پر غصہ آنے لگا۔ کتنی آسانی سے یہ آفی کا بچہ بے وقوف بنا لیتا ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

"کن سوچوں میں گم ہو گئیں تارہ۔ فکر مت کرو۔ اس دفعہ تمھاری گڑیا ضرور آئے گی۔"

شیریں نے اس کو پھر چھیڑا اور وہ میگزین قالین پر پھینک کر کمرے سے باہر نکل گئی جہاں دور تک ان سب کے قہقہے اس کا پیچھا کرتے رہے۔ برکھا بہار آئی جیا را مورا ناچے رے..... برکھا بہار رخشی زور زور سے گلا پھاڑ رہی تھی۔ صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے اور معمول کے مطابق دادی اماں نے ان سب کو کالج نہیں جانے دیا تھا۔ رخشی کھڑکی میں کھڑی پچھلے دس منٹ سے برکھا بہار آئی کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔

"رخشی ذرا آہستہ گاؤ نا۔"

ارم نے زور سے کہا کیونکہ اسی کمرے میں ارم اور تارہ بستر میں گھسی باتوں میں مصروف تھیں۔

"تم لوگ فوراً اٹھ جاؤ ورنہ اس سے بھی زیادہ زور سے گاؤں گی۔"

وہ بور ہوتے ہوئے بولی

"غضب خدا کا ارم جی۔ جلدی سے اٹھ کھڑی ہو۔"
شیریں اور شمع تیر کی طرح کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں
"ارے بابا ہوا کیا ہے؟"
ارم گھبرا کر بولی۔
"ارم صاحبہ۔ اس رومیو کی فیملی تمہیں دیکھنے آ رہی ہے۔"
برکھا بہار کو زبردست بریک لگا۔
"واقعہ کچھ یوں ہے ارم جی کہ پچھلے سنڈے جو زینب آنٹی کے گھر ڈنر تھا اور ہم سب جو اس فارنر کا زبردست ریکارڈ لگا رہے تھے تو وہ بدبخت تو زبردست رومیو ثابت ہوا اور ارم جی کا وہ چنچل پن اسے گھائل کر گیا مزید اطلاعات کے مطابق عرض ہے کہ موصوف زینب آنٹی کے چہیتے دیور ہیں اور پندرہ دن پہلے ہی بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم سے فارغ ہو کر باہر سے تشریف لائے ہیں۔"
شیریں بغیر اسٹاپ کے بولے جا رہی تھی۔
"تم لوگ جھوٹ بول رہی ہو۔"
ارم بڑبڑائی۔
"حد ہو گئی بے وقوفی کی۔"
رخشی کھڑکی پہ پردہ گراتے ہوئے بولی
"شیریں سچ بتاؤ تم لوگ مذاق تو نہیں کر رہیں۔"
تارہ جو ابھی تک آنکھیں پھاڑے حیران سب کچھ سن رہی تھی۔
"اللہ ارم! اب کیا ہو گا۔"
تارہ نے پھر ارم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا
"ہو گا کیا مہندی لگے گی ارم کے ہاتھ پھر ڈھنگ ٹونگ..... ڈھنگ ٹونگ۔"
رخشی بڑے زور سے گانے لگی۔
"پلیز رخشی، تم اس کمرے سے باہر نکل جاؤ۔"
ارم جھلاتے ہوئے بولی۔
"ارے واہ ارم جی صبح سے کوئی موقع کی مناسبت سے گانے نہیں آ رہے تھے۔ اب مجھے اس موقع کے بہت سے گانے آتے ہیں۔"
وہ ارم کو چھیڑتے ہوئے بولی۔
"میں صاف انکار کر دوں گی۔ ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔"
ارم روہانسی ہوتے ہوئے بولی
ارم جی رہنے دو یہ ہم لڑکیاں جو اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا سمجھتے ہیں اور سوچے بنا ہم جو ہر کام کو نہایت آسان اور سہل سمجھتے ہیں نا تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم آپس میں بیٹھ کر بڑی بڑی باتیں کر لیں منصوبے بنا لیں اور عہد کر لیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو ہم سے بے وقوف مخلوق شاید کوئی نہیں ہوتی۔ اس وقت جو تم کہہ رہی ہو کہ انکار کر دوں گی تو جان من انکار کی صورت تو جب ہو سکتی ہے جب تم سے پوچھا جائے۔ تم کو کوئی اتنی اہمیت ہی نہیں دے گا اور فرض کرو بڑے ماموں نے پوچھا بھی تو یہی انکار کی رٹ لگانے والی بولڈ سی ارم نگاہیں نیچی کیے سر پہ دوپٹہ لٹکائے بے وقوفوں کی طرح بیٹھی ہو گی اور بڑے ماموں اس خاموشی سے رضامندی کا پہلو نکال کر شادی کی تاریخ تک طے کر دیں گے۔"
شیریں نے اپنی تقریر ختم کی تو ارم جل تھل آنکھیں لیے باتھ روم میں گھس گئی۔
اور پھر واقعی ہوا بھی یہی کہ وہ پرزور مخالفت کرنے والی ارم نہایت خاموشی سے اسی اعظم سے منسوب ہو گئی۔ اور کمینہ قسم کا اعظم اسے جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا۔ جب بھی دوپہر میں گھر کے سب بڑے آرام کرتے یا سو جاتے تو ارم ٹیلیفون پر اعظم سے گھنٹوں گپیں لگاتی۔ کبھی تارہ یا دانش یا شیریں کا اتفاقاً وہاں سے گزر ہوتا تو وہ سوچتی ہی رہ جاتیں کہ واقعی یہ لڑکیوں کی قوم بھی عجیب ہوتی ہے۔ کل تک کا لفنگا اعظم آج اس بدبخت ارم کی زندگی بنا ہوا ہے۔
سعاد اور عالم ان سب کے ساتھ بچپن ہی سے کھیلتے تھے۔ اور دونوں کے گھر میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ تایا ابو بھی آفی کی غیر موجودگی میں لڑکیوں کو ان کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے۔ آخر کو یہ سب بچے ایک ہی ساتھ پلے بڑھے تھے۔ ان سے چڑ تھی تو بس آفی کو وہ بچپن سے سب سے لڑتا جھگڑتا آیا تھا۔ آج بھی وہ لوگ اجازت لے کر سعاد کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی تھیں واپسی میں راہداری کراس کر کے جونہی ڈرائنگ روم میں قدم رکھا لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ سامنے ہی صوفے پہ آفی براجمان تھا۔
"آفی بھیا"
ارم اور دانش بے اختیار اس کی طرف لپکیں۔ گھر کے سب ہی افراد ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ آفی کو یوں بیٹھا دیکھ کر تارہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح آفی کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی زبردست چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ سعاد اور عالم بھی سب سے مل کر صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔ آفی ابھی تک آف سا تھا۔
"اللہ بتائیے نا آفی بھیا آپ کب آئے؟"
شیریں ان کے کندھے ہلاتے ہوئے بولی
"آپ لوگوں کو کیا۔ آپ اپنے سیر سپاٹوں میں لگی رہیں۔"

آفی بے زاری سے بولا اور یہ سنتے ہی تارہ کا تو جیسے دم ہی
نکل گیا۔ وہ جلدی سے دادی اماں کے پاس دیوان پر بیٹھ گئی۔
"حد ہو گئی۔ آفی بھلا آج تو نکلے ہیں ہم مدتوں بعد اور آپ ہیں کہ"
رخشی جملہ ادھورا ہی چھوڑ گئی۔
"بھئی اب مجھے کیا پتہ میرے پیچھے کیا کیا تفریحیں ہو رہی ہیں"
اس نے سخت چبھتے ہوئے لہجے میں کہا، صرف تارہ کو سنانے
کے لئے کیونکہ تایا ابو اور چچا تو سعاد اور عالم سے باتوں میں مصروف تھے
تارہ کے ہوش اڑانے کو یہ بہت کافی تھا۔ جونہی دادی اماں نماز کے
لئے اٹھیں۔ گھر کے اور بڑے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔
"بھئی اب تم لوگ باتیں کرو"
چچا مسکراتے ہوئے بولے اور کمرے سے نکل گئے۔
تارہ دیوان پر سے اٹھ کر اندر جانے کو مڑی۔
"ارے ارے مس اسٹار۔ کہاں چلیں۔ یاد ہے آپ نے
کیا کہا تھا؟"
سعاد جو عموماً تارہ کو اسٹار کہا کرتا تھا بولا
"میں ... میں نے کہا تھا"
تارہ سہمتے ہوئے بولی
"واہ بھئی واہ۔ یعنی آپ کو یاد نہیں آپ نے کہا تھا کہ ہم
آپ کے ساتھ اندر چلیں۔ آپ ہمیں فرسٹ کلاس سی کافی بنا کر
پلائیں گی۔"
عالم اسے یاد دلاتے ہوئے بولا۔
تارہ کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔
"میرا خیال ہے آج تارا کا موڈ بالکل نہیں ہے لہذا آج انہیں
بخش دیا جائے۔"
سعاد کھڑا ہو کر بولا "جیسی تمہاری مرضی۔ چلو پھر کبھی سہی"
عالم نے بھی اس کی تائید کی "او کے علی اب ہم چلتے ہیں"
سعاد نے علی سے ہاتھ ملانے کو آگے بڑھایا۔
"ارے اتنی جلدی بیٹھو یار۔ تم لوگوں کے تو کافی وغیرہ کے
پروگرام تھے۔"
علی تارہ کو سناتے ہوئے بولا
"نہیں بھئی۔ آج تارہ کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں۔ شاید تھکن کی
وجہ سے پھر کبھی سہی"
سعاد ہنستے ہوئے بولا۔
"اس گھر میں سب کے موڈ تو آف ہونے ہی ہیں میں جو آ گیا
ہوں" اس نے سخت جلانے والے انداز میں کہا اور تارہ تیزی سے
کمرے سے باہر نکل گئی۔

آفی کو گھر آئے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ مگر اس نے اب
تک تارہ سے بات نہیں کی تھی۔ پہلے دن کے واقعہ کے بعد سے
وہ تارہ سے سخت ناراض تھا۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ اس میں بھلا
تارہ کا کیا قصور ہے۔ دوسری طرف تارہ بھی رو رو کر ہلکان ہوئے
جا رہی تھی۔ اسے یوں ہر وقت رونا بسورتا دیکھ کر شیریں جھنجلا گئی۔
"کمال کرتی ہو تارہ تم بھی۔ اب بھلا یوں بسورنے کی کیا ضرورت
ہے۔ تم مجھ سے لکھوا کر رکھ لو تارہ۔ آفی بھیا منگنی تو توڑنے سے رہے
پھر کیوں خواہ مخواہ ہلکان ہو رہی ہو۔
وہ روتی ہوئی تارہ کا منہ اونچا کرتے ہوئے بولی۔
"مگر میرا اس میں قصور ہی کیا تھا؟"
تارہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔
"ہاں تو تارہ کہ آفی بھیا تم سے بڑی جارحانہ قسم کی محبت
کرتے ہیں"
رخشی اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔
وہ یہ نہیں چاہتے کہ تم کسی اور کو ذرا بھی توجہ دو اور اس غریب
سعاد سے تو بچپن ہی سے خار کھاتے ہیں"
دانش اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔
"مگر اب میں کیا کروں؟"
تارہ پھر روتے ہوئے بولی۔
"تمہیں تو پتہ ہے تارہ دادی اماں کہتی ہیں آفی بھیا بالکل تایا
چچا مرحوم (تارہ کے والد) پر گئے ہیں اور زمان چچا اگر کبھی کسی سے الجھتے
تھے تو کبھی اپنی غلطی نہیں مانتے تھے جبکہ بے قصور خود ان سے معافی
مانگ لیتا تھا۔ بس اب تم بھی رونا دھونا بند کرو اور آفی بھیا سے معافی
مانگ لو"
ارم نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔
فجر کی نماز پڑھ کر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آفی اکیلا لان
میں ٹہل رہا تھا۔ یہ موقع سب سے غنیمت ہے۔ تارہ نے دل میں سوچا
اور برابر کی مسہری پر بے خبر سوئی ہوئی شیریں پر ایک نظر ڈالی اور آہستہ
سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ آفی
کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ آفی نے اسے دیکھ لیا تھا مگر اسی طرح ٹہلتا
رہا۔ اس سے کچھ نہ بولا۔
"آفی۔ مجھے معاف کر دیں"
وہ بڑی ہمت کر کے بولی۔
اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"آفی پلیز مجھے معاف کر دیں نا۔"
وہ آفی کو دوسری طرف منہ کرتا دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔
"کس بات کی معافی مانگی جا رہی ہے یہ؟"
اس بار وہ سیدھا اس کے سامنے کھڑا ہو کر سخت لہجے میں بولا۔ تارہ کا تو جیسے دم ہی نکل گیا۔
"وہ آپ مجھ سے ناراض ہیں نا۔"
وہ ہکلاتے ہوئے بولی
"بہت جلدی خیال آ گیا آپ کو میری ناراضگی کا۔"
وہ اسی لہجے میں پھر بولا۔ تارہ کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو بھر آئے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ وہ بھی چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔
"کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو تارہ۔ جاؤ تمہیں فرصت ہی کب ملتی ہے لوگوں کی تواضع سے؟"
وہ طنز کے تیر برساتے ہوئے بولا اور اندر جانے کو قدم بڑھائے۔ اب تو تارہ سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔
وہ سسک پڑی
"کیا ہوا اب؟"
آفی نے رک کر پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یونہی روتی رہی۔
"اب کچھ بولو بھی کہ ہوا کیا ہے؟"
آفی ذرا نرم لہجے میں بولا۔ مگر اب بھی تارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"اچھا چلو لڑائی ختم دوستی کر لو۔"
وہ تھوڑے سے توقف کے بعد بولا۔ تارہ نے بے یقینی کے عالم میں منہ اوپر اٹھا کر دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ آفی نے جھک کر اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔
"لاحول ولاقوۃ۔ اتنا ضروری کام تھا کتنا ٹائم خراب ہو گیا۔"
وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی یہ ہمیشہ کی عادت تھی کہ دوسرے آدمی کو ہمیشہ یونہی نظر انداز کرتا تھا۔ تارہ مسکرا دی۔
"ہنسنے کی اس میں کونسی بات ہے۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"
وہ خود بھی مسکراہٹ ضبط کر کے اس کے سر پر ہلکی سی چپت مارتا ہوا بولا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر کی طرف چل دیا۔ اور تارہ حیران و پریشان کھڑی رہی۔
تارہ اور شیریں نے جب گھر میں قدم رکھا تو خلاف معمول بہت سناٹا تھا۔
"کیا بات ہے۔ ہمیں کوئی اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔ پھر یہ خاموشی۔"
شیریں نے گھڑی دیکھی۔
"مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔"
تارہ نے جب ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا مگر وہاں تو اندھیرا تھا۔ اب وہ اپنے بیڈ روم کی طرف پہنچ چکی تھی۔ آسمانی پردہ ہٹا کر تارہ اور شیریں کمرے میں داخل ہو گئیں۔ سامنے ہی ارم اور رخشی منہ لپیٹے لیٹی تھیں۔ سامنے قالین پر شمع اکیلی کارڈ پھیلائے بیٹھی تھی۔
"اوہ گوڈ!"
شمع کے ہاتھ میں تاش کے پتے دیکھ کر وہ دونوں بیک وقت بولیں کیونکہ گھر میں جب بھی کوئی غیر معمولی بات ہوتی شمع فوراً تاش کے پتوں سے فال نکالنے بیٹھ جاتی۔ ارم اور اعظم کا رشتہ ہو گا یا نہیں۔ عمر انکل کا U.S.A کا ٹور کامیاب ہو گا یا نہیں۔ دادی اماں لیٹ شو دیکھنے کی اجازت دیں گی یا نہیں غرض گھر کے ہر مسئلے پر شمع فال کے ذریعے پیشگوئی کرتی تھی۔
"اب کچھ بتا بھی دو شمع۔"
شیریں اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی۔
"مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ وہ اعلیٰ حضرت آفی سے پوچھو جنھوں نے گھر والوں کو بغیر بتائے آرمی جوائن کر لی ہے۔"
"اوہ نو۔"
شیریں دھم سے زمین پر بیٹھ گئی اور تارہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔
"مگر.... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔
"ہو اس طرح سکتا ہے تارا جان کہ وہ جو آفی بھیا عرصے سے زمینوں پہ گئے ہوئے تھے نا۔ وہ سب فراڈ تھا۔"
"ہائے آفی بھیا تجھے خدا سمجھے۔"
شیریں سر پیٹتے ہوئے بولی۔
"شمع دادی اماں کو بتا دیا؟"
تارہ ہمت کر کے بولی۔
ارے ان کا رو رو کے برا حال ہے۔ اور ان دونوں کو کیا ہوا؟"
شیریں ارم اور رخشی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔
"ہونا کیا آفی بھیا کی حمایت میں ڈانٹ کھائی ہے۔"
"جانے یہ دادی اماں اور پھوپھو جان وغیرہ یہ کیوں سمجھ

ہیں کہ اگر دشمن سے جنگ ہوئی تو ان کا آفی ہی میدان میں ہوگا۔ شیریں نے سوچا

"ان نواب صاحب کو دیکھو یہ دھاکہ کر کے خود غائب ہیں۔"

شمع بولی

"میرا تو خیال ہے آفی بھیا نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اب گھر والوں کو اتنا مائنڈ نہیں کرنا چاہیے۔ آخر آفی بھیا کوئی ننھے بچے تو نہیں جو دادی اماں ہمیشہ انھیں سینے سے لگائے رہیں گی۔"

شیریں نے اچھی خاصی تقریر جھاڑ دی۔

"لیکن شیریں دیکھو نا ایک لحاظ سے دادی اماں وغیرہ بھی ٹھیک ہیں۔ آفی بھیا کے علاوہ اور کوئی لڑکا بھی تو نہیں ہے ہماری فیملی میں۔"

شمع گھر والوں کی طرفداری کرتے ہوئے بولی

"اوہ نان سینس۔ تم کیا سمجھتی ہو کیا آفی بھیا آرمی جوائن کرتے ہی مر سکتے ہیں۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ .... کہ .... خیر چھوڑو۔"

شیریں تارہ کا زرد چہرہ دیکھ کر بولی اور کپڑے جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اٹھو بھی اب۔"

اس نے تارہ کا ہاتھ کھینچا

"کہاں ــــ ؟"

تارہ نے حیرت سے پوچھا۔

زبردست ٹریجڈی سین دیکھنے کو ملیں گے گھر میں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم جاؤ میں نہیں جا رہی۔"

تارہ ارم اور رخشی کی مسہری کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں جاؤ۔ تم بھی سر لپیٹ کر سو جاؤ میں تو جا رہی ہوں۔"

شیریں پردہ ہٹاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

آفی نے آرمی جوائن کر لی تھی۔ اس خبر نے پورے گھر میں ہنگامہ مچا دیا تھا۔ مگر وہ بالکل مطمئن تھا۔ بلکہ روز صبح یونیفارم پہن کر دادی اماں کو جو زوردار سلیوٹ کرتا تو بے چاری کو ایسے ہول اٹھنے لگتے جیسے ان کا آفی سیدھا میدان جنگ میں جا رہا ہو۔ مگر اس پر نہ تو دادی اماں کے آنسوؤں کا اثر تھا نہ باپ اور چچا کی ڈانٹ ڈپٹ کا اور نہ ہی ماں اور چچی پھوپیوں کی آہوں اور خدا کے واسطوں کا۔ اب تو وہ لفٹیننٹ ہو گیا تھا اور لڑکیوں پر خوب رعب چلانے لگا تھا جس سے سب عاجز تھیں۔

ابھی آفی کو آئے دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ دوسرے شہر میں پوسٹنگ ہو گئی۔ دادی اماں، اس کی امی اور پھوپیاں تو ایسے روئیں جیسے اس کا میدان جنگ سے بلاوا آ گیا ہو۔ جانے سے ایک دن پہلے اس نے سب لڑکیوں کو مووی بھی دکھائی اور کھانا بھی باہر ہی کھلایا۔ سب کو آفی کے یوں چلے جانے کا افسوس تھا۔ آفی کیا گیا سارے ہنگامے ہی سمیٹ کر لے گیا۔ اب کی دفعہ وہ سب کو اپنے پیچھے روتا چھوڑ کے گیا...... حالانکہ ارم کی شادی نزدیک تھی مگر کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ پھر ارم یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ یہ آفی بھیا یہ کیوں کہہ کر گئے تھے کہ ارم تمہی ہم آرمی والوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیری شادی پر نہ آ سکوں "ہائے خدا نہ کرے۔" ارم نے جلدی سے سر جھٹک کر اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ دیئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

ارم کی شادی بالکل سر پر تھی۔ دونوں طرف تیاریاں زوروں پر تھیں۔ سب ہی آفی کی کمی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ تائی امی، پھوپو جان اور سب گھر والوں نے اسے علیحدہ علیحدہ خط لکھے تھے کہ چھٹی لے کر آ جاؤ۔ دادی اماں نے اپنی طرف سے رخشی سے خط لکھوایا تھا کہ علی بٹیا بہن کی شادی میں ایک ہفتہ پہلے بھی نہ آ سکے تو کب آؤ گے۔ جس کے جواب میں اس نے لکھا تھا کہ آپ کا علی ایسی ملازمت کرتا ہے جہاں بہن کی شادی تو کیا خود اپنی شادی پر بھی چھٹی ملنا مشکل ہے" اس پر دادی اماں وغیرہ کیسا کیسا روئی تھیں

آج ارم کا مایوں تھا۔ سارے گھر میں پیلے پیلے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ لڑکیاں سعاد اور عالم کے ساتھ مل کر خوب ہی ادھم مچا رہی تھیں۔ تارہ دودھ کا گلاس لے کر ارم کے کمرے میں چلی آئی جو پھوپی اماں نے اسے ارم کو پلانے کو دیا تھا۔

"لو بی ارم یہ پی لو۔"

وہ ارم کے نزدیک آ کر بولی۔

"ارے یہ تم رو کیوں رہی ہو؟"

تارہ اس کے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر بولی

"تارہ آفی بھیا"

ارم سسک پڑی اور تارہ کے گلے لگ کر رونے لگی اور تارہ جو کئی دنوں سے ڈھیر سارے آنسو پلکوں کے پیچھے چھپائے پھر رہی تھی ارم کے روتے ہی وہ بھی رو دی۔ ارم تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ آفی جس سے وہ ہمیشہ پناہیں مانگا کرتی تھیں۔ ہمیشہ ان کے پروگرام خراب کرنے والا آفی آج اس موقع پر اس شدت سے یاد آئے گا۔

تارہ دادی اماں سچ ہی تو کہتی ہیں کہ ہم ڈھیروں لڑکیوں

سے اتنی رونق نہیں جتنی اکیلے آفی بھیا سے ہوتی ہے۔ آج اتنے ہنگاموں کے باوجود بھی جانے کیوں مجھے سارا گھر خاموش لگ رہا ہے ارم آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ تارہ خاموشی اس کے ساتھ لیٹی تھی۔ وہ کس کو بتاتی کہ آفی کے بغیر اس کا دل کتنا اداس ہے۔

مہندی کی بھینی بھینی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ رنگ برنگی روشنیوں سے سارا گھر جگمگا رہا تھا۔ آج ارم کی مہندی تھی۔ جھل مل کرتے تھالوں میں جگ مگ کرتی موم بتیاں لیے لڑکیاں ہرے ہرے کپڑے پہنے اعظم کے ہاں جانے کو تیار تھیں۔ دو دن سے گانا گا گا کر گلے بیٹھ گئے تھے مگر پھر بھی کسی کو چین نہ تھا۔

اعظم کے گھر جا کر سب نے خوب اودھم مچایا اور خوب خوب نیگ وصول کیا۔ واپسی پر ڈیڑھ بج گیا تھا۔ دانش، شیریں اور تارہ وغیرہ وہاں کی ساری تفصیلات ارم کو بتانے کے لئے بے چین تھیں جب کہ چھوٹی پھوپو نے پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ خبردار جو وہاں جا کر سوئی ہوئی ارم کو اٹھایا یا اس کی نیند خراب کی۔ مگر ان کی بات ماننا ہی کون تھا۔ گاڑیوں سے اترتے ہی سیدھے ارم کے کمرے کی طرف ہی پہنچیں۔ کمال کی بات ہے اب تک بتی جل رہی ہے۔ شمع ارم کے کمرے میں سے آتی ہوئی روشنی دیکھ کر بولی تو وہ صاحبہ خود حالات سننے کے لئے بے چین ہوں گی۔ دانش پردہ ہٹاتے ہوئے بولی اور کمرے میں داخل ہوتے ہی سب خوشی سے چیخ پڑیں۔ سامنے ہی مسہری پر ارم اور آفی بیٹھے گپیں مار رہے تھے۔

"آفی بھیا آپ؟ ہائے کب آئے؟ کتنی دیر ہوئی؟ وہاں کیوں نہیں آ گئے؟" سب نے مل کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"صبر صبر بابا تھوڑی دیر صبر۔"

وہ دونوں ہاتھ اوپر کرتے ہوئے بولا مگر کوئی بھی صبر کرنے کو تیار نہ تھا۔ سب اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہی تھیں۔ پھر اس رات لڑکیوں نے آفی کے ساتھ مل کر خوب ہی اودھم مچایا باوجود دادی اماں کے بار بار منع کرنے کے اس نے کسی کو بھی نہیں سونے دیا۔

اگلے دن ارم کا نکاح تھا۔ یہ آفی کا بچہ بھی عجیب تھا۔ آج کے دن کے لئے سب لڑکیوں نے کمخواب کے غرارے بنوائے تھے اور تارہ کے لئے خود تائی امی نے اپنی پسند سے غرارہ بنوایا تھا۔ مگر اس ضدی نے تو صبح ہی تارہ کو کہہ دیا تھا کہ وہ غرارہ سوٹ نہیں پہنے گی۔ اس نے بہت منتیں کیں مگر بے سود اور پھر بے چاری کو اس کی فرمائش پر وہی کئی مرتبہ شادیوں میں پہنا ہوا کرتا شلوار کا سوٹ پہننا پڑا۔ دانش نے تو شام کو اسے اس سوٹ میں دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ تم نے خود ہی تو آفی کا دماغ خراب کیا ہے۔ تارہ زیادہ سے زیادہ ناراض ہی تو ہوتے نا۔ اور بیچاری تارہ کو یہی کہتے بنی کہ میرا خود بھی آج غرارہ پہننے کا موڈ نہیں اور پھر گرمی بھی تو کافی ہے۔ باہر مہمانوں کو ریسیو کرتے ہوئے آفی نے جب کرتے شلوار میں ادھر ادھر پھرتی تارہ کو دیکھا تو مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

ارم شادی ہو کر ہنی مون کے لیے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے سے سب ہی لڑکیاں اداس تھیں۔ مگر آفی انہیں لمحے بھر کو بھی غم زدہ نہ ہونے دیتا تھا۔ کبھی کبھی جھنجلا کر لڑکیاں اسے اس کی حرکتوں پر ٹوکتیں تو دادی اماں سے جھٹ شکایت لگا دیتا۔ ٹھیک ہے اکیلا لڑکا ہوں پھر بھی سب کو میرا وجود نا گوار گزرتا ہے اور دادی اماں سب کو کوسنے لگتیں۔

تارہ کالج سے باہر نکلی تو سامنے ہی آفی کھڑا نظر آیا۔ آج وہ ارم کی شادی کے بعد پہلی دفعہ کالج آئی تھی اور شیریں تو آج بھی کالج نہ آئی تھی۔ وہ مری مری چال سے اس کے قریب آ گئی۔ "آج ڈرائیور نہیں آیا؟"

وہ اس کے موٹر بائیک کے نزدیک آ کر بولی

"تمہیں کیا نظر آ رہا ہے۔" وہ اکڑ کر بولا "اور یہ تمہیں کسی نے سلام کرنا نہیں سکھایا کیا اور یہاں شیریں نہیں آئی آج کالج۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ اس کی اس بناوٹ پر تارہ کا جی جل کر خاک ہو گیا۔

"اچھا اب بیٹھو بھی۔"

اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی ہیلمٹ سر پر ٹکاتے ہوئے کہا اور وہ بغیر چوں چرا کئے چپکے سے پیچھے بیٹھ گئی اور آفی نے موٹر بائیک اسٹارٹ کر دی۔ وہ رش والے علاقوں سے یوں دوڑائے جا رہا تھا جیسے کھلی سڑک ہو۔ تارہ کو پتہ تھا اسے آہستہ چلانے کو کہنا فضول ہے۔ وہ کبھی نہیں مانے گا۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے جتنی آیتیں یاد تھیں دل ہی دل میں پڑھے جا رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے اسکوٹر مین بوہری بازار میں رک گیا۔

"اترو اب!"

آفی نے حیرت زدہ سی تارہ سے کہا۔

"مگر یہ گھر تو نہیں ہے" تارہ نے نہایت معصومیت سے کہا۔

"میں نے کب کہا کہ یہ گھر ہے اترو۔"

وہ پھر بولا

"دیکھیں نا آفی یہاں بازار میں یونیفارم میں کتابیں لیکر پھرنا

اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر لوگ کیا سمجھیں گے۔"
وہ لاچاری سے بولی
"اوہ! فالش۔ سمجھنے دو جو کچھ سمجھیں۔ مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں جو گھر میں نہیں ہو سکتی تھیں۔"
وہ بولا
"ضروری باتیں یہاں بازار میں؟"
تارہ حیرت سے بولی
"اب چلو بھی۔"
وہ تارہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ اس آفی کی ہر حرکت نرالی تھی۔ ایسی بات جو گھر میں نہیں کی جا سکتی تھی اسے بیچ چوراہے میں کرنے آیا تھا۔ تارہ نے سوچا اور اس کے ساتھ ساتھ چل پڑی۔
"تارہ دراصل میرا خیال ہے تم میرے ساتھ اس رشتے سے خوش نہیں ہو۔" وہ اتنی بھیڑ میں چلتے چلتے اچانک ہی سپاٹ لہجے میں دھیرے سے بولا۔ تارہ کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ کیا جواب دے سکتی تھی۔
"میرا خیال ہے کہ تم بچپن کی اس منگنی کو مجبوراً نبھا رہی ہو۔ جس وقت ہماری منگنی ہوئی اس وقت میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ سوچوں میں فرق پسند میں فرق ہو سکتا ہے کہ... کہ تم" وہ لمحہ بھر کو رکا۔ "آج تمہارے کالج کے باہر مجھے سعاد کھڑا ملا تھا۔ پر مجھے دیکھ کر وہ وہاں رکا نہیں۔ فوراً ہی چلا گیا۔ پتہ نہیں کیوں آیا تھا وہ۔"
اس نے ذرا سخت لہجہ میں بات ختم کی۔ تارہ کو جیسے ایکدم ہوش آ گیا۔ اگر اب بھی کچھ نہ کہتی تو آفی اس سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتا۔
"آفی۔ وہ اکثر کالج شیریں سے ملنے آتا رہتا ہے۔"
وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی
"شیریں کے پاس لیکن کیوں؟"
آفی بڑبڑایا۔
"وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"
تارہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔
"اچھا اتنی اہم بات۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی۔"
آفی حیرت سے بولا اور اس کے بعد خاموش اس کے ساتھ چلتے چلتے کاسمیٹکس کی ایک دوکان میں گھس گیا اور بڑے سے شیشے کے پیچھے رکھی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ تارہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔

"مگر یہ میرے پہلے سوال کا جواب تو نہ ہوا نا۔"
وہ جھک کر آہستہ سے بولا۔ تارہ خاموش رہی۔ یہ آفی آج بیچ بازار میں تماشہ بنا رہا تھا۔ کتنی بے بس تھی وہ۔
"اگر تم کہو گی تارہ تو میں یہ منگنی توڑ دوں گا۔"
اس نے آئینے پر نظر جماتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ تارہ کی تو حالت غیر ہو رہی تھی۔ کتنا ستا رہا تھا آفی اسے۔
"تو پھر میں تمہاری اس خاموشی کو تمہارا اقرار ہی سمجھوں۔"
وہ کٹیلے سے لہجے میں بولا۔ تارہ بالکل رو دینے کو تھی۔
"آفی۔ ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔"
وہ بھرائی ہوئی آواز میں مشکل سے بولی۔ آفی نے چونک کر اسے دیکھا۔
"آر یو شیور۔"
اس نے مسکراتے ہوئے تارہ سے پوچھا
"ہوں۔" تارہ نے رومال سے ناک رگڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"نان سینس تو مجھے پہلے سے کیوں نہ کہہ دیا۔ میرا اتنا ٹائم ویسٹ کیا۔ چلو اب جلدی۔"
وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوکان سے باہر آ گیا۔ دوکان پر موجود سیلز مین حیرت سے ان کی صورت دیکھ رہا تھا۔ تارہ آہستہ آہستہ رومال سے آنکھیں صاف کرتی اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ آفی نے گھڑی دیکھی۔
"تمہیں بھوک تو نہیں لگی؟"
وہ موٹر بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا
"نہیں گھر چلیں پلیز!"
تارہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی
اور اس نے جھٹ موٹر بائیک اسٹارٹ کر دی۔ سارے راستے آفی نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا اور بڑی انسانیت سے چلا رہا تھا۔ تارہ مسلسل آہستہ آہستہ سڑ سڑ کر کے اپنی ناک رگڑ رہی تھی اور آنکھوں میں آئے آنسو پونچھ رہی تھی۔ آفی نے موٹر بائیک گیٹ کے باہر ہی روکی اور تارہ جھٹ سے اتر گئی۔ وہ تیزی سے اندر جانے لگی۔
"سنو!"
آفی نے زور سے پکارا۔ تارہ نے فوراً پیچھے پلٹ کر دیکھا
"اندر جا کر نزلے کا سیرپ ضرور لینا۔ تمہیں نزلہ بہت ستاتا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا اور تارہ جھینپ کر اندر چل دی۔
"خدا کا شکر ہے تارہ تم آگئیں۔ کہاں رہ گئی تھیں؟"
اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا چھوٹی پھوپو گھبرائی ہوئی بولیں۔
"ڈرائیور بھی واپس آگیا تھا تم کالج میں بھی نہیں تھیں۔"
تائی امی بولیں۔
"جی.... وہ.... میں۔"
تارہ جھجکی۔
"ارے یہ کیا وہ میں وہ لگا رکھی ہے۔ کہاں رہ گئی تھیں؟ اتنی دیر تک؟"
آفی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ تارہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کتنی مجرم بن گئی تھی وہ سب کی نظروں میں۔
"کسی دوست کے گھر گئی تھیں کیا؟"
شیریں اس پر رحم کھاتے ہوئے بولی۔
"ارے یہ کیا بتائیں گی اس دن کے لئے کہہ رہا تھا جلدی شادی کردو۔"
آفی چہرے پر مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے بولا۔
"شاباش بیٹے بتاؤ کہاں گئی تھیں؟"
تائی امی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولیں اور ذرا سا پیار پا کر اس کے آنسو بہہ نکلے
"تائی امی یہ آفی۔" کہتے ہوئے ان سے لپٹ کر رونے لگی۔
"ارے بیٹا رونے کیوں لگیں۔ یہ علی نے کیا تھا کہیں؟"
پھوپو بات کی تہہ تک پہنچ کر بولیں۔ اور تارہ نے روتے روتے سر ہلا دیا۔
"حد کردی علی تم نے کس قدر بدتمیز اور بے ہودہ ہو گئے ہو تم۔"
تائی امی برس پڑیں۔ شیریں، دانش اور شمع ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں اور تارہ جواب تک نہ جانے کتنی برساتیں آنکھوں میں چھپائے ہوئے تھی سب برسا رہی تھی۔
"چپ ہو جاؤ تارہ شاباش۔ چپ ہو جاؤ۔"
پھوپو اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں
"علی۔ تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ اب تم حد سے بڑھنے لگے ہو۔ شام ہی تمہارے ابا زمینوں سے لوٹیں گے میں تمہیں ٹھیک کرواؤں گی۔"
تائی امی کو واقعی غصہ آگیا تھا۔

"باپ رے باپ۔"
آفی کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔
آفی کی پروموشن کیا ہوئی گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تارہ کے بھی بی۔ اے فائنل کے امتحانات ہو رہے تھے کو ساتھ ساتھ تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔ آج اس کا آخری پیپر تھا جبھی تو شام کو دانش اور شمع وغیرہ اسے زبردستی بازار لے گئے۔ حالانکہ آخری پیپر دینے کے بعد وہ اس قدر تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی دو چار دن خوب آرام کرے گی۔ مگر سب کی ضد کے آگے اسے ہار ماننا پڑی۔
"بھئی آخر تمہاری شادی ہے۔ تم نے ابھی تک اپنی پسند کا ایک کپڑا نہیں خریدا۔
دانش غصے سے بولی تھی اور وہ بھی مجبوراً جانے کو تیار ہو گئی تھی۔
"صاحب باہر آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"
رحیم بابا نے کمرے میں داخل ہو کر زور و شور سے تایا ابو کو بیچ میں ڈسٹرب کرتے ہوئے کہا
"کون ہے کبھی نام پوچھ کر آیا کرو۔"
"وہ جھنجلاتے ہوئے بولے۔
"یہ نام ہے جی ان کا۔"
رحیم بابا نے وزیٹنگ کارڈ آگے کر دیا۔
ریحان" وہ کارڈ پڑھتے ہوئے بڑبڑائے۔ "کون ریحان؟"
چچا بیچ میں بولے۔
"معلوم نہیں میں نہیں جانتا۔"
تایا ابو ذہن پر زور دے کر بولے
"ٹھہریئے میں دیکھے لیتا ہوں۔"
چچا خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور تایا ابو پھر پھوپو وغیرہ سے بحث میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں چچا ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا شخص اور ایک نوجوان بھی تھا۔
"ارے شریف۔ تم؟"
تایا ابو کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔ دادی اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تائی اماں حیرت سے منہ تکنے لگیں۔
"جی ہاں سراج صاحب۔ خادم شریف حاضر ہے۔"
وہ شخص طنز سے تایا ابو سے بولا
"بیٹھو شریف۔"
سراج صاحب مری ہوئی آواز میں بولے۔

"معاف کیجئے سراج صاحب! آج شریف بیٹھنے نہیں آیا ہے۔ آج شریف اپنی بھابھی کو لینے آیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا ان باتوں سے؟"

"مطلب صاف ہے۔ ظفر صاحب میں اپنی بھابھی کو ابھی اور اسی وقت اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کی پرورش ہم نے کی ہے۔ آج تم کیسے اس کے دعویدار بن گئے۔"

تائی امی غصے سے بولیں

"ٹھیک ہے اس پر اب تک جتنا خرچہ ہوا ہے وہ سب رقم میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

نوجوان ابھی تک خاموش بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے شریف تم ہو کن ہوشوں میں ہم تم پر عدالت میں کیس کریں گے۔"

چچا طیش میں آتے ہوئے بولے

"شوق سے کیس کیجئے ظفر صاحب لیکن مجھے یقین ہے عدالت بھی ماں کے حق میں فیصلہ دے گی بہ نسبت چچا کے۔"

وہ ہنس کر بولا

"کیا؟"

پھوپھو کے منہ سے حیرت سے نکلا

"خورشید بھابی زندہ ہیں؟"

"جی آپ کی دعا سے۔"

شریف مسکراتے ہوئے بولا۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"جلدی بلائیے سراج صاحب میری بھابھی کو۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

شریف پھر غصے میں بولا۔

"وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے۔"

چچا مری ہوئی آواز میں بولے

"جھوٹ بولتے ہیں آپ لوگ۔"

شریف چلایا۔

"بابا پلیز تسلی رکھیئے۔ ٹھیک ہے ہم انتظار کر لیتے ہیں۔"

نوجوان آہستہ سے بولا۔ دادی اماں کو اختلاج ہونے لگا پھوپھو کا جی بری طرح گھبرا رہا تھا اور تائی امی سوچ رہی تھیں کہ جانے اب کیا ہو۔ گاڑی کے رکنے اور دروازے بند ہونے کی آواز پر سب چونک گئے۔

گاڑی لاک کر کے ڈھیر سارے پیکٹ سنبھالتے ہوئے وہ آگے پیچھے گیٹ میں داخل ہوئیں تو دانش کی تو جان ہی نکل گئی۔

"مارے گئے شمع وہی بنک کا کھٹارا کھڑا ہے۔"

وہ بنک کی گاڑی دیکھ کر بولی اور

"اوہ گاڈ تو وہ یہاں تک آ گیا۔"

شمع پیکٹ سنبھالتے ہوئے بولی

"تم لوگ تو خواہ مخواہ ہی الزام تراشی کرنے لگیں کیا بنک کی صرف ایک ہی گاڑی ہو سکتی ہے۔ ایسی ہزاروں گاڑیاں ہوتی ہیں۔"

رخشی لہک کر بولی

"کیا بات ہے کس گاڑی کا ذکر کر رہی ہو تم لوگ۔"

تارہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی

"کچھ نہیں وہ پرسوں آرٹ کونسل میں تصویروں کی نمائش تھی ناجہاں ہم سب گئے تھے۔ تم تو عالم کے ساتھ گھر آ گئی تھیں۔ وہاں آرٹ کونسل میں ایک بدتمیز سا لڑکا دانش سے ٹکرا گیا تھا۔ اس لڑکے کا اور خود میرا خیال تھا کہ ٹکر بالکل اچانک اور بغیر کسی ارادے کے ہوئی ہے۔ جبکہ دانش کہتی تھی کہ اس ٹکر میں سو فیصد اس بدتمیز کی مرضی اور منشا شامل تھی۔ کیونکہ وہ کافی دیر سے اسے گھور رہا تھا۔ بس ٹکر لگتے ہی انھوں نے اپنی خوبصورت زبان کا استعمال شروع کر دیا۔ جب ہم واپس گاڑی لے کر گھر آ رہے تھے تو دانش کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں پتہ چلا کہ موصوف اپنے دوست سمیت بنک کے کھٹارے میں ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ دانش نے گاڑی تیز دبائی موصوف نے بھی تیز کر دی۔ بہرحال تھوڑی دیر میں لڑنے کی غرض سے دانش نے اپنی گاڑی اس کی گاڑی کے سامنے روک لی اور اور اس طرح لڑائی کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پیچھا وغیرہ نہیں کر رہے بلکہ اپنے راستے پر جا رہے ہیں۔ وہ تو اللہ میاں کو رحم آ گیا کہ سعاد اپنے موٹر بائیک پر وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے فوراً روک کر پوچھا اور پتہ چلا کہ وہ صاحبزادے سعاد کے کالج کے زمانے کے اچھے دوستوں میں سے تھے اور یوں معاملہ رفع دفع ہو گیا۔"

شمع نے تقریر ختم کرتے ہوئے کہا

"ہائے کاش میں بھی ہوتی۔"

شیریں آہ بھر کر بولی

"خدا کا شکر ہوا کہ تم نہیں تھیں۔"

تارہ مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم تک آ گئی تھیں۔ "بھئی میں اندر نہیں جا رہی تم لوگ جاؤ تایا ابا ہوں گے۔"

تارہ منمنائی۔

"کیا حماقت ہے چلو نا۔"

شیریں نے اسے ڈانٹا اور وہ سب ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم میں گھس گئیں۔ دانش کی تو چیخ نکلتے نکلتے بچی۔ سامنے صوفے پر وہی نوجوان براجمان تھا۔ مارے گھبراہٹ کے ہاتھ میں پکڑے پیکٹ زمین پر آ گرے۔ شمع اور رخشی بھی کھسیانی ہو رہی تھیں۔ شیریں نے تو جھٹ سے سلام جھاڑ دیا۔ تارہ بھی دوسرے لوگوں کو دیکھ کر عجیب سی پوزیشن میں ہو گئی تھی۔ دانش جلدی جلدی نیچے گرے پیکٹ سمیٹنے لگی۔ اس نے دوبارہ سر اٹھا کر نوجوان کی طرف نہیں دیکھا نوجوان بڑی مشکل سے ہنسی کنٹرول کیے بیٹھا تھا۔ دو دن پہلے بڑی سڑک پر اسے برا بھلا کہنے والی لڑکی آج اپنے ہی گھر میں اسے دیکھ کر کس قدر بوکھلا گئی تھی۔

"اندر جاؤ تارہ تم لوگ۔"

تایا ابا کی آواز گونجی۔

"اندر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہیں رک جاؤ تارہ بیٹے۔"

شریف صاحب کی آواز میں جانے کیا کشش تھی کہ تارہ کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ براؤن پینٹ اور سفید قمیص میں ملبوس یہ ادھیڑ عمر کا شخص اسے اس قدر متاثر کر رہا تھا۔ جانے وہ کیسی کشش تھی کہ وہ پتھر کی مورت بنی کھڑی رہی۔ سب لڑکیاں حیرت زدہ سی اسے تک رہی تھیں۔

"اپنے ماموں کے سینے سے لگ جا تارہ بیٹے۔"

شریف صاحب دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

"دیکھ میں تیرا ماموں ہوں بیٹا۔ تیری ماں کا سگا بھائی۔ ہم سب نے تیری دید کی خاطر کیسے دن گزارے ہیں۔ تارہ تو کیا جانے۔"

ان کی آنکھوں میں باوجود ضبط کے آنسو بھر آئے تھے۔ کتنے عجیب اور اذیت کن لمحات تھے وہ۔ تارہ کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے سارے پیکٹ زمین پر آ رہے اور وہ دوڑ کر شریف کے سینے سے لگ گئی اور ایسا تارہ دی کہ دادی اماں، تائی امی اور پھوپو وغیرہ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکیں۔ لڑکیاں ابھی تک ہکا بکا سی تھیں۔

"تیری ماں تیری منتظر ہے تارہ۔"

شریف صاحب ہولے سے بولے۔

"ماں۔"

تارہ نے زیر لب دہرایا۔ اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ماں۔ ماں۔ ماں۔ اس کا جی چاہا ہزاروں بار چیخ چیخ کر یہ لفظ دہرائے۔

"آج برسوں بعد تمہاری ماں کی ممتا جاگ اٹھی ہے تارہ۔"

چچا طنز سے بولے۔

"یہ بات نہیں ہے بیٹا۔ خورشید سخت بیمار ہے اور تجھے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہے۔"

شریف زور سے بولے

"مگر... مگر یہ سب کچھ کیا ہے۔ ماموں میاں امی اور آپ سب مجھ سے اتنے عرصے دور کس طرح رہے۔ کیا میری ماں کو بھی کبھی میری یاد نہ آئی؟"

تارہ روتے ہوئے بولی۔

"تمہاری ماں ایک دن چپ چاپ گھر سے بھاگ گئی تھی تارہ۔"

تایا ابو کی کرخت آواز گونجی۔

"منہ سنبھال کر بات کیجیے سراج صاحب۔"

شریف کی بھویں تن گئیں۔ وہ غصے کے عالم میں صوفے پر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بابا پلیز لڑائی سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

نوجوان نے پھر نرم لہجے میں سمجھایا۔ شریف تھوڑی دیر کو رک کے پھر گویا ہوئے

"تمہاری ماں بڑی عظیم عورت ہے بیٹی۔ جب تمہارے باپ کا لندن سے طلاق نامہ آیا تو وہ یہ ظلم بھی چپ چاپ سہار گئی۔"

"بکواس کرتے ہو تم۔ زمان نے خورشید کو طلاق نہیں دی تھی۔ اس نے لندن میں دوسری شادی ضرور کر لی تھی مگر طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

تایا ابو دھاڑے

"کیسی باتیں کرتے ہیں سراج صاحب۔ طلاق نامہ میرے پاس موجود ہے۔ بلایئے زمان کو میں صداقت پیش کروں۔ طلاق نامہ خورشید کے نام بھیجا گیا تھا جسے اس بے چاری نے سب سے چھپا کر رکھا۔"

"کیا کہا زمان نے خورشید کو طلاق دے دی تھی۔"

دادی اماں آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔

"میری بات کا یقین نہ ہو تو بلوایئے زمان کو۔"

شریف غرایا

کہاں سے لائیں زمان کو۔ وہ تو ایسی جگہ جا چکا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

تایا ابو سسک پڑے
"اوہ تو زمان مر چکا ہے۔"
شریف نے دکھ سے سوچا۔ تارہ تو اس وقت بالکل سن کھڑی تھی۔
"چلو بیٹا تارہ۔"
شریف صاحب اسے تھامتے ہوئے بولے۔
"شریف بیٹا یہیں لے آؤ نا خورشید کو۔
دادی اماں پہلی بار بھرائی ہوئی آواز میں بولیں
"جی نہیں معاف کیجئے گا خورشید اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھے گی۔ یہ اس کا عہد ہے۔ اس نے برے حالات میں ہمت نہیں ہاری۔ اب کیوں ہارے گی۔ اس نے ممتا کا گلا گھونٹے رکھا۔ اپنی بیٹی کے مستقبل کی خاطر۔ جب زمان کا لندن سے واپسی کا خط آیا اور خورشید کو یقین ہو گیا کہ زمان کے آنے کے بعد وہ یہاں سے نکال دی جائے گی تو وہ نہایت خاموشی سے طلاق کا داغ ماتھے پر لئے کسی کو بتائے بغیر میرے ساتھ رات کی تاریکی میں نکل آئی۔ اس وقت میرے مالی حالات بہت خراب تھے۔ ایسے حالات میں تارہ کو ساتھ لے جانا اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوتا۔ خورشید نے اپنی ممتا کا گلا گھونٹ دیا اور اپنے جگر گوشے کو آپ لوگوں کے پاس ہی چھوڑ دیا۔ اب ہمارے حالات بہتر ہیں۔ میرا ریحان بنک میں افسر ہے۔ وہ نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ہم تارہ پر لگائی ہوئی ایک ایک پائی ادا کر دیں گے۔ آپ بتائیے تو آپ نے اب تک اس پر کتنا خرچہ کیا ہے؟"
شریف بولتے بولتے رکے
"شریف بھائی ابھی تھوڑے دنوں میں تارہ کی شادی ہونے والی ہے۔"
پھوپو مری ہوئی آواز سے بولیں۔
کیسی شادی کس کی شادی ابھی تو تارہ ہمیں ملی ہے۔ ہم ابھی سے اس کی شادی نہیں کریں گے۔ ویسے یہ اس کی ماں پر منحصر ہے جو فیصلہ دے۔"
"شریف نے کہا
"تارہ پر ہمارا ابھی تو حق ہے۔ بھائی صاحب پھر میرا علی بھی تو آنے والا ہے۔ فیصلہ تو اس کے بعد ہی ہو گا۔"
تائی امی رندھی ہوئی آواز سے بولیں
"ٹھیک ہے شریف ابھی تارہ کہیں نہیں جا سکتی۔
ہم تار دے کر علی کو بلوا لیتے ہیں۔ فیصلہ ان کے آنے کے بعد ہو گا آخر تارہ میرے علی کی منگیتر ہے۔ یہ اس کی اور ہماری مرضی کے بغیر کہیں نہیں جا سکتی۔"
تایا ابو طیش میں آ کر بولے
"کیسی بچوں جیسی باتیں کرتے ہو سراج۔ کیسی منگنی اور کیسی شادی۔ تارہ ابھی اور اسی وقت اپنی ماں کے پاس جائیگی۔ اب اٹھو بیٹا تارہ چلو تیار ہو جاؤ۔ اور ہاں ریحان تم گاڑی کھولو
شریف ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ انہوں نے تارہ کو ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ سب لوگ دم بخود تھے۔
"رک جاؤ تارہ۔ تم اس گھر کی بہو بننے والی ہو میرے علی سے منسوب ہو۔ تم کہیں نہیں جا سکتیں۔"
تایا ابو گرجے۔
"میں یہ منگنی توڑتی ہوں تایا ابو۔"
تارہ منگنی کی انگوٹھی انگلی سے نکالتے ہوئے بولی۔ سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس نے انگوٹھی اتار کر سینٹر ٹیبل پر ڈال دی۔
"تارہ بیٹا جذباتی نہ ہو۔"
پھوپو ڈبڈبائی آنکھیں لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔
"تارہ اگر آج تم اس گھر سے باہر چلی گئیں تو یہاں کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔"
چچا دھاڑے۔
"میں جانتی ہوں چچا جان" تارہ سر نیچا کر کے بولی۔ "مجھے میری ماں کے سوا کوئی نہیں چاہیئے۔ اب چلیئے بھی ماموں میاں مجھے میری امی کے پاس لے کر۔
تارہ ضبط کر کے بولی
"چلو چلتے ہیں بیٹا۔ اجازت ہے سراج صاحب؟"
شریف طنز سے مسکراتے ہوئے بولے
"میں جا رہی ہوں دادی اماں۔"
تارہ ہولے سے خاموش بیٹھی دادی کے سامنے جھک گئی۔
دادی اماں سب سے کہہ دیجئے گا مجھے معاف کر دیں۔"
وہ سسک پڑی اور فوراً ہی ماموں کے کندھے سے لگ کر چل پڑی۔
ریحان اور شریف اسے سہارا دیکر باہر لائے۔ گاڑی

استارٹ ہونے کی آواز پر لڑکیوں کے دل بیٹھ گئے۔ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ کیا ہو گیا یہ سب کچھ کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ کمرے میں بے شمار پیکٹ پڑے تھے جو تارہ وغیرہ ابھی شاپنگ کر کے لائی تھیں۔ تایا ابو اور چچا کی بھنویں تنی ہوئی تھیں پھوپو اور تائی امی کی سٹرسٹری آواز سے کمرہ گونج رہا تھا۔ دادی اماں خالی خالی نظروں سے کمرے کو تک رہی تھیں اور لڑکیاں تو بالکل ہی بدحواس ہوئے جا رہی تھیں۔

کمرہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں سیپارے پڑھ رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں مرد بیٹھے تھے۔ انھیں عورتوں کے درمیان سب سے بے نیاز گم سم سی تارہ بھی موجود تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ اس غریب کے ساتھ قدرت نے کتنا بھیانک مذاق کیا تھا۔ وہ ماں جس کی خاطر وہ سارے خاندان والوں کو چھوڑ کر آگئی تھی اس کے مالک حقیقی سے جا ملی تھی۔ تارہ کا ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ وہ تو متواتر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھ رہی تھی جو آنکھیں بند کئے مسہری پر لیٹی تھی جو اس کی ماں تھی جس سے اس نے آج تک ایک بات بھی نہ کی تھی۔

ماموں میاں نے بہتیرا جھنجھوڑا۔ ریحان نے چیخ چیخ کر کہا روؤ تارہ تمھاری امی مر گئی ہیں مگر وہ تو بالکل بت کی طرح بیٹھی تھی۔ جب خورشید بیگم کا جنازہ اٹھا تو ماموں میاں اس پتھر کی مورت کو گھسیٹ کر باہر لے آئے۔

"تارہ تیری ماں ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے اسے خدا حافظ تو کہہ دے"

اور تارہ ماموں میاں کہہ کر شریف صاحب سے لپٹ گئی۔

"ماموں میاں انھوں نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا۔ انھیں میرا اعتبار نہیں تھا کیا"

وہ بلک بلک کر رو دی۔ بڑی مشکل سے پڑوس کی عورتوں نے اسے قابو میں کیا۔ اور پھر تارہ کو روتے روتے کچھ صبر سا آگیا تھا۔ جانے کیوں وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو گئی تھی۔ سوئم کے بعد ماموں میاں نے ایک دفعہ اس سے کہا بھی کہ

"تارہ میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں تجھے وہاں سے نہ لاتا تو اچھا تھا۔ خورشید کو تو مرنا تھا وہ مر جاتی مگر تو تو یوں گھر سے بے گھر نہ ہوتی"

"کیسی باتیں کرتے ہیں ماموں میاں آپ" تارہ سسک پڑی "آپ لوگوں کے ساتھ میں بہت خوش ہوں۔ اس گھر میں میری ماں کی خوشبو بسی ہے۔ اس کو میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں"

اور ماموں میاں خوش ہو جاتے۔ ریحان بھی بے حد سنجیدہ لڑکا تھا وہ تارہ کا بے حد خیال رکھتا تھا۔

"تارہ بور تو نہیں ہو رہیں"

"تارہ خاموش کیوں بیٹھی ہو۔ تارہ کہیں گھومنے چلو گی۔ تارہ کوئی یاد تو نہیں آرہا"

غرض ریحان گھر میں ہوتا تو مستقل تارہ سے منٹ منٹ میں سوال کرتا رہتا۔

"اللہ ریحان بھائی۔ آپ کے سامنے کس طرح بیٹھا جائے" تارہ اپنے دلی جذبات چھپا کر ہنستے ہوئے کہتی "میں بالکل خوش ہوں"

"سچ کہتی ہو؟" وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا۔

"اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے"

وہ سر پر ہاتھ سے ایک چپت لگاتا اور تارہ توبہ ہے کہتی ہوئی اٹھ کر ماموں کے پاس جا بیٹھتی اور ریحان مسکرا اٹھتا۔ ٹھیک ہی تو کہتا تھا ریحان۔ کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرتا تھا جب تارہ کو ان سب کی یاد نہ آتی ہو۔ کبھی کبھی تو وہ سب اس شدت سے یاد آتے کہ تارہ پریشان ہو جاتی۔ مگر پھر جلد ہی کسی بھی کام میں مصروف ہو جاتی

خورشید بیگم کو مرے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ تارہ ظاہری طور پر تو بالکل نارمل نظر آتی۔ مگر ریحان کو جانے کیوں اس کی ہر بات میں کھوکھلا پن محسوس ہوتا۔ ابھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تارہ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ شریف صاحب کمرے میں داخل ہوئے شاید بڑی عجلت میں تھے۔ جبھی ریحان کے ہاتھ میں ایک خط تھما کر اسے پڑھنے کی ہدایت کر کے جلد ہی باہر نکل گئے۔ ریحان حیرت سے لفافے کو دیکھ رہا تھا۔ بہرحال اس نے خط نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"شریف بھائی! مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی بیٹی سے نہ مل پاؤں گی۔ موت میرے سامنے کھڑی ہے۔ کاش میں اسے دیکھ لیتی۔ کتنی بدنصیب ماں ہوں میں بھی اپنی بیٹی سے نہ مل سکی۔ اگر وہ اس گھر میں آجائے تو اسے یہاں سے نہ جانے دیجئے گا۔ شریف بھائی وعدہ کیجئے کہ آپ میری بچی کو اپنے پاس رکھیں گے میری روح اس سے تسکین پا جائے گی کہ میری بچی آپ کے پاس رہے۔ شریف بھائی! آپ نے زندگی کے ہر موڑ پر میرا بے حد ساتھ دیا ہے۔ میری ایک آخری خواہش بھی پوری کر دیں۔ ریحان بہت سمجھدار لڑکا ہے۔ آپ میری تارہ کی شادی ریحان سے

کر دیجیے گا۔ تاکہ میری بیٹی کی زندگی سکون سے گزر جائے۔

شریف بھائی زمان کے خاندان کے مرد بے حد سنگدل اور ضدی ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بچی کی قسمت کسی ایسے ہی سنگدل مرد سے وابستہ ہو جائے۔ لکھنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں مگر اب ہاتھ میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ لہٰذا خدا حافظ۔

آپ کی بدنصیب بہن (خورشید)

خط ختم کرتے ہی ریحان دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

○

خورشید بھابی کا انتقال ہو گیا ہے۔

"کب؟"

سب کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"انھوں نے تو کہا ہے جس دن تارہ کو لیکر گئے تھے اسی دن۔"

تایا ابو کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"چہ چہ بے چاری بچی ــــــــــ لیکن بھائی صاحب! مجھے اس میں شریف کی چال لگتی ہے۔"

چچا تاؤ کھاتے ہوئے بولے

ارے بھیا۔ اس میں چال کی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

پھوپو بولیں۔

"آپا آپ کو نہیں پتہ یہ شریف بڑا چالاک ہے۔ ہو سکتا ہے خورشید بھابی پہلے ہی مر چکی ہوں۔ اب تارہ بالغ ہو گئی ہے اور زمان بھائی کی جائداد کی تنہا وارث تو اس نے یہ جال پھینکا ہے۔"

چچا پھر گرمی دکھاتے ہوئے بولے

"اب ایسا بھی اندھیر نہیں۔"

چچی آہستہ سے بولیں

"ارے آپ لوگ کمال کرتی ہیں۔ وہ بڑا زبردست شکاری ہے۔ گھاگ ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ عنقریب اپنے بیٹے کی شادی تارہ سے کرنے والا ہے۔ کیونکہ یہ خورشید بھابی کی وصیت ہے۔"

چچا واقعی غصہ میں آ کر بولے

"کیا کہا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

سب کے منھ سے بیک وقت نکلا۔ لڑکیاں تو واقعی پریشان ہو گئی تھیں۔ بے چارے آفی بھیا کیا جانیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ شیریں نے دُکھ سے سوچا۔

"آپ تارہ سے ملے تھے۔"

تائی امی بولیں

"ہاں۔" انھوں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کچھ بولی وہ؟"

پھوپو نے کریدا

"سب سلام دعا اور تم سب لوگوں کا پوچھا اب وہ پہلے جیسی تارہ نہیں رہی۔ بہت گم سم ہو گئی ہے۔"

چچا بولے

"آپ لوگوں نے ساتھ لانے کو نہ کہا۔"

چچی ہمت کر کے بولیں۔

کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ اب ہمارا اس پر حق ہی کونسا رہ گیا ہے۔ وہ سب بندھن توڑ کر یہاں سے گئی ہے۔ وہ بالغ ہے۔ دوسرے خود اپنے منھ سے ہم کہہ چکے ہیں کہ اب دوبارہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔"

تایا ابا جھنجلا کر بولے

"ایک دفعہ تو آپ لوگوں کے کہنے سے وہاں ہو آئے ہیں نہایت نکٹے اور ذلیل بن کر۔ اب اور آپ خواتین چاہتی کیا ہیں آخر ناک رگڑیں اس شریف کے آگے۔"

چچا غصے سے بے قابو ہو کر بولے۔

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ تمام خواتین نے مل ملا کر ضد کر کے دادی اماں جو کہ تارہ کے جانے کے بعد سے کافی بیمار تھیں ان کی زندگی کے واسطے دیکر تایا ابو اور چچا جان کو تارہ کے پاس بھجوایا تھا۔

"ہائے میرے علی کا کیا ہو گا۔ وہ تو قیامت برپا کر دے گا خدایا تو نے یہ دن بھی دکھانا تھا۔"

تائی امی آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"چپ ہو جائیے بھابی اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔"

پھوپو ضبط سے کام لیتے ہوئے بولیں۔ دانش اور شمع نے سب کی نظریں بچا کر آنکھوں میں آئے ڈھیر سارے آنسو پونچھ ڈالے۔ اب ان میں مزید کچھ سننے کی سکت باقی نہیں تھی۔ وہ دونوں وہاں سے اندر آ گئیں جہاں دادی اماں

ان تمام فکروں سے بے نیاز نیند کی دوائی لے کر سو رہی تھی۔ ایک بار۔ دو بار۔ تین بار بلکہ کئی بار مگر سیدھے سادے الفاظ پھر بھی جانے کیوں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا ہو سکتا ہے شیریں نے مذاق کیا ہو۔ اس نے سوچا مگر جانے کیوں دل یہ ماننے کو بھی تیار نہ ہوا۔ اس نے دوبارہ خط کھولا۔

"آپی بھیا! جیسے بھی ممکن ہو فوراً واپس آ جاؤ۔ چھٹی نہ ملے تو استعفیٰ دے کر آ جاؤ۔ اگر نہ آسکے تو تارہ کو ہمیشہ کے لئے کھو دو گے۔ میرے اس خط کا گھر میں کسی کو پتہ نہ چلے۔"

شیریں

وہ رات اس نے بڑی بے کلی میں کاٹی۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ کیا ہو سکتا ہے۔

○

"منہ بسورنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ مٹھائی کھلاؤ ہو گیا تم لوگوں کا کام۔"

سعاد کمرے میں داخل ہو کر شیریں اور دانش سے بولا جو واقعی افسردہ سی بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا، کیا مل گیا ریحان؟"

شیریں نے جھٹ سے پوچھا

"ہاں فون پہ بات ہو گئی۔ آج چار بجے کا ٹائم لیا ہے میں نے اس سے۔ وہ بنک سے سیدھا ہوٹل پہنچ جائے گا۔ بس تم لوگ ٹھیک ساڑھے تین بجے تیار رہنا۔ ہم یہاں سے پونے چار بجے تک چلیں گے۔"

سعاد نے اپنی بات ختم کی۔

"ٹھیک ہے سعاد۔ تم اور شیریں چلے جانا۔"

دانش ہونے سے بولی۔

"ارے یہ کیا بکواس ہے۔ میں اکیلی ہی پھنسوں۔"

شیریں چلاتے ہوئے بولی

"بے وقوف۔ یہ بات نہیں۔ دیکھو نا۔ میری پہلے ہی اس سے ایک بار جھڑپ ہو چکی ہے۔ پھر اچھا نہیں لگتا کہ میں ہی اسے کوئی کام کرنے کو فورس کروں۔"

"دانش سمجھاتے ہوئے بولی

"اوہ بھول جاؤ احمق بلکہ تمہارا جانا زیادہ فائدہ مند ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ریحان نے تمہاری اس دن کی کسی بات کا برا نہیں منایا بلکہ..... بلکہ میرا خیال ہے تمہارا وہ رویہ اسے زیادہ ہی پسند آیا ہے۔"

شیریں مسکراتے ہوئے بولی

"لعنت ہے تم پر۔"

دانش بگڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی

"لیڈیز۔ لیڈیز۔ پلیز براہ مہربانی جھگڑا روکو۔ اتنی سیریس بات اور تم یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا کر رہی ہو۔ اگر تم لوگ نہیں جانیں تو ٹھیک ہے۔ میں سارا پروگرام ہی کینسل کئے دیتا ہوں۔"

سعاد قریب رکھے ٹیلی فون پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھہرو ٹھہرو سعاد رکو۔ ہم دونوں چلیں گے۔"

وہ دونوں ایک دم رضامند ہو گئیں

"ٹھیک ہے پھر تم دونوں مجھے تیار ملنا۔"

سعاد اٹھ کھڑا ہوا۔

"ان سے ملو ریحان۔ یہ تارہ کی کزنز شیریں اور دانش ہیں۔"

سعاد نے ریحان کے ٹیبل کے قریب آتے ہی جھٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے تعارف کروایا۔ ریحان ایک سیکنڈ کو جھجکا۔ پھر فوراً ہلو کہتا ہوا بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے منہ سے تو کچھ بھی نہ نکل سکا۔ سعاد نے ویٹر کو پہلے ہی آرڈر دے دیا تھا۔ وہ کچھ کھانے کی چیزیں اور چائے رکھ کر چلا گیا۔ دانش نے سب کو چائے بنا کر دی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں اصل ٹاپک پر آ جانا چاہیئے۔"

سعاد شیریں اور دانش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بات دراصل یہ ہے ریحان کہ یہ دونوں تارہ سے متعلق کچھ باتیں تم سے کرنا چاہتی تھیں۔"

سعاد ریحان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جی ضرور۔"

ریحان ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا

"اچھا تم دونوں اپنی پرابلم ریحان کو بتاؤ۔ اتنے میں سامنے سے سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

سعاد کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگیں مگر وہ ایکسکیوزمی کہتا ہوا کرسی کھسکا کر چل دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ یہیں رہا تو یہ دونوں ساری بات اسی پر ڈال دیں گی۔

"جی تو پھر آپ نے بتایا نہیں کہ کیا بات کرنا چاہ رہی تھیں آپ لوگ۔"

ریحان سعاد کے جانے کے بعد بولا
"جی وہ دراصل دانش ہے نا۔ یہ اپنے اس دن والے رویے پر بڑی شرمندہ ہے۔ کچھ غلط فہمی کی بنیاد پر بات اس قدر بڑھ گئی تھی۔"
شیریں مسکراتے ہوئے بولی۔ دانش نے اپنا پیر بڑی زور سے شیریں کے پیر پر مارا جو بجائے شیریں کے ریحان کے پیر پر جا لگا۔ ریحان نے مسکراتے ہوئے جلدی سے نیچے دیکھا
"جی نہیں۔ وہ دراصل بات یہ تھی کہ تارہ اور آفی بھیا کی بچپن سے منگنی ہو گئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"
دانش ایک دم بول پڑی
"جی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ کیا چاہتی ہیں وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کریں۔"
ریحان مسکراتے ہوئے بولا۔ دانش کو اس وقت اس طرح ہنسنے پر بے حد غصہ آیا۔
"مگر ہم نے تو سنا ہے کہ تارہ کی شادی آپ سے ہونے والی ہے۔"
شیریں ایک دم بولی۔ ریحان بری طرح سٹپٹا گیا۔ اسے نہیں پتہ تھا کہ خط والی بات ان کو بھی پتہ ہو سکتی ہے۔
"آپ کو کس نے بتایا؟"
وہ دھیرے سے بولا
"وہ تایا ابو آپ کے گھر گئے تھے نا وہیں آپ کے ڈیڈی نے بتایا تھا کہ شادی ہونے والی ہے۔"
شیریں بولی۔ ریحان سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔
"دیکھئے اگر آپ کسی بھی مصلحت کے تحت ہم کو یہ سب باتیں نہیں بتانا چاہتے تو آپ ہمیں بتا دیں پھر ہم آپ سے اگلی بات بھی نہ کہیں گے۔ سعاد نے ہمیں مجبور کیا تھا کہ تارہ کے سلسلے میں ہم آپ سے بات کریں۔ آپ ہماری پرابلم سمجھ لیں گے لیکن اگر آپ کسی بھی وجہ سے مجبور ہوں تو پھر ٹھیک ہے۔"
شیریں بولتے بولتے رک گئی۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ لوگوں کو کس طرح یقین دلاؤں۔ اب میں آپ کو صحیح حالات سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ دراصل خورشید پھوپو نے مرتے وقت ایک خط چھوڑا تھا جس میں انھوں نے ایسی وصیت لکھی تھی۔ مگر اس میں پھوپو نے تارہ کی بھلائی سوچی ہو گی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ تارہ آپ لوگوں میں خوش نہیں مگر میں نے خود اندازہ لگایا ہے کہ تارہ آپ لوگوں کے بغیر ہرگز زندہ نہیں رہ سکے گی۔"
ریحان بات ختم کر کے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا
"شاید آپ کو آفی بھیا کی تارہ سے وابستگی کا علم نہیں جب سے انھیں اس بات کا علم ہوا ہے دیوانے ہو رہے ہیں۔"
ریحان صاحب آفی بھیا تارہ کو اس شدت سے چاہتے ہیں یہ تو ہم بھی نہیں جانتے تھے۔ اگر انھیں تارہ نہ ملی تو خدانہ کرے انھیں کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔"
دانش بولتے بولتے رک گئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ ریحان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"آپ لوگ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں تارہ ضرور آپ لوگوں کے پاس واپس آجائے گی۔"
ریحان نے مسکرا کر کہا اور اتنے میں سعاد واپس آچکا تھا۔ وہ بھی آکر بیٹھ گیا۔
"کیوں بھئی کوئی تصفیہ ہوا؟"
وہ خوشدلی سے دانش کی صورت دیکھتے ہوئے بو
"ارے یار تصفیہ کیسا۔ یہاں پہ تو کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔"
ریحان ہنس کر بولا
"ٹھیک ہے پھر چلنا چاہیئے۔"
سعاد اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سب ساتھ ہی باہر آگئے
"ہاں ایک بات اور۔ آج میں اس سلسلے میں ابو سے بات کروں گا۔ اس کے بعد یہ آپ لوگوں کا کام ہے کہ آپ لوگ ہمارے یہاں بھیجیں تاکہ وہی رشتہ دوبارہ قائم ہو سکے جسے توڑ کر تارہ ہمارے ساتھ آگئی تھی۔
ریحان نے کہا
"اچھا دوست بہت بہت شکریہ۔"
سعاد اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا
"واقعی ریحان آپ کا ہم پر یہ احسان رہے گا۔"
شیریں مسکرا کر بولی۔
"آپ لوگ مجھے مکمل طور پر شرمندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"
ریحان نے ہنس کر کہا اور گاڑی میں بیٹھ گیا
"او کے بھئی خدا حافظ۔
سعاد نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

ریحان جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ سامنے ہی پلنگ پر تارہ خاموش بیٹھی تھی۔ وہ ہولے ہولے قدموں سے اس کے نزدیک آگیا یوں کہ تارہ کو بالکل خبر نہ ہوئی۔ وہ تو رم جھم نیر برسا رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپی اس کے پاس تھا۔ ریحان نے جھک کر اسے دیکھا اور آہستہ سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"تارہ رو رہی ہو؟"

وہ دھیرے سے بولا اور تارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"نہیں تو ریحان بھائی۔"

وہ گھبرا کر آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تو میں تو۔ مجھے امی یاد آرہی ہیں ریحان بھائی۔"

تارہ پھر رو دی۔

"تم ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتی ہو تارہ۔ ریحان کو نہیں۔"

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔

"تارہ میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہارا بھائی ہوں مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟"

وہ پھر بولا

"کچھ بھی نہیں ریحان بھائی۔"

تارہ نگاہیں چراتے ہوئے بولی

"میں وعدہ کرتا ہوں تارہ تمہاری شادی علی کے سوا کسی سے نہیں ہوگی۔"

ریحان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تارہ ایک دم ہکا بکا رہ گئی۔

"تم فکر مت کرو۔ میں آج بابا سے بات کروں گا۔"

ریحان بولا

"نہیں ریحان بھائی آپ ماموں سے کچھ نہ کہیں میری کوئی پسند و ناپسند نہیں۔ میری امی کا ایک ایک لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس کے خلاف کچھ ہو یہ میں مر کر بھی نہ چاہوں گی۔"

تارہ عزم سے بولی

"کتنی احمقوں والی باتیں کرتی تارہ۔ پھوپھو جان کبھی بھی ایسا نہ لکھتیں۔ اگر ان کو حالات کا علم ہوتا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا بہر حال وہ تمہاری بھلائی کی خواہاں تھیں اور انھوں نے تمام حالات سے بے خبر ہو کر سب کچھ لکھا تھا۔"

ریحان اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ اتنے میں شریف صاحب گھر میں داخل ہوئے۔

"کیوں بھئی خیریت یہ کیا جھگڑا ہو رہا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"آداب۔" انھوں نے ایک ساتھ سلام کیا

"اچھا ہوا بابا۔ اس موقع پر آپ بھی آگئے بخدا اب اس کھیل کو ختم کیجئے۔"

ریحان زندگی میں پہلی بار باپ سے اتنی بلند آواز میں بول رہا تھا۔ تارہ حیران کھڑی تھی۔

"کیا چاہتے ہو ریحان تم؟"

شریف سخت گیر لہجے میں بولے

"بابا یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ نے اس لڑکی کو بلاوجہ پر کاٹ کر قید کر رکھا ہے۔"

وہ بولتے بولتے رکا۔

"مگر میں تو.... میرا مطلب ہے میں تو یہاں اپنی مرضی سے ہوں۔"

تارہ ہمت کر کے بولی۔

"جھوٹ بولتی ہو تم تارہ۔ بے وقوف بناتی ہو سب کو۔ آپ خود سوچئے بابا کہ ایک لڑکی جس کو آپ بچپن سے کسی نام سے منسوب کر دیتے ہیں اور عین شادی کے وقت آپ اس کی شادی کسی دوسرے آدمی سے کر دیتے ہیں۔ کہاں کا انصاف ہے یہ۔" ریحان ہولے سے بولا

"مگر مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

تارہ مری ہوئی آواز میں بولی

"مگر مجھے تو ہے۔"

ریحان جلدی سے بولا۔

"مگر ریحان بھائی۔ میں کسی قیمت پر اپنی ماں کی وصیت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔"

تارہ پھر منمنائی۔

"پھر یہ بھی سن لو تارہ کہ میں بھی تم سے کسی قیمت پر شادی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کیونکہ۔"

ریحان کہتا کہتا چپ ہو گیا۔ باوجود کوشش کے وہ باپ کے سامنے اتنی گری ہوئی بات نہ کہہ سکا۔

"تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟"

شریف صاحب نے بغیر اس سے آنکھیں ملائے کہا۔

"YES (یس)"

ریحان نے جھجکتے ہوئے اقرار کیا۔ تارہ ساکت بیٹھی تھی

"کون ہے وہ"

شریف کی آواز گونجی۔ ریحان خاموش بیٹھی تارہ کو دیکھ رہا تھا جس کی خاطر آج اسے اپنے باپ سے اتنا بڑا جھوٹ بولنا پڑا تھا۔

"کون ہے وہ؟"

ریحان چونک گیا۔ کیا بتائے۔ سوچ میں پڑ گیا۔ دراصل تارہ کی راہ ہموار کرنے کے لئے یہ جھوٹ بولا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ شریف صاحب اس کے پیچھے ہی پڑ جائیں گے حقیقتاً ریحان اس مزاج کا لڑکا تھا کہ اس نے کبھی لڑکیوں کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ نہ کسی لڑکی سے اتنے تعلقات تھے کہ اس کا نام لے لیتا۔ اس نے نظریں اٹھا کر شریف کی طرف دیکھا۔ ان کی سوالیہ نظریں اب بھی اسے گھور رہی تھیں۔

"جی وہ.... د..ا..نش۔"

جانے کیسے مارے گھبراہٹ کے ریحان کے منہ سے خود بخود دانش کا لفظ پھسل گیا۔ اور وہ فوراً ہی تیز قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔

"دانش!"

"شریف اور تارہ ایک ساتھ بڑبڑائے اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"تارہ بیٹے۔ اگر مصروف نہ ہو تو ذرا میرے کمرے میں آنا۔"

شریف نے اسے زور سے آواز دی۔

"جی آئی ماموں میاں۔ میں بالکل خالی ہوں۔"

وہ فوراً ہی کمرے میں داخل ہو گئی۔

"بیٹیا۔ یہاں آؤ میرے پاس۔"

شریف صاحب نہایت نرمی سے بولے اور وہ ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

"بیٹے۔ آج میں سراج ؤ الا گیا تھا۔ سراج بھائی نے فون کر کے بلایا تھا۔ مجھ سے کسی کی حالت دیکھی نہیں گئی۔ وہ سب کے سب تمہارے منتظر ہیں بیٹیا۔"

وہ رُکے۔

ماموں میاں میرے لئے تایا ابو نے اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے تھے۔

تارہ کے لب ہلے

"بیٹیا وہ اور وقت تھا۔ اگر آج تم ان لوگوں کی حالت دیکھ لو تو تم سے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو جائیں۔ تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں اس گھر میں اس قدر پیار حاصل ہے۔ کیا دیا ہے میں نے تم کو سوائے آنسوؤں کے۔"

شیریں کی آنکھیں بھر آئیں۔

"یہ نہ کہیئے ماموں میاں۔"

تارہ ان سے لپٹ کر رو دی۔

"کیسے نہ کہوں بیٹی۔ میں نے ہی تو ہنستے بستے گھر میں آگ لگا دی ہے۔ ریحان مجھ کو الزام دیتا ہے۔ وہ کہتے کہتے پھر رک گئے۔ "مگر اب تو میں چاہتا ہوں کہ تمہاری خوشیاں تم کو واپس لوٹا دوں۔ آج سراج بھائی نے بھکاری بن کر اپنے علی کی خوشیاں مجھ سے مانگی ہیں اور میں ان سے وعدہ کر آیا ہوں بیٹیا۔"

وہ رک گئے۔

"ماموں میاں میری ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کرینگے؟"

تارہ سسک پڑی۔

"بیٹیا یہ تیری ماں سے کیا ہوا وعدہ ہی تو نبھا رہا ہوں تیری ماں تجھے خوش دیکھنا چاہتی تھی نا۔ کل وہ لوگ آ رہے ہیں میری لاج رکھ لینا۔"

شریف بولے اور بھی جانے کیا کچھ کہتے رہے اور تارہ یونہی گم سم خالی دماغ بیٹھی رہی۔

ابھی ابھی وہ سب لوگ تارہ کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور تارہ مسلسل خاموش سوچوں میں گم تھی۔ کیسی آزمائش تھی یہ اس کی۔ آخر ماموں اور ریحان کی جیت ہو گئی تھی نا کتنی بے بس تھی وہ ان سب کے بیچ میں۔ اس نے سوچا اس نے ٹھیک ہی تو لکھا تھا کہ اس کے خاندان کے مرد بہت ضدی ہوتے ہیں۔ کتنا ضدی ہے یہ آفی۔ کیسا کیسا مجبور کیا ہو گا اس نے سب لوگوں کو جو یہاں آنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ اس نے پھر سوچا۔ ابھی ابھی شیریں نے اس کو بتایا تھا کہ تارہ آفی بھیا نے کہا تھا تارہ سے کہنا ہتھیار ڈال دے کیونکہ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔ آفی نے زندگی کے کسی مسئلے میں "نا" کا لفظ نہیں سنا۔ پھر وہ تو ایک لڑکی ہے اور ایسی لڑکی جو ساری زندگی میرے اشاروں پر ناچتی رہتی ہے۔ وہ چاہے دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچ جائے مگر آفی کی دسترس سے باہر نہیں جا سکتی۔

سچ تارہ یقین کرو آفی بھیا دیوانگی کی حد تک تم کو چاہتے ہیں۔ دانش نے کہا تھا۔ سب لوگ کہتے ہیں آفی بھیا کی فطرت زمان چچا مرحوم (تارہ کے والد) سے ملتی ہے۔ وہ بھی بالکل آفی بھیا جیسے ضدی تھے۔ شمع نے کہا تھا اور اتنے میں چچی جان نے اندر آ کر

انھیں واپس چلنے کو کہا تھا۔ اور وہ سب تارہ پر ڈھیر ساری محبت نچھاور کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"ارے واہ محترمہ تارہ صاحبہ واپس آجائیے۔ ریحان جانے کب سے یوں سوچوں میں گم دیکھ رہا تھا۔ وہ چونک گئی۔ ابھی سراج والا جانے میں پورا ایک ہفتہ باقی ہے۔"

وہ پھر مسکرا کر بولا اور تارہ نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

اور یہ ایک ہفتہ اتنی تیزی سے گزرا کہ کوئی احساس ہی نہ ہوا۔ ریحان اور شیریں دونوں بہت مصروف رہے۔ سارے انتظامات کرنا، شاپنگ کرنا، بعض اوقات تو ریحان جھلا اٹھتا۔

"یار یہ اللہ میاں نے ایک بہن بھی عطا کر دی ہوتی تو آج یہ مصیبت نہ ہوتی۔"

وہ تارہ سے کہتا اور مسکرا دیتی۔ کئی دفعہ تارہ ماموں میاں کو یوں کاموں میں جتا دیکھ کر کہہ دیتی

"ماموں میاں آخر ضرورت کیا ہے اتنے اہتمام کی۔"

"واہ بٹیا واہ ارے ایسی دھوم سے رخصت کروں گا اپنی تارہ کو کہ سراج والا والے دیکھتے رہ جائیں گے۔ میں تیرا ماموں ہی نہیں باپ بھی ہوں۔ باپ بن کر رخصت کروں گا۔"

"نہیں نہیں ماموں میاں باپ نہیں۔"

وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے جلدی سے کہہ جاتی اور ماموں کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتے۔

تارہ کی شادی کو صرف ایک دن باقی تھا۔ کل اس کی بارات آنے والی تھی۔ لڑکیوں کا کہیں جی ہی نہ لگتا تھا۔ وہ دوڑ دوڑ کر تارہ کو دیکھنے آجاتیں۔ ان سب نے تارہ کو تین دن پہلے مایوں بٹھا دیا تھا۔ ماموں میاں بھی تو یہی چاہتے تھے۔ آج اس کی بری آئی تھی۔ تائی امی اور پھوپھو وغیرہ اس کو بہت بہت پیار کر کے گئی تھیں۔ تارہ تمہاری دادی اماں نے کہلوایا ہے میری تارہ سے کہنا کہ میں انتظار کا یہ ایک دن کس طرح نکالوں گی۔ چچی نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تارہ سنو۔" دانش نے سب لوگوں کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد سجی سجائی بری میں رکھا ہوا ایک بڑا سا پیکٹ اٹھا کر کہا۔ "آفی بھیا نے کہا ہے یہ خاص الخاص تمہارے لئے ہے۔ اسے اور کوئی ہرگز نہ کھولے اچھا۔"

وہ ڈبہ اس کی گود میں رکھ کر جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ لیکر جلدی سے باہر پلٹی۔ دروازے پر ہی ریحان کو کھڑے دیکھ کر بری طرح جھینپ گئی اور ریحان مسکرا دیا۔ تارہ ڈبہ بیڈ پر رکھ کر جلدی سے دوسرے کمرے میں آگئی۔

تمام کاموں سے فارغ ہو کر رات کو جب وہ سونے کے لئے بیڈ پر آئی تو بیڈ پر وہی ڈبہ اسی طرح پڑا تھا۔ اس نے ہولے سے ڈبہ اٹھا لیا اور کافی دیر تک اسے یونہی دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ ڈبے پر چڑھا خوب صورت رنگین کاغذ ہٹا کر ڈبہ کھولا۔ بہت ہی خوبصورت نیلی آنکھوں والی پلکیں جھپکاتی گڑیا اس کے سامنے تھی جس کے سیاہ ریشم جیسے بال آگے کو پڑے تھے۔

نیلی آنکھوں، کالے بالوں والی گڑیا۔ اس کے بچپن کی سب سے بڑی خواہش آج اس کی گود میں تھی۔ کتنی کتنی منتیں کی تھیں اس نے آفی کی صرف اس کی خاطر۔ کتنے ناز اٹھاتے تھے اس نے آفی کے اور کس قدر بے وقوف بنی تھی اس گڑیا کے پیچھے۔ وہ کافی دیر تک ایک ٹک گڑیا کو دیکھے گئی۔ پھر نہایت احتیاط سے ڈبہ بند کر کے سامنے الماری میں رکھ دی اور خود بستر پر دراز ہو گئی۔

شریف اور ریحان کو ایک ہفتے سے ہی فرصت نہ تھی۔ پھر آج تو وہ دونوں اس قدر مصروف تھے کہ سانس لینے تک کی فرصت نہ تھی۔ دونوں کی خواہش تھی کہ کسی چیز کی کمی نہ رہ جائے۔ ریحان تو کام میں اس قدر مصروف تھا کہ صبح سے اس نے ناشتہ تک نہیں کیا تھا۔ وقت اتنی تیزی سے گزر رہا تھا اور ابھی سینکڑوں کام باقی تھے۔ ادھر بیوٹیشن کو لینے الگ جانا تھا تاکہ تارہ کو تیار کرے۔ حالانکہ شیریں نے کل اس سے پوچھا بھی تھا کہ ریحان بھائی آپ مصروف ہوں گے بیوٹیشن کا انتظام میں کر لوں۔ مگر اس نے یہ کہہ کر کہ نہیں جی آپ تو دولہا والے ہیں اسے منع کر دیا تھا۔

بارات آچکی تھی۔ آفی شیروانی اور شلوار میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ریحان نے آفی کو آج پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آفی کے ساتھ ساتھ سعاد اور عالم اور دوسرے دوست بھی تھے۔ ریحان سعاد سے بہت گرمجوشی سے ملا اور پھر انھیں اسٹیج تک لے آیا۔ سعاد نے آفی سے ریحان کا تعارف بھی اسی وقت کروایا۔ انھیں اسٹیج تک پہنچا کر ریحان نے دیکھا لڑکیوں کی فوج اندر کی طرف جا رہی ہے۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا جلدی سے اندر آیا اور ان سے پہلے ہی تارہ کے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب تارہ کے پاس ہی جائیں گی۔ سب لڑکیاں بھاری غرارے دوپٹے سنبھالے ہنستی مسکراتی وہیں آن موجود ہوئیں۔

"السلام علیکم ریحان بھائی۔"

شیریں نے ہاتھ ماتھے تک لیجا کر جلدی سے سلام کیا۔

ریحان نے مسکرا کر جواب دیا۔
"ذرا اندر جانا ہے ریحان بھائی۔"
شمع بکھرے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ ان سب لڑکیوں کے جھلمل کرتے کپڑے، میک اپ اور تیز خوشبو نے ریحان کو ہوش میں کہاں رہنے دیا تھا۔
"ارے ریحان بھائی کیا سوچنے لگے۔ ہمیں اندر جانا ہے رخصتی جھکی۔"
"اوں ہاں۔ اندر تو آپ لوگ ابھی نہیں جا سکتیں
ریحان مسکراتے ہوئے بولا۔
"دانش تم سفارش کرو نا۔"
شیریں نے ہولے سے دانش کو ٹہوکا لگایا۔ دانش نے اسے گھورا اور ریحان مسکرا دیا۔
نکاح کی رسم ادا کی جا چکی تھی اور مبارک سلامت کا شور مچا ہوا تھا۔ شریف صاحب اور سراج صاحب گلے لگ کر رو رہے تھے۔ اندر عورتیں بھی اس موقع پر آنسو بہا رہی تھیں۔ ہر کوئی مبارک باد دے رہا تھا۔
ہاتھوں میں چھوارے بھرے لڑکیاں آفی کو اندر لا رہی تھیں ریحان، سعاد اور عالم بھی ساتھ تھے۔
"آفی بھیا۔ جوتا چھپائی دیجیے نا۔"
شیریں آفی کا جوتا نچاتے ہوئے بولی۔
"بہت چالاک ہو تم لوگ۔ دونوں طرف سے لوٹ رہی ہو۔"
عالم بولا۔ آفی نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مٹھی بند کر کے شیریں کے ہاتھ میں کچھ رکھا۔ شیریں نے ہاتھ کھولا تو چونی تھی۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ شیریں نے جھٹ سے چونی آفی کے سر کے گرد نظر اتارنے کے انداز میں گھمائی اور قریب کھڑے سعاد کے ہاتھ پر رکھ دی اور اس کے اس انداز پر سب ہی ہنس دیئے۔
"ارے دانش بیٹے۔ ابھی یہ لوگ جانے کتنی دیر یہیں اس بے چارے آفی کو گھیرے رہیں گے۔ تم ذرا تارہ کے کمرے میں دیکھ لینا کیا وہ تیار ہے۔ ابھی بہت سی رسمیں ہونی ہیں۔ ابھی علی کو وہیں لے جانا ہے۔"
پھوپو دانش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔
"اچھا جاتی ہوں پھوپو۔"
دانش اس ہنگامے سے ہٹ کر نہیں جانا چاہتی تھی
"ارے بٹیا جلدی کرو۔ اگر رخصتی میں دیر ہو گئی تو بھائی صاحب ناراض ہوں گے۔"
چچی جان بیچ میں بولیں۔
"اچھا بابا جاتی ہوں۔"
دانش بادل ناخواستہ وہاں سے چل دی۔
کمرہ بند تھا اس نے دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر پھر زور زور سے دستک دی مگر جواب ندارد۔
"ارے بھئی تارہ دروازہ کھولو۔ اور کون ہے اندر۔ دروازہ کھولو۔ میں ہوں دانش۔"
اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور دروازے کو زور لگا کر دھکا دیا۔ دروازہ ایک دم سے کھل گیا۔ ارے واہ یہ تو کھلا ہی تھا۔ وہ فوراً دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی مسہری پر سرخ جوڑے میں سجی بنی دلہن تارہ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔
"واہ بھئی واہ۔ کیا شان ہے بیگم علی آفندی کی۔ بھابی صاحبہ آداب بجا لاتی ہوں۔"
دانش مسکراتے ہوئے بالکل اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ مگر تارہ کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔
"ارے بابا اور کوئی نہیں ہے۔ خالی میں ہوں تہا تھوڑی دیر میں اعلیٰ حضرت آفی تشریف.....
دانش نے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ رکھا اور تارہ کا بے جان جسم اس کے کندھے پر ڈھلک آیا۔
"تا ــــ ر ــــ ہ"
دانش کی اتنی بھیانک چیخ نکلی کہ گھر میں موجود ہر شخص بے تحاشہ چیخ کی طرف بھاگا۔ اور جس نے بھی کمرے میں قدم رکھا اس دلخراش منظر کو برداشت نہ کر سکا۔ دانش ساکت بیٹھی تھی اور اس کی گود میں تارہ کا بے جان جسم۔

"کیا ہوا دانش؟ کیا ہوا۔ بولو۔ جواب دو"!
ایک ساتھ پھوپو، تائی امی، شریف صاحب اور ریحان
نے دانش کو جھنجھوڑا۔
"تارہ۔ تارہ۔ اٹھو۔ خدا کے واسطے اٹھو"
شیریں اور شمع تارہ کو ہلا ہلا کر آوازیں دے رہی تھیں۔
اور آفی اس کو تو کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے سجی سجائی
بے سدھ پڑی تارہ کو دیکھ رہا تھا۔ شریف صاحب نے آگے
بڑھ کر تارہ کو سیدھا کیا اور چچی نے دانش کو پکڑ کر علیحدہ کیا۔ سب
کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
"یہ تو نے کیا کیا تارہ۔ یہ تو نے کیا کیا۔
شریف صاحب تارہ کے مردہ جسم سے لپٹ کر دھاڑیں
مار مار کر رونے لگے۔
"خدا کے واسطے صبر کیجئے بابا"
ریحان نے آگے بڑھ کر شریف صاحب کو علیحدہ کیا
اور تارہ کو سیدھا کر کے لٹا دیا۔ تارہ کی گود سے گڑیا کا ٹوٹا
ہوا سر لڑھک کر نیچے آن گرا۔ وہی نیلی آنکھوں والی گڑیا تارہ کے
بچپن کی شدید خواہش۔ آفی دو قدم آگے بڑھا۔
"اٹھو تارہ اٹھو۔ تم۔ تم یوں مجھے مات نہیں دے
سکتیں۔ تارہ اٹھو ورنہ میں تمہیں.... میں تمہیں"
"آفی بھیا۔ آفی بھیا۔
شمع نے اس کا کندھا ہلایا
"ہوش کرو۔ علی بیٹے ہوش کرو"
سراج صاحب نے اسے روکا جو دیوانگی کے عالم میں
تارہ کے مردہ جسم کو جھنجھوڑ رہا تھا۔
چچا نے آگے بڑھ کر بڑی مشکل سے اسے قابو میں کرنے
کی کوشش کی۔ اس پر تو جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور
اس لمحے ریحان نے نہایت آہستگی سے تارہ کی مٹھی میں دبا ہوا کاغذ
نکالا جو معصوم تارہ کی اس المناک داستان کا آخری ورق تھا۔
آفی!
یاد ہے تم نے کہا تھا کہ آفی جس چیز کی خواہش کرتا
ہے اسکو حاصل کر کے رہتا ہے۔ پھر تم تو ایک
معمولی سی لڑکی ہو۔ تم اس گھر میں ضرور رہ جاؤ گی
اور آفی کی دلہن بن کر جاؤ گی۔
میں نے سنا ہے کہ آفی کہ تم بالکل میرے
باپ کی تصویر ہو، عادتوں میں بھی اور صورت
میں بھی۔ اس باپ کی جس نے میری ماں مظلوم
ماں کو زندگی بھر غم کی آگ میں جلایا ہے۔
آفی! میں نے ساری زندگی تمہاری ہر خواہش
ہر ضد کے آگے سر جھکایا ہے۔ ہر حکم کی تعمیل کی
ہے۔ مگر آج۔ آج آفی یہ کہاں کا انصاف
ہے کہ ہر جنم میں جیت تمہاری ہی ہو۔ کبھی زمان
کے روپ میں۔ کبھی آفی کے روپ میں۔ آج
میری ماں کے ایک ایک دکھ کا ازالہ ہو جائیگا۔
آفی میرا باپ بھی تمہاری طرح ہی تھا۔ جب تم
کو تکلیف پہنچے گی تو میری روح یہ سوچ کر سکون
پا جائے گی کہ میں نے اپنی ماں کے ایک ایک
آنسو کا بدلہ اس شخص سے لے لیا جسے تم سب
زمان چچا کہتے ہو۔
خدا حافظ
تارہ
ریحان کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی
آنکھوں سے کمرے میں دیکھا ہر شخص رو رہا تھا۔ اور آفی۔
وہ تارہ کی مسہری کے سرہانے نیچے بیٹھا بچوں کی طرح بلک
رہا تھا۔ وہ سخت دل فوجی جس نے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیئے
تھے جس نے کسی میدان میں ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ آج ایک
معمولی اور کمزور سی لڑکی اس کو کتنی بڑی مات دے گئی تھی۔
ریحان نے دکھ سے سوچا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بہنے لگی تھیں
اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط قریب کھڑی روتی ہوئی شیریں کی
طرف بڑھا دیا۔ اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا آنسوؤں کا ایک
سمندر تھا جس میں آفی ڈوبا جا رہا تھا۔

انتخاب

رضوانہ خان

سارے گھر والے اُسے پاگل کہتے تھے اُسے ایب نارمل کہہ کر پکارتے تھے مگر وہ قطعی ہوشمند تھی بالکل نارمل تھی ہاں البتہ اس نے اپنے اس خطاب پہ کبھی بھی احتجاج نہ کیا تھا بھلا احتجاج کرنے سے ہوتا بھی کیا اس گھر میں کون ایسا تھا جو اس کے احتجاج پر غور کرتا اس کی بات سمجھتا اور اسے اہمیت دیتا حالانکہ وہ کوئی غیر بھی نہ تھی حمیدہ بیگم کی بھتیجی تھی مگر یہاں نوکروں سے بھی بدتر سلوک کی اہل تھی نوکروں کے گڑگڑانے یا بلبلانے پہ اکثر حمیدہ بیگم کو رحم آجاتا مگر اس کی معصوم صورت پر ان کو کبھی ترس نہ آیا تھا اس کے بہتے آنسوؤں کی انہیں کبھی پرواہ نہ ہوئی تھی اور اس کی معصومانہ فریادوں پر انہوں نے کبھی کان نہ دھرا تھا۔

سارہ بڑی بدنصیب لڑکی تھی اچھی بھلی اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گذار رہی تھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی لہٰذا ان کی خوشیوں کا واحد مرکز تھی ابّو کی بے حد لاڈلی جس چیز کی بھی فرمائش کرتی فوراً پوری ہو جاتی جس کام کو بھی کہتی ابّو اپنے سو کام چھوڑ کر پہلے اس کا کام کرتے غرض اپنی سولہ سالہ زندگی میں اس نے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھا تھا دکھوں اور غموں کے نام ہی سے ناآشنا تھی مگر باوجود اس قدر لاڈ پیار کے انہوں نے اس کی تربیت پہ خاص توجہ دی تھی۔ ضد، خود غرضی اور مغروریت اس میں نام کو بھی نہ تھی نہایت سادہ لوح اور معصوم سی لڑکی تھی۔ اس پر سونے پر سہاگہ قدرت نے اس کو زیور حسن سے بھی دل کھول کر نوازا تھا گھنے سیاہ لمبے بال پرکشش بڑی بڑی آنکھیں ان پر احمریں پلکوں کا جھکاؤ سانولہ کندن کی طرح دمکتا ہوا رنگ بے حد تیکھا ناک نقشہ۔

مگر خدا کو نجانے کیا منظور ہوا کہ جب وہ میٹرک کر چکی تو اس کے پیارے پیارے ابّو اور جان سے پیاری امّی کار کے ایک ایکسیڈنٹ میں اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تنہا چھوڑ گئے اس سمے وہ بلک بلک کر روئی اس کو چاہنے والی دونوں ہستیاں ختم ہو چکی تھیں اب اس بھری پری دنیا میں کوئی اس کا اپنا نہ تھا ایسے میں جب چچا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اس کو اپنا آدھا غم کم ہوتا ہوا نظر آیا یوں وہ چچا کے ساتھ ان کے گھر چلی آئی۔

شروع شروع میں تو اس کے ساتھ بہت رحمدلانہ برتاؤ کیا گیا کافی محبت آمیز سلوک تھا چچا چچی اور اس کی دونوں کزنز حمیرا اور فوزیہ کا مگر چند دنوں بعد ہی اس نے یہ محسوس کیا کہ اب گھر کے سب افراد اس سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے ہیں اور پھر چار پانچ مہینوں میں ہی اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس کی حیثیت اب یہاں صرف ایک نوکرانی کی رہ گئی ہے چچی نے آہستہ آہستہ گھر کے سارے کاموں کا بوجھ اس کے نازک اور ناتواں کندھوں پہ ڈال دیا حالانکہ گھر میں دو ملازم پہلے سے موجود تھے مگر سارہ کے آنے کے بعد وہ صرف نام کے ملازم رہ گئے تھے سارا کام سارہ ہی کرتی مگر نام ان کا ہو جاتا۔

جب ابّو کا انتقال ہوا تھا تو اس نے میٹرک فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا تھا پھر ان کے انتقال کے بعد تو وہ ایسا الجھی کہ انٹر کرنے کا خیال ہی نہیں آیا چند مہینوں تک تو اس کا ذہن بھی اس قابل نہ تھا کہ وہ دلجمعی سے پڑھائی کرتی اسی لئے ایک سال ریسٹ کرنے کے بعد جب اس نے انٹر کرنے کا خیال ظاہر کیا تو چچی نے اس کو ہزار صلواتوں سے نوازا انہوں نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم پڑھ لکھ کر کیا کرو گی آخر کو تمہیں چولہا ہی جھونکنا ہے۔"

اُف ان کا جملہ اس کے دل پر تیر کی طرح لگا اس کا دماغ کئی سال پہلے کی بات سوچنے لگا۔ جب اس کے ابّو نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا بیٹا خوب سارا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا۔"

اس وقت اس نے نہایت شوخی سے انہیں ٹوکا تھا۔

"لکو بڑا آدمی نہیں بڑی عورت۔"

اور وہ اس کے بات پکڑنے پر ہنس پڑے تھے۔

اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے چپ چاپ سر جھکائے وہ ان کے کمرے سے نکل آئی مگر پھر شاید چچا کو اس پر رحم آگیا تھا کہ انہوں نے اس کو کالج میں ایڈمیشن دلوا دیا یوں تو گھر میں چچا کی حیثیت ثانوی تھی سارے گھر پہ چچی کی حکمرانی تھی اور چچا بھی ایسے جورو کے غلام تھے کہ بیوی کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کر سکتے تھے مگر اس معاملے میں انہوں نے پتہ نہیں کیا پٹی اپنی بیوی کو پڑھائی کہ وہ خاموش ہو گئیں اور یوں اسے ایک مقامی کالج میں داخل کروا دیا گیا مگر اس سے بھی اس کے معمول میں فرق نہ آسکا وہ کالج سے آنے کے بعد کولہو کے بیل کی طرح کام میں جُٹ جاتی اور پھر رات کو گیارہ بارہ بجے جب گھر کے تمام افراد محو خواب ہوتے اس کو کاموں سے فرصت ملتی دن بھر کام کرنے کے باعث وہ تھک کر چور ہو چکی ہوتی لہٰذا فوراً ہی گر کر سو جاتی اور یوں اس کو پڑھنے کا ذرا بھی وقت نہ ملتا۔

امتحانات قریب آچکے تھے مگر اُسے ایک لمحے کی بھی

فرصت نہ ملی تھی چچا تو جیسے اس کا ایڈمیشن کرا کے ہر ذمہ داری سے عہدہ برا ہو چکے تھے۔ نہ اس کے پاس پوری کتابیں تھیں نہ نوٹس اور نہ ہی پڑھنے کے لئے وقت ہی ملتا تھا مگر انہوں نے پھر بھی اس کی پروانہ کی یوں بھی ان کی اپنی ہی کاروباری الجھنیں کیا کم تھیں کہ وہ اس کی الجھن پر دھیان دیتے وہ تو صبح کے گئے سات آٹھ بجے گھر آتے تھے لہذا انہیں اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ وہ اس پر توجہ دیتے۔ اس نے جیسے تیسے تمام پرچے دیئے اور رزلٹ کا انتظار کرنے لگی۔

مگر پھر رزلٹ نے آن کر اس کی رہی سہی امید بھی توڑ دی۔ اس دن وہ تڑپ تڑپ کر روئی ہمیشہ فرسٹ پوزیشن لینے والی کی تھرڈ پوزیشن آئی تھی چچی نے تو طعنوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"میں نہ کہتی تھی کہ پڑھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا خواہ مخواہ ہی ہمارے اتنے پیسے ضائع کئے اس سے تو بہتر ہوتا کہ کسی غریب کو ہی دے دیتے اس کا کچھ کام تو بنتا یہ تو بالکل مٹی میں مل گئے۔"

"ہنہ جیسے بڑی غریب پرور ہیں نا۔"

وہ ان کے جملے پر جل کر بڑبڑائی اس دن اس پر جنون سوار ہو گیا غصے سے اخبار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ساری کتابیں پھاڑ ڈالیں قلم توڑ کر پھینک دیا بس اس کی انہی جنونی حرکات کو دیکھ کر اسے پاگل کا خطاب دیدیا گیا دو تین دن تک تو اس پر یہی کیفیت طاری رہی پھر آہستہ آہستہ نارمل ہو گئی جب میری قسمت میں یہی لکھا ہے تو پھر میں کیوں خواہ مخواہ رو رو کر لوگوں کے طنز اور مذاق کا نشانہ بنوں یہی سوچ کر وہ پرسکون ہو گئی اور تقدیر کے لکھے پر شاکر ہو کر زندگی کے دن گزارنے لگی۔

اس دن گھر میں بے انتہا گہما گہمی تھی حمیدہ بیگم ادھر سے ادھر بولائی بولائی سی پھر رہی تھیں حمیرا اور فوزیہ بھی صبح سے اپنے کام میں مصروف تھیں کبھی نئے نئے انداز سے بال سیٹ کرتیں کبھی قسم قسم کے لباس اپنے جسم سے لگا کر آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتیں اور سارہ کی تو شامت ہی آگئی تھی اس کے سامنے مختلف قسم کے کھانوں اور سویٹ ڈشز کی ایک لمبی فہرست تھی اور اسے یہ سب کچھ رات کے کھانے تک تیار کر لینا تھا وہ صبح سے کولہو کے بیل کی طرح کام میں لگی تھی یوں تو ملازمہ کریمن بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی مگر ساری ذمہ داری تو اسی پر عائد ہوتی تھی اور یہ سارا اہتمام اس لئے ہو رہا تھا کہ آج حمیدہ بیگم کے اکلوتے لاڈلے اور بیحد امیر و کبیر بھانجے شاہ رخ صاحب تشریف لا رہے تھے۔

وہ سب لوگ شام کو سیج بن کر ان کو ایئرپورٹ لینے چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد وہ جلدی جلدی ڈائننگ روم ٹھیک کر کے باہر نکلی تو کال بیل بج اٹھی۔

کون ہو سکتا ہے۔؟

وہ سوچتی ہوئی گیٹ کے پاس پہنچ گئی گیٹ کھولا تو چونک پڑی ایک بے انتہا وجیہہ مگر اجنبی شخص کو سامان سمیت کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آپ، آپ کون ہیں"

بوکھلاہٹ میں ہکلا ہکلا کر بولی۔

"میں انسان ہوں کیا آپ کو نظر نہیں آتا۔"

وہ شرارت سے بولا تو وہ مزید بوکھلا گئی۔

"میرا مطلب ہے آپ کا نام کیا ہے۔"

اس نے جلدی سے تصحیح کی۔

"نام"

وہ مسکرایا۔

"میرا نام ہے عبدل بیگ گینگ گپ خان"

نہایت شوخی سے بولا۔

"جی اتنا مشکل نام"

وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ مسکرا رہا تھا، نہایت دلکش انداز سے شرارت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ نجانے کون ہے۔ وہ گیٹ بند کرنے لگی۔

"ارے ارے"

اس نے اپنے ہاتھ سے گیٹ روک لیا۔

"کیا غضب کرتی ہیں مجھے اندر تو آنے دیجئے"

وہ اندر داخل ہونے لگا تو وہ سٹپٹا گئی جھلا کر بولی۔

"آخر آپ ہیں کون کس سے ملنا ہے آپ کو۔"

"صغیر احمد صاحب کا گھر یہی ہے نا"

اس نے ایک لمحے کو رک کر اس سے سوال کیا۔

"جی ہاں مگر آپ ہیں کون"

اس نے الجھ کر پوچھا۔

"بس بس پھر تو ٹھیک ہے"

وہ اس کے سوال کی پرواہ کئے بغیر اندر آ گیا ایک سوٹ کیس اس کے ہاتھ میں تھا اور ایک بیگ کندھے پر لٹک رہا تھا۔ اس نے سامان برآمدے میں رکھ دیا اور مڑ کر پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا جو دنیا جہان کی حیرانی اپنی خوبصورت آنکھوں

میں چھپائے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اس کو اپنی طرف دلچسپی سے دیکھتا پاکر وہ جھینپ گئی جلدی سے نظریں جھکائیں اور پھر کوئی اور بات کیے بغیر کچن میں آ گئی اتنا تو وہ سمجھ ہی گئی تھی کہ وہ تھا کوئی اس کے چچا کا جاننے والا کیوں کہ اس نے ان کا نام جو لیا تھا کچن میں آ کر اس نے کرین کو ساری صورت حال سمجھا کر اس کے پاس بھیجا اور خود جلدی جلدی اپنے کام نمٹانے لگی۔ دس منٹ بعد ہی کرین ہنستی ہوئی واپس آ گئی۔

"کون ہیں؟"

سارہ نے اس کو ہنستے دیکھ کر پوچھا۔

"شاہ رخ صاحب ہیں۔"

کرین نے ہنستے ہوئے بتایا تو وہ متعجب ہو گئی۔

"شاہ رخ صاحب مگر وہ لوگ تو انہیں ایئرپورٹ لینے گئے ہیں۔"

وہ مارے حیرت کے اٹک اٹک کر بولی۔

ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو کافی دیر ہو گئی پہنچنے میں کیونکہ انہوں نے بہت دیر انتظار کیا پھر خود ہی پتہ کے ذریعے پہنچ گئے۔"

"اچھا"

وہ جیسے مطمئن ہو گئی۔

"بی بی چائے بنا دوں جب تک بیگم صاحبہ نہیں آ جاتیں انہیں چائے ہی دے دیں۔"

کرین بولی تو اس نے ہانڈی اتار کر فوراً چائے کا پانی چڑھایا مگر ابھی پانی چڑھا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے سب کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ اوہ تو وہ لوگ بھی آ گئے اس نے پانی اور زیادہ کر دیا پھر جلدی جلدی ٹرے میں برتن سجانے لگی مگر ابھی وہ چائے بنا بھی نہ پائی تھی کہ چچی کی پاٹ دار آواز آئی جو اُسے ہی پکار رہی تھیں۔ وہ جلدی سے ہاتھ پونچھتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی اندر داخل ہو کر اس نے دیکھا شاہ رخ بڑے صوفے پہ نہایت ٹھاٹ سے براجمان تھا اور اس کے دائیں بائیں حمیرا اور فوزیہ شعلہ جوالہ بنی بیٹھی تھیں دوسرے صوفے پر چچی بیٹھی تھیں وہ خاموشی سے ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تو شاہ رخ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ کیا حرکت تھی۔"

چچی نے کڑک کر پوچھا۔

"جی؟"

وہ حیرت سے صرف پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

"گھر آئے مہمان سے ایسا سلوک کرتے ہیں تمہیں تمیز نہیں اندر ہی نہیں آنے دے رہی تھیں۔"

انہوں نے جھاڑ پلائی۔

اوہ تو اس نے پورا کچا چٹھا انہیں بتا دیا اس نے سوچا پھر اپنی صفائی میں بولی۔

"مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ کون ہیں اپنا نام بھی نہیں بتا رہے تھے۔"

"ارے تو کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کہ جب کوئی سامان سمیت آیا ہے تو کم از کم کوئی جاننے والا تو ہو گا ہی۔"

انہوں نے پھر اس کو ڈانٹا اور شاہ رخ سے بولیں۔

"بیٹے تم برا مت ماننا یہ پاگل ہے۔"

"پاگل"

شاہ رخ چونک کر اس اچھی بھلی لڑکی کو دیکھنے لگا جسے وہ بڑے اطمینان سے پاگل کہہ رہی تھیں۔

"کیا واقعی؟"

اس نے باری باری حمیرا اور فوزیہ کو دیکھا۔

"ہاں ایب نارمل سمجھ لیجیے۔"

حمیرا نے بڑے شان سے اپنے بال جھٹکے۔

"کمال ہے۔"

اس نے بے یقینی سے کہہ کر اس کی طرف دیکھا وہ ٹرے شاکی انداز سے اُسے ہی دیکھ رہی تھی وہ اس سے نظریں ملتے ہی گڑبڑا سا گیا۔

"چائے والے بھی پلائی تم نے یا نہیں۔"

اچانک چچی نے پھر اس سے سوال کیا۔

"جی بنا ہی رہی تھی کہ آپ نے آواز دے لی۔"

وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اب بنا رہی تھیں اور اتنی دیر سے کیا کر رہی تھیں۔"

کڑے انداز سے انہوں نے پوچھا تو اس کے کوئی جواب دینے سے پہلے شاہ رخ بول اٹھا۔

"ابھی دس منٹ پہلے ہی تو میں آیا ہوں۔"

نجانے کیوں اُسے اس لڑکی پر رحم آ گیا تھا جو خواہ مخواہ ہی اتنی دیر سے ان کے عتاب کا نشانہ بن رہی تھی۔

اس کے جواب پر چچی خاموش ہو گئیں تو وہ براہ راست اس سے مخاطب ہو گیا۔

"جاؤ جلدی سے چائے لاؤ مگر سنو کہیں شکر کی بجائے نمک مت ڈال دینا پاگل پن میں۔"

شوخی سے اس نے کہا تو حمیرا اور فوزیہ بے اختیار قہقہہ لگا اٹھیں اور وہ دل ہی دل میں اس کو برا بھلا کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

یہ لوگ ہی کیا کم تھے کہ تم بھی آ گئے ہو جان جلانے کو۔

اس نے چائے بناتے ہوئے دکھ سے سوچا اور پھر بجائے خود لے جانے کے چائے کریمن کے ہاتھ بھجوا دی۔

پھر رات کے کھانے پر بھی اس نے اس کا سامنا کرنا بہتر نہ سمجھا پتہ نہیں وہ کیا کیا طنزیہ فقرے کسے۔

اس نے کھانا لگا کر کریمن کو اطلاع دینے بھیج دیا اور خود اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ گئی۔

پھر دوسرے دن صبح وہ ناشتہ لگا کر حسب معمول کھڑی ہو گئی تاکہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو فوراً مہیا کر سکے تب اچانک شاہ رخ نے اسے مخاطب کر لیا۔

"تم نے ناشتہ کر لیا"

اس کے سوال پہ وہ گڑبڑا گئی۔

"وہ میں بعد میں کروں گی۔"

اٹک اٹک کر بولی۔

"تو پھر ہمارے سروں پر کیوں کھڑی ہو۔"

اس نے فوراً ہی دوسرا سوال کر دیا اور وہ بیچارگی سے چچی کی طرف دیکھنے لگی۔

"بیٹے تاکہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو لا دے۔"

چچی نے فوراً شاہ رخ کو جواب دیا تو وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ چپ چاپ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

"بیٹے تم دن کے کھانے میں کیا کھاؤ گے اپنی پسند کی چیزیں بتا دو تاکہ وہی پکوا لوں۔"

انہوں نے نہایت پیار سے پوچھا۔

"سب کچھ کھا لیتا ہوں خالہ جان جو مرضی ہو پکوا لیں۔"

اس نے مسکرا کر جواب دیا پھر سارہ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"یہ کھانا وغیرہ پکا لیتی ہیں؟"

"ہاں کیوں؟"

انہوں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"کمال ہے کوئی گڑبڑ وغیرہ تو نہیں کرتیں میرا مطلب ہے سالن میں نمک کے بجائے شکر ڈال دی۔ یا ہلدی مرچوں کی بجائے چائے کی پتی ڈال دی۔"

اس شرارت پر حمیرا فوزیہ ہنسنے لگی سارہ کھول کر رہ گئی۔ اس توہین پر آنسو اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگے جنہیں اس نے بڑے ضبط سے چھلکنے سے روکا اور چچی بڑے مزے سے مسکراتی ہوئی بولیں۔

"نہیں بیٹے اتنی سمجھ تو میں نے دلا دی ہے۔"

شاہ رخ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا مگر پھر اس کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر پشیمان سا ہو گیا چپ چاپ ناشتہ کرنے لگا۔

اس رات جب وہ اپنا کام ختم کر کے تقریباً گیارہ بجے اپنے کمرے میں جانے لگی تو ڈرائنگ روم سے تیز تیز باتوں اور قہقہوں کی آوازیں صاف اس کے کانوں میں پڑیں تو یہ لوگ ابھی تک جاگ رہے ہیں سوچتی ہوئی وہ برآمدہ پار کرنے لگی تو شاہ رخ نے اچانک ہی اسے آواز دے لی۔

"سنو۔"

وہ زور سے بولا تو وہ رک گئی۔ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑا تھا ہلکے بادامی رنگ کے شلوار قمیض میں بہت شاندار لگ رہا تھا وہ غیر ارادی طور پر پلکیں جھپکانے لگی۔

"ادھر آؤ۔"

اس نے جیسے حکم دیا۔

وہ چند قدم چل کر اس کے نزدیک آ گئی۔

"نام کیا ہے ابھی تمہارا میں بھول گیا۔"

اس نے کہا

"سارہ۔"

سارہ نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

"سارہ یہ کیا نام ہوا مارا مارا پارہ تارا"

وہ قافیہ جوڑنے لگا تو وہ جھنجلا کر بولی۔

"کیوں بلایا ہے مجھے؟"

"وہ تین کپ چائے بنا دو ذرا۔"

فوزیہ نے آ کر بیچ میں کہا تو وہ خاموشی سے واپس باورچی خانے کی طرف چلی۔ جلدی جلدی چائے بنائی اور ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی پھر ٹرے رکھ کر وہ مڑنے لگی تو شاہ رخ بول اٹھا۔

"نہ حسرت تو ہو گی مگر پیالیوں میں بھی بنا دو۔"

"زحمت کی کیا بات ہے حکم دیجئے۔ بجا لانا میرا فرض ہے"

نہ جانے کیوں وہ تلخ ہو گئی اور شاہ رخ اس کے تلخ لہجے پر اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

اس نے خاموشی سے تین پیالیوں میں چائے بنائی اور ان تینوں کے سامنے رکھ کر باہر چلی گئی۔

شاہ رخ کیا آیا تھا جیسے بہار آ گئی تھی گھر میں ہر وقت ہنگامہ اودھم مچا رہتا شاہ رخ کی شرارتیں اور شوخیاں اور حمیرا اور فوزیہ کے کھنکتے ہوئے سریلے قہقہے جو وہ شاہ رخ کی کسی معمولی سی بات پر بھی لگانا اپنا فرض سمجھتی تھیں ہر دم گھر میں گونجا کرتے اکثر وہ لوگ تفریح کے لیے بھی نکل جاتے اور پھر رات گئے گھر واپس آتے چچی نے کبھی اپنی لڑکیوں کو کسی بات پر نہ ٹوکا تھا نہ رات گئے آنے پر نہ شاہ رخ سے ہنسی مذاق دھول دھپا کرنے پر بلکہ وہ تو خود یہ چاہتی تھیں کہ شاہ رخ ان کی کسی لڑکی کو منتخب کر لے وہ ایک امیر کبیر داماد کی ساس کہلائیں وہ اکثر شاہ رخ کے سامنے اپنی بیٹیوں کی تعریفوں کے پل باندھتیں ان کی سلیقہ شعاری، ذہانت اور حسن کے گن گاتیں۔ اس سمے شاہ رخ ایک دلنشین سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ان کی باتیں سنتا رہتا۔

گو کہ امی نے اسے اسی مقصد سے یہاں بھیجا تھا کہ وہ اپنی پسند سے اپنی شریک حیات کا انتخاب کر سکے مگر ابھی تک ان دونوں میں سے کوئی اس کے دل میں وہ مقام پیدا نہ کر سکیں۔ تھیں جن کا وہ متمنی تھا دونوں میں سادگی معصومیت اور سلیقہ شعاری نام کو نہ تھی جس کا اسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا وہ دونوں اس کی آئیڈیل ہرگز نہ تھیں یہ وہ ان کے ساتھ رہ کر جان چکا تھا مگر پھر اس کا دل آئیڈیل کون تھا۔

وہ پاگل لڑکی۔

وہ تمسخر سے ہنس پڑتا واہ میاں آئیڈیل ملا بھی تو کس روپ میں ایک پاگل دیوانی اور ابنارمل لڑکی کے روپ میں مگر وہ پاگل، دیوانی یا ابنارمل تو کہیں سے بھی نہ لگتی تھی وہ اس بات پر حیران بھی ہوتا۔ آخر اس کو پاگل کا خطاب کس وجہ سے دیا گیا۔ کن وجوہات کی بنا پر اسے ابنارمل سمجھا گیا ہے۔ سارے کام ٹھیک کرتی ہے ہر بات کا جواب درست دیتی ہے ایک نارمل انسان کی طرح رہتی ہے پھر آخر وہ کون سی حرکتیں کرتی تھی وہ جو پاگل مشہور ہو گئی تھی۔ وہ خود الجھ الجھ جاتا مگر اس گتھی کو نہ سلجھا پاتا اکثر وہ اسے آزمایا کرتا الٹے سیدھے سوالات کرتا خود پاگل پن کی حرکتیں کرتا مگر اس نے کبھی ایسا تاثر نہ دیا تھا جس سے وہ پاگل یا ابنارمل لگتی

اس دن یونہی اس نے بیٹھے بیٹھے قریب سے گزرتی سارہ کو روک لیا اور پوچھا۔

"ارے کیا تم واقعی پاگل ہو؟"

"یہ انہی لوگوں سے پوچھیے۔"

اس نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

"تو تم اپنے آپ کو پاگل نہیں سمجھتیں؟"

وہ مسکرایا۔

"بھلا کوئی پاگل بھی اپنے آپ کو پاگل سمجھتا ہے۔"

وہ تیکھے انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئی اور وہ ہق دق اس کی پشت دیکھتا رہ گیا

اتنی عقلمندانہ بات اتنا دانشمندانہ جواب ایک پاگل کے منہ سے وہ چکرا کر رہ گیا۔

اس دن جب حمیرا اور فوزیہ کالج گئی ہوئی تھیں شاہ رخ بھی گھر میں نہیں تھا اور چچی بھی پڑوس میں گئی ہوئی تھیں تو وہ باورچی خانے میں اکیلی سالن پکاتے ہوئے نہایت مدھر سروں میں گنگناتی جا رہی تھی۔

وہ اپنے کام میں اتنی منہمک تھی کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب شاہ رخ دروازے میں آ کھڑا ہوا کافی دیر سے وہ دلچسپی سے اس کی گنگناہٹ سن رہا تھا وہ دیگچی پر ڈھکنا ڈھانک کر پلٹی تو غیر متوقع طور پر شاہ رخ کو کھڑا دیکھ کر چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا۔"

شاہ رخ اندر آتے ہوئے بولا۔

"او کچھ نہیں۔"

وہ اپنی بدحواسی پر خجل سی ہو گئی۔

"آپ کھڑے تھے میں سمجھی پتہ نہیں کون ہے۔"

"کیوں کیا مجھے چور یا ڈاکو سمجھی تھیں؟"

اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں"

اس نے سادگی سے اقرار میں سر ہلایا۔

"واقعی پاگل ہو"

وہ دلکشی سے مسکرایا تو اس کا موڈ خراب ہو گیا۔

"کیوں آئے ہیں آپ یہاں۔"

اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"گھر میں کوئی ہے ہی نہیں میرا دل چاہ رہا تھا چائے پینے کو

اسی لئے یہاں آگیا۔
اس نے لغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
" آپ جا کر بیٹھئے میں بنادیتی ہوں۔"
اس نے سنجیدگی سے کہا۔
" کس کے پاس بیٹھوں کوئی ہے ہی نہیں گھر میں۔"
وہ بیچارگی سے بولا تو وہ چپ ہو گئی جلدی سے ہانڈی اتار کر چائے کا پانی چڑھایا اور چائے بنانے لگی وہ اس کے پیچھے کھڑا بغور اس کی پشت کو دیکھنے لگا اس کے لمبے سیاہ بال پشت پر کھلے لہرا رہے تھے شاید اُسے انہیں باندھنے کی بھی فرصت نہ ملی تھی شاہ رخ کو نجانے کیا سوجھی اس کے بال اپنے ہاتھ پر لپیٹ لئے وہ چونک کر پلٹی وہ عجیب شرارت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا وہ اس کی نظروں سے نظریں ملتے ہی پلٹ گئی۔
" چھوڑئیے میرے بال۔"
اس نے جھٹکے سے اپنے بال چھڑانا چاہے مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔
" چھوڑتے نا۔"
وہ جھنجھلا کر بولی۔
" چھوڑئیے نا۔"
اس نے شوخی سے اس کی نقل اتاری۔
" چھوڑئیے۔"
وہ رونے کو تھی کہ اس نے اس کے بال چھوڑ دیئے پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
" بس اتنی ہمت تھی چھڑا لیتیں تو جانتا۔"
وہ کچھ نہ بولی چپ چاپ چائے بنانے لگی چائے بنا کر پیالی اس کو پکڑائی تو وہ بجائے باہر جانے کے وہیں ایک کنستر پر ٹک کر بیٹھ گیا۔
" یہ کیا۔"
وہ لوکھلا کر رہ گئی ایک تو ویسے ہی اس کے کھڑے رہنے سے اسے اُلجھن ہو رہی تھی وہ ٹھیک طرح سے کوئی کام نہ کر پا رہی تھی، اُوپر سے وہ اور کمپل ہو گیا۔
" آپ جاتے کیوں نہیں آخر۔"
وہ جھلا کر بولی۔
" کیوں جاؤں۔ یہاں تمہاری حکومت ہے کیا۔ میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا جہاں مرضی آئے گی بیٹھوں گا۔"
وہ تڑخ سے بولا۔

" ٹھیک ہے پھر آپ بیٹھے میں ہی چلی جاتی ہوں۔"
اس کو اس کی خواہ مخواہ کی ضد پر غصہ آ گیا۔
تیزی سے باورچی خانے سے باہر جانے لگی۔ تو شاہ رخ نے لپک کر پیچھے سے اسکا لہراتا ہوا آنچل تھام لیا۔
وہ جھنجھلا کر مڑی۔
" کیا کسی ایک کا باہر جانا بہت ضروری ہے دونوں مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔"
گہری گہری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے شاہ رخ نے ذومعنی بات کی تو وہ گڑبڑا کر نظریں چرا گئی۔
" جواب دو نا میں اور تم مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔"
اس نے اُسے خاموش دیکھ کر پھر پوچھا۔
" جی نہیں۔"
وہ اچانک ہی تلخ ہو گئی اُسے اس ہرجائی صفت شخص سے نفرت سی ہونے لگی جو حمیرا اور فوزیہ کے ساتھ بھی اسی قسم کی حرکتیں کرتا رہا تھا اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کو ان کی ناز برداریاں کرتے ہوئے تکلف کی حدیں پار کرتے ہوئے اور اب جب وہ دونوں گھر میں نہیں تھیں تو وہ وقت گزاری کے لیئے اس کے پاس آگیا تھا۔ اور کم و بیش اسی قسم کی حرکتیں کر رہا تھا کتنے ذلیل ذہنیت کے ہوتے ہیں یہ مرد اس نے تنفر سے سوچا اور پھر ایک جھٹکے سے آنچل چھڑانا چاہا مگر وہ مضبوطی سے تھامے تھا۔
" چھوڑ دیجئے۔"
وہ سخت لہجے میں بولی۔
" آپ اپنی تفریح کا نشانہ کسی اور کو بنائیے گا میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو آپ کی چھچھورا باتوں میں آجاؤں اور آپ کی وقت گزاری کا سامان بن سکوں۔"
نہایت طنزیہ انداز میں اس نے کہا تو وہ متعجب سا اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ آنچل کی گرفت کمزور پڑ گئی تو اس نے ایک جھٹکے سے اسے چھڑایا اور ایک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی۔
واہ میاں۔
اس کے جانے کے بعد اس نے دیدے گھمائے۔
یہ لڑکی پاگل ہے۔
اس نے حیرت سے سوچا۔
ارے یہ تو دوسروں کو پاگل کر دے کمال ہے اتنی سمجھداری کی باتیں، اتنی کھری طنزیہ اور کاٹ دار باتیں اور وہ بھی ایک پاگل

اور ایب نارمل لڑکی کے منہ سے میں تو تیات تک نہیں مان سکتا کہ یہ لڑکی پاگل ہے۔

وہ سوچ سوچ کر الجھتا رہا معاً اس کو خیال آیا کہ سارہ کو کام کرنا ہے اور میں یہاں رہا تو وہ کام نہ کر پائے گی پھر بعد میں خواہ مخواہ چچی کی صلواتیں سننا پڑیں گی۔ یہی سوچ کر وہ سارہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی چہرہ گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا ہاتھ میں کوئی تنکا تھا جسے سیڑھی کی سطح پہ پھیر رہی تھی وہ بغیر آہٹ کیے اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کے جھکے ہوئے سر پر ایک پیار بھری چپت لگا دی۔ چونک کر سارہ نے سر اٹھایا وہ ایک پیر سیڑھی پر رکھے اس پہ جھکا ہوا تھا اس کے سر اٹھاتے ہی پیار سے بولا۔

"جاؤ جاکر کام کرو اب میں نہیں ستاؤں گا۔"

اس کے لہجے پر وہ خاموش بیٹھی اس کی صورت دیکھتی رہی۔

"یقین نہیں آرہا کیا۔"

اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں نے کہا حضور ملکہ عالیہ اب یہ آوارہ ذلیل اور بدمعاش شخص آپ جیسی نیک معصوم اور شریف بی بی کو ہرگز نہیں ستائے گا۔ آپ جاکر اپنا کام ختم کر لیجئے۔"

وہ شوخی سے بولا تو اس کے مزاحیہ انداز پر مسکراہٹ آگئی جسے چھپانے کو اس نے جلدی سے چہرہ نیچے جھکا لیا۔

وہ بھی ہنستے ہوئے سیدھا ہو گیا پھر بولا۔

"چلو چلو زیادہ بناوٹ کرو میں مسکراہٹ دیکھ چکا ہوں۔"

اس کے کہنے پر سارہ نے جلدی سے سنجیدہ ہو کر اپنا منہ اٹھایا اور تیزی سے بولی۔

"میں نہیں مسکرا رہی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں جی ہاں غلط فہمی کس کو ہوتی ہے اور کس کو نہیں اس کا اندازہ آپ کو جلد ہی ہو جائے گا۔"

بڑے معنی خیز انداز میں وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا تو اس نے جلدی سے نظریں چرالیں۔ وہ ایک لمحے تک اس کو غور سے دیکھتا رہا پھر تیزی سے مڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

اس کے جانے کے بعد وہ فوراً باورچی خانے میں آئی جلدی جلدی سالن پھر سے چڑھایا اور آٹا گوندھنے لگی ابھی وہ آٹا گوندھ کر اٹھی ہی تھی کہ چچی باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔

"یہ کیا اب آٹا گوندھا ہے ڈیڑھ بج رہا ہے ابھی تک کھانا نہیں تیار ہوا۔"

"بس ابھی روٹی پکاتی ہوں۔"

اس نے مدھم لہجے میں کہہ کر جلدی سے توا چڑھایا۔

"میں پوچھ رہی ہوں ابھی تک کیا کرتی رہیں جواب روٹی پکے گی۔"

چچی کا پارہ چڑھ چکا تھا۔

"سالن پکا رہی تھی۔"

وہ آہستہ سے بولی۔

"وہ تو روز پکتے ہیں مگر ایک ڈیڑھ بجے تک کھانا تیار ہو ہی جاتا ہے آج کیا خاص بات ہو گئی ضرور آرام کرنے لگی ہو گی بہت عیش پسند ہو گئی ہو مفت کی روٹیاں ملتی ہیں نا دماغ درست کروا لینا ورنہ میں درست کر دوں گی۔"

چچی کو تو بس اس کو پھٹکارنے کا موقعہ ملنا چاہیے۔

ان کی ڈانٹ سن کر ایک دفعہ تو اس کا دل چاہا کہ وہ صاف کہہ دے کہ مجھ سے کچھ پوچھنے کے بجائے اپنے ان لاڈلے بھانجے سے پوچھیے جنہوں نے مجھے کام نہیں کرنے دیا مگر پھر اس نے سوچا کہ اگر میں نے یہ کہہ دیا تب بھی مجھے ہی ڈانٹ پڑے گی۔ انہیں تو وہ کچھ نہیں کہیں گی۔ یہی سوچ کر وہ خاموش رہی۔ ہاں اپنی اس بے بسی پر اس کے آنسو ضرور نکل آئے اور یہ آنسو جیسے چچی کے لئے جلتی پر تیل کا کام کر گئے تڑخ کر بولیں۔

"ٹسوے بہانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو ان مگرمچھ کے آنسوؤں سے مرعوب ہو جاؤں آدھے گھنٹے میں کھانا تیار ہو جائے۔ حد ہو گئی حمیرا اور فوزیہ بھی کالج سے آچکی ہیں شاہ رخ بھی بھوکا بیٹھا ہے اور اب تک کھانا ہی نہیں تیار ہوا۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں تو اس نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور جلدی جلدی روٹی ڈالنے لگی۔

دوسری طرف کھڑکی سے لگے ہوئے شاہ رخ کا دل کراہ کر رہ گیا۔ اتنا ظلم اتنا ستم وہ اپنی خالہ کے اس گھناؤنے روپ پر حیران رہ گیا سارے زمانے پر محبت نچھاور کرنے والی خالہ ایک مظلوم سی لڑکی سے کس قدر بہیمانہ برتاؤ کرتی ہیں یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا نہ میں اس کا وقت برباد کرتا اور نہ اس پر اتنی جھاڑ پڑتی وہ اپنے

آپ کو اس کا مجرم سمجھنے لگا خود کو ملامت کرنے لگا میں اپنے جرم کی تلافی ضرور کروں گا میں اپنی خطا کی معافی ضرور مانگوں گا اس مظلوم و معصوم لڑکی کو ان جیسے وحشیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ ہرگز نہ بننے دوں گا۔ ایک عزم سے وہ سوچتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"کہاں تھے بیٹے۔"

حمیدہ بیگم نے محبت سے پوچھا اور ان کے محبت بھرے انداز پر اس کا دل جل کر خاک ہو گیا ایک نفرت بھری نگاہ اس نے اپنی خالہ پر ڈالی مگر پھر مصلحتاً کوئی کھرا جواب دینے کے بجائے اپنے لہجے کو نارمل بنا کر بولا۔

"باتھ روم میں۔"

اور اس سے پہلے کہ حمیدہ بیگم کچھ اور کہتیں کریمن نے آ کر کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔

"چلو بیٹے۔"

وہ اٹھتی ہوئی بولیں تو سب ہی اٹھ کے ڈائننگ روم میں آ گئے۔ سارہ فرج سے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں نکال کر میز پر رکھ رہی تھی۔

"امی آج کچھ کھانے میں دیر ہو گئی ہے۔"

حمیرا نے بیٹھتے ہوئے سارہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو شاہ رخ اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔

"ہاں بیٹی نجانے کیا کر رہی تھی یہ جو کھانے میں دیر ہو گئی۔"

انہوں نے شاہ رخ کے سامنے زیادہ ڈانٹنا مناسب نہ سمجھا۔

"کیا ہو گیا بھئی اگر آدھے گھنٹے کی دیر ہو گئی تو کیوں تمہارا دم نکلنے لگا۔"

شاہ رخ نے کچھ جل کر اور کچھ مزاحیہ انداز میں بات کاٹی تو حمیرا ہنسنے لگی۔ فوزیہ اور حمیدہ بیگم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

اونہہ جیسے واقعی بڑی خوش اخلاق ہیں۔

وہ جل کر اپنی پلیٹ جھک گیا سارہ باہر جا چکی تھی۔

اسی شام اس نے کلفٹن پر ان دونوں کو خوب گھمایا چھ بجے سے لے کر رات کے دس بجے تک وہ ان کو پیدل ناچ کرواتا رہا اس نے سوچا تھا کہ آج اس قابل ہی نہ رکھوں گا کہ رات کو دیر تک جاگیں کیونکہ رات تو اس نے سارہ سے معافی مانگنے کا پروگرام بنایا تھا اور اگر وہ لوگ حسب معمول رات گئے تک جاگتی رہتیں تو پھر وہ سارہ سے بات نہ کر سکتا تھا یہی سوچ کر اس نے پکچر ملتوی کر کے کلفٹن گھومنے کا پروگرام بنا لیا۔ رات کو دس سوا دس بجے جب وہ لوگ واپس آئے تو تھک کر چور ہو گئے تھے حمیرا اور فوزیہ تو کھانا کھاتے ہی سونے چلی گئیں حمیدہ بیگم تھوڑی دیر تک اس سے باتیں کرتی رہیں پھر وہ بھی اسے سونے کی تاکید کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں تو وہ برآمدے میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

وہ رات بڑی حسین تھی آسمان پر بے شمار تارے جگمگا رہے تھے۔ ان تاروں کے جھرمٹ میں چاند بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا ٹھنڈی ٹھنڈی پروا ادھر سے ادھر اٹھلاتی ہوئی گزر رہی تھی درخت ہوا کی حسین چھیڑ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے عجیب مستی بھرے انداز میں جھوم رہے تھے اور شاہ رخ خاموشی سے سیڑھیوں پر بیٹھا اپنی انگلی سے سطح پر الٹے سیدھے نقش و نگار بنا رہا تھا۔

سارہ نے جلدی جلدی کام ختم کر کے اپنے کمرے کا رخ کیا مگر برآمدے سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹھک گئی کوئی سیڑھیوں پر سر جھکائے بیٹھا تھا وہ غور کرنے لگی کہ کون ہو سکتا ہے تو ذرا سی دیر میں ہی اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ شاہ رخ ہے اس نے دبے پاؤں بغیر آہٹ کئے آہستگی سے وہاں سے گزر جانا چاہا مگر جیسے ہی وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی شاہ رخ نے اسی لمحے سر اٹھایا۔

"آپ۔"

وہ اچانک اس کے سر اٹھا لینے سے گھبرا کر بولی۔

"ہوں۔"

وہ مدھم لہجے میں بولا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"میرا میرا انتظار۔"

وہ بے حد گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ہاں تمہارا انتظار"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"مگر تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو۔ میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں تو۔"

وہ قدرے سنبھل گئی۔

"کہیے کیا بات ہے۔"

"دراصل بات یہ ہے۔"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ سارہ اس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

چاند کی روپہلی روشنی میں اس کا دراز قد کتنا نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اس کی وجاہت پر غور کرتے ہوئے حمیرا اور فوزیہ کی قسمت پر رشک کرنے لگی۔

"بات یہ ہے کہ میں"

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میں اپنے ناکردہ جرم کی تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ صبح میک کر ذرا سے مذاق کی وجہ سے تمہیں جو ڈانٹ پڑی میں اس کے لئے تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تم مجھے ڈانٹ لو مجھے مار لو سارہ لیکن مجھے معاف کر دو پلیز۔"

پشیمان سے لہجے میں کہہ کر اس نے سارہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

اور سارہ اس کی اس حرکت پر سٹپٹا کر رہ گئی۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ہکلا ہکلا کر وہ بولی جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔

"میں پورے خلوص سے تم سے معافی مانگ رہا ہوں سارہ مجھے معاف کر دو ورنہ مجھے چین نہیں آئے گا میں اپنے آپ کو تمہارا مجرم سمجھتا رہوں گا۔ مجھے ضمیر کی خلش مار ڈالے گی سارہ پلیز۔"

وہ سراپا التجا بن گیا۔

"معافی مانگنے کی کیا بات ہے شاہ رخ صاحب آپ خواہ مخواہ فکر کر رہے ہیں ایسا تو اکثر ہوتا رہتا ہے آپ نہ بھی ہوتے جب بھی ایسا ہوتا بلکہ ہوتا ہی رہا ہے۔"

وہ نجانے کیوں تلخ ہو گئی۔

"ہاں ہوتا رہا ہو گا سارہ مگر اب نہیں ہو گا۔"

وہ ایک عزم سے بولا۔

"جی؟"

وہ اس کے پرعزم لہجے پر چونک پڑی۔

"ہاں میں نے اپنی خالہ کا یہ ظالمانہ روپ آج ہی دیکھا ہے اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد آئندہ کبھی ایسا نہ ہو گا۔ اب ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب میں مر جاؤں اس دنیا کو ہی چھوڑ جاؤں۔"

اس کے پختہ ارادوں اس کے مردانہ عزائم پر وہ کانپ گئی حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر الجھ کر بولی۔

"مگر آپ کیوں بیچ میں پڑ رہے ہیں میری وجہ سے کیوں مصیبت مول لے رہے ہیں۔"

"تمہیں نہیں پتہ؟"

وہ اس کے پوچھنے پر اچانک ہی اس پر جھک کر بڑے پیار سے انداز میں سرگوشی کر بیٹھا۔

"جی"

وہ اس کے مسحور کن قرب کے احساس سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"مجھ سے کیوں ڈرتی ہو؟"

وہ اس کے پیچھے ہٹنے پر جھنجھلا گیا۔

"محافظ سے بھی کہیں ڈرا جاتا ہے؟"

وہ اس کے اور قریب ہو کر آہستہ سے بولا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

وہ اس کے رویئے سے کچھ سمجھ کر اور کچھ نا سمجھ کر الجھن میں پڑ گئی۔

"ادھر آؤ تو سمجھاؤں نا تم تو یوں بھاگ رہی ہو جیسے میں آدم خور ہوں تمہیں کھا جاؤں گا۔"

وہ پھر جھنجھلایا۔

وہ خاموش کھڑی رہی اس کی عجیب عجیب باتوں سے الجھ رہی تھی آخر وہ کیا سمجھانا چاہتا ہے وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان رہنا چاہتی تھی اسے اپنی قسمت پر اعتماد جو نہ رہا تھا۔ شاہ رخ اس کو سوچوں میں گھرا دیکھتا رہا پھر نہایت آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا وہ چونک پڑی غور سے شاہ رخ کو دیکھنے لگی آج اس کی آنکھوں میں ایک نئی جوت جگمگا رہی تھی۔ خلوص پیار محبت تحفظ ان سب جذبوں کا اظہار اس کی آنکھوں سے صاف نمایاں ہو رہا تھا وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے پلکیں جھپکانے لگی۔

"کچھ سمجھیں؟"

شاہ رخ نے اس کو پلکیں جھپکاتا دیکھ کر آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کی وہ پریشان سی ہو کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کے مضبوط مردانہ ہاتھوں کے آگے ہار گئی تو روہانسی ہو کر بولی۔

"چھوڑیئے نا!"

"میں نے تمہارا ہاتھ چھوڑنے کے لئے تو نہیں تھاما ہے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنانے کو تھاما ہے ان ظالموں سے تمہارا پیچھا چھڑانے اور تمہیں تحفظ کا پورا بھرپور احساس دینے کے لئے تھاما ہے تم سے شادی کرنے کے لئے تھاما ہے۔"

وہ بڑے جوش میں بولے گیا۔

"شادی؟"

اس نے ایک زبردست جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"آپ ہوش میں تو ہیں؟"

تیکھے انداز میں اس سے پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں؟"

اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ایک پاگل لڑکی سے آپ؟"

"پاگل لڑکی؟"

شاہ رخ بیچ سے اس کی بات کاٹ کر زور سے ہنسا۔

"تم پاگل ہو؟"

وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟"

وہ چڑ کر بولی۔

"تم پاگل ہو۔"

وہ ہنسی روک کر بولا۔

"ارے تم تو دوسروں کو پاگل کر دو۔"

"جی؟"

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"اور کیا جس نے مجھ جیسے ہوشمند کو پاگل کر دیا وہ خود کیا پاگل ہوگا۔ میں قیامت تک نہیں مان سکتا۔ کہ تم پاگل ہو اس میں بھی ان لوگوں کی کوئی سازش ہے۔"

وہ بڑے وثوق سے بولا۔

وہ خاموش کھڑی رہی تو اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"مجھ پر اعتماد کرو سارہ مجھے سب کچھ بتا دو اپنے متعلق اپنے حالات کے متعلق تم کون ہو ان کی کیا لگتی ہو یہاں کیسے آئی ہو میں پوری تفصیل جاننا چاہتا ہوں سارہ؟"

اس کے پیار بھرے لہجے پر اس کے محبت بھرے انداز پر جانے کس جذبے کے تحت بے اختیار ہی سارہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں وہ جو کتنے سالوں سے محبت کی متلاشی تھی پیار کی بھوکی تھی شاہ رخ کے پیار بھرے انداز پر بکھر سی گئی اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی آنسو لڑیوں کی سی صورت میں اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تو شاہ رخ نے اسے کندھوں سے تھام کر سیڑھیوں پر بٹھا دیا۔ وہ گھٹنوں پر اپنا سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ شاہ رخ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اس کے بالکل قریب پھر مدھم آواز میں بولا۔

"تم آج خوب دل بھر کر رو لو سارہ پوری طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال لو لیکن آج کے بعد میں تمہیں رونے نہیں دوں گا تمہاری آنکھوں میں کبھی آنسو نہ آنے دوں گا۔"

وہ مستحکم انداز میں کہہ کر خاموش ہو گیا۔

سارہ روتی رہی پندرہ بیس منٹ کے بعد جب اس کا رونا بند ہوا تو شاہ رخ نے پیار سے اس کا سر اٹھایا اور اس کی بھیگی بھیگی دھلی دھلی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"بس یا ابھی کچھ اور آنسو باقی ہیں اگر باقی ہوں تو وہ بھی بہا لو بسم اللہ"

اس کی شوخی پر سارہ جھینپ کر مسکرا دی۔

"تو اب شروع ہو جاؤ مجھے پوری تفصیل بتا دو؟"

اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔ تو سارہ نے رک رک کر اٹک اٹک کر اپنے پورے حالات من و عن شاہ رخ کو بتا دیئے اور سارا قصہ سننے کے بعد شاہ رخ تو ششدر رہ گیا۔

"تو تم ان کی بھتیجی ہو اور وہ تمہارے ساتھ نوکروں سے بھی بدتر سلوک کرتی ہیں؟"

وہ حیرت سے بھرپور آواز میں بڑبڑایا۔

وہ خاموش بیٹھی آنسو پونچھتی رہی جو قصہ بتانے کے دوران پھر بہہ نکلے تھے۔

"سارہ؟"

شاہ رخ نے پیار سے لبریز آواز میں اسے پکارا۔

"جی؟"

اس نے ہولے سے کہا۔

"ادھر دیکھو میری طرف۔"

اس نے ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا جو پورا آنسوؤں سے تر تھا۔

"بس اب مت رونا مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے مگر آج سارہ کے دل کا سارا غبار جیسے آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا تھا اس کے چپ کرانے پر آنسو اور تیزی سے بہنے لگے شاہ رخ نے بے خود ہو کر اس کا سر اپنے شانے سے لگایا تو جیسے سارہ کے بے قرار من کو قرار آ گیا ذہن کو آسودگی اور روح کو چین مل گیا۔

"شاہ رخ"

سارہ نے بے خودی میں سرگوشی کی۔

"ہوں؟"

"آپ مجھے سہارا دے کر بے سہارا نہ کر دیجئے گا منزل دکھا کر بھٹکا مت دیجئے گا۔"

وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں جیسے کسی خدشے کے تحت بولی۔

"سارہ"

شاہ رخ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اپنے چہرے کے مقابل کر لیا۔

"تمہیں میری بات پر اعتبار نہیں آرہا مگر مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کیونکہ تمہیں دکھ بھی تو اپنوں نے دیئے ہیں تو تم بھلا ایک غیر کی بات کا کیسے اعتبار کرو گی۔ مگر میں تمہاری تسلی کے لئے خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تم سے شادی کر کے تمہیں ان ظالموں کی قید سے ضرور رہائی دلاؤں گا چاہے سارا زمانہ ہی کیوں نہ مخالف کھڑا ہو بولو آپ کو یقین آیا میری بات کا۔"

اس نے بھرپور لہجے میں کہہ کر اس سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گڈ۔"

وہ نہال ہو گیا پھر شوخ تبسم سے پوچھا۔

"تو پھر میں امی کو خط لکھ دوں کہ میں نے آپ کے لئے ایک پاگل اور دیوانی سی بہو پسند کر لی ہے۔"

تو یہ اس کے شوخی بھرے انداز پہ وہ بری طرح شرما گئی چہرے پر حیا کی سرخی پھیلنے لگی۔ شاہ رخ نہایت دلچسپی اور شوق سے اس کے چہرے پر پھوٹتی شفق کو دیکھنے لگا۔

اچانک کہیں دور مرغے نے اذان دی تو دونوں ہی چونک پڑے۔

شاہ رخ نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔

"تین بج گئے ہیں یار"

اس نے گھڑی سارہ کے آگے کر دی۔

"اوہ"

سارہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"اتنی رات ہو گئی۔"

گھبرا کر وہ بولی۔

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔"

شاہ رخ نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں تو۔"

وہ جھینپ گئی۔

"میں اس لئے کہہ رہی تھی کہ صبح اٹھنا بھی ہے۔"

"ہوں بس چند دن تک اور تکلیف برداشت کر لو پھر صبح تمہیں نہیں اٹھنا پڑے گا۔"

شاہ رخ نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے تسلی دلائی پھر بولا۔

"چلو تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں اب تم آرام سے سو جاؤ میں بھی تھوڑی نیند مار لوں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس کے کمرے تک چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن صبح شاہ رخ بہت دیر سے اٹھا سب ہی ناشتہ کر چکے تھے۔

"مجھے کیوں نہیں اٹھایا۔"

اس نے حمیرا کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔

"بیٹا میں نے منع کر دیا تھا کہ تمہیں بے آرام نہ کریں تم بھی تو رات کو تھک گئے تھے۔"

حمیرا سے پہلے حمیدہ بیگم نے جواب دیا

رات۔ رات کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں نشہ سا تیرنے لگا۔ انگ انگ میں سرور و انبساط کی لہریں سی دوڑنے لگیں کتنی حسین اور سہانی رات تھی جب اس نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا تھا۔ آپ ہی آپ ایک دلنشین سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی۔

"کیوں مسکرا رہے ہیں۔"

فوزیہ نے اس کو خود بخود مسکراتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہوں۔"

وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سوچ رہا تھا کہ کل ہم لوگ کتنا گھومے جو آتے ہی سب بے ہوش ہو کر گر پڑے۔"

اس نے فوراً بات بنائی تو وہ لوگ بھی ہنسنے لگی۔

"اچھا اب ہنستی ہی رہوں گی کیا ناشتہ نہیں کرواؤ گی بھائی کو۔"

"جاؤ جا کر سارہ سے کہو ناشتہ لگائے۔" حمیدہ بیگم نے کہا۔

"اوہ سارہ۔"

وہ مسرور مسرور سا ڈائننگ روم کی طرف چلا گیا کرسی پر بیٹھ کر وہ سیٹی کی دھن پر کوئی شوخ سا گیت گانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہی سارہ ٹرے اُٹھا کر اندر آئی شرمائی سی شاہ رخ اس کو وارفتگی سے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"اب اُٹھے ہیں آپ"

شرمگیں سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی۔

"ہوں تمہارے تصور نے بچایا نہ چھوڑا نیند ہی نہیں آ رہی تھی صبح کے قریب بڑی مشکل سے نیند آئی تو اب کھلی ہے آنکھ"

مسکرا کر اس نے کہا تو وہ ٹرے رکھ کر واپس مڑنے لگی۔ دن کا وقت تھا اس لیے خوف تھا کہ اگر اس نے نظر بھر کر شاہ رخ کو دیکھ بھی لیا تو ان لوگوں کو شبہ نہ ہو جائے۔

"ارے کہاں چلیں"

شاہ رخ نے اس کو مڑتا دیکھ کر جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے چھوڑیئے"

وہ بے حد گھبرا گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

"کیوں۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

"کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔"

وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"وہی جو سوچنا چاہیئے۔"

وہ مسکرایا۔

"پلیز ہاتھ تو چھوڑ دیجئے۔"

وہ ڈر کے مارے رو دینے کو تھی۔

"اچھا بابا رو تو نہیں"

اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

"مگر سنو تم جاؤ گی نہیں۔"

بہت رعب سے وہ بولا۔

"کیوں" وہ اُلجھ گئی۔

"بس تم رہو گی تو میں ناشتہ کروں گا ورنہ نہیں"

وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"مگر مجھے ابھی کام کرنا ہے"

اس نے ٹالنا چاہا۔

"کام ہوتا رہے گا۔ دس منٹ کی دیر کوئی دیر نہیں ہوتی میں کروا لوں گا تمہارے ساتھ کام"

"اچھا"

وہ اس کی بچگانہ بات پر ہنس پڑی۔

"سنو مت کیا میں کام نہیں کر سکتا۔"

وہ چڑ گیا۔

"نہیں جناب آپ تو ہر فن مولا ہیں۔"

وہ مسکرائی۔

"طنز مت کرو اچھا یہ بتاؤ تم نے ناشتہ کر لیا۔"

خود کھاتے کھاتے اچانک اس کو اس کا خیال آ گیا۔

"جی ہاں"

وہ آہستہ سے بولی۔

"لو"

اس نے اچانک ڈبل روٹی پر آملیٹ رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔

"منہ کھولو"

"میں کر چکی ہوں"

وہ سپٹا گئی۔

"کوئی بات نہیں یہ میں کھلا رہا ہوں میرے ہاتھ سے کھاؤ"

وہ پیار سے بولا۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں کوئی دیکھ لے گا۔ تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔"

وہ جھنجلا کر بولی۔

"کوئی نہیں دیکھے گا تم دیر لگاؤ گی تو ضرور کوئی کمرے میں آ جائے گا جلدی سے کھا لو۔"

وہ بالکل بچوں کی طرح ضد کر رہا تھا۔

اور اس کی ضد سے مجبور ہو کر ناچار سارہ نے اس کے قریب جا کر منہ کھول دیا۔

"شاباش اچھے بچے ایسے ہی کہنا مانتے ہیں۔"

وہ اس کے منہ میں نوالہ ڈال کر بولا۔

سارہ جلدی سے سیدھی ہو کر پرے ہٹ گئی۔ اتنا بڑا نوالہ تھا پورا منہ بھر گیا۔ وہ جلدی جلدی نگلنے لگی۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر ہنسنے لگا۔ پھر ایک نوالہ خود کھانے کے بعد دوسرا پھر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا"

وہ غصے سے بولی۔

"آپ تو اب پھیلنے لگے۔"

"بس یہ آخری ہے جلدی سے شاباش۔"

اس نے منت کی تو سارہ نے اپنا پیچھا چھڑانے کو جلدی سے منہ کھول دیا۔ مگر وہ نوالہ کھا کر جیسے ہی پیچھے ہٹی حمیرا کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی۔

"ابھی تک آپ نے کیا نہیں ناشتہ؟"

"بس کر چکا۔ اسے تم چائے بنا دو۔"

وہ اس کو جواب دے کر سارہ سے بولا جو حمیرا کی آمد سے تقریباً بوکھلا کر جلدی سے ٹرے پر جھک کر لرزتے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے بنانے لگی ساتھ ساتھ نوالہ بھی نگلتی جاتی تھی۔

"ارے حمیرا ذرا اخبار تو لاؤ دیکھیں ڈرائیوان میں کون سی پکچر چل رہی ہے؟"

اس نے حمیرا کو ٹالنا چاہا تو وہ فوراً خوشی خوشی اخبار لینے دوڑ گئی۔ شاید اس نے سارہ کو غور سے دیکھا بھی نہ تھا۔

وہ اٹھ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا اور پیار سے اس کے گال پر چپت لگا کر بولا۔

"پگلی اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے تم خواہ مخواہ ہی ان سے ڈرتی ہو۔"

اس کے چاہت بھرے انداز پہ سارہ کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔

"ہوں ہوں دیکھو رونا ہرگز نہیں ورنہ پھر میں تمہارے آنسو پونچھنے لگوں گا اور تب تک ضرور حمیرا آجائے گی۔"

اس نے دھمکایا تو وہ جلدی جلدی آنکھیں رگڑنے لگی۔

"ڈرپوک"

اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ مسکرا دی مسکراتے ہوئے جلدی جلدی برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔ شاہ رخ اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما عقیدت کے بھرپور اظہار میں چوما اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

شاہ رخ کی بھرپور محبت پا کر بھی وہ اپنے دل کو خوف وہراس سے آزاد نہ کر سکی۔ ہر لمحہ اسے یہی خدشہ لگا رہتا کہ اگر شاہ رخ کی امی نہ مانیں تو اگر انہوں نے مجھ سے شادی کی اجازت نہ دی تو آخر وہ بھی حمیدہ بیگم کی بہن ہیں وہ کیونکر یہ چاہیں گی کہ ان کا بیٹا ان کی سگی بھانجیوں کو چھوڑ کر ایک غیر لڑکی سے شادی کرے اسی قسم کے خیالات ہر وقت اس کو پریشان کیے رہتے فکر و الجھن کے سائے ہر لمحہ اس کے چہرے پر لہراتے رہتے شاہ رخ جب بھی اس کے فکرمند چہرے کے متعلق پوچھتا وہ مسکرا کر ٹال دیتی اس کا وہم کہہ کر بات گول کر دیتی۔

اس دن وہ باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

اوہ۔ اس کا دل دھڑک اٹھا مضبوط مردانہ ہاتھوں سے وہ بخوبی پہچان گئی کہ وہ شاہ رخ ہے۔ اور ویسے بھی اس گھر میں شاہ رخ کے علاوہ اور کون اس سے ایسا مذاق کر سکتا تھا۔

"چھوڑیئے۔"

وہ گھبرا کر بولی مبادا کوئی باورچی خانے میں آجائے۔

"نہیں چھوڑوں گا پہلے بتاؤ کون ہوں۔"

اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"آپ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟"

وہ آہستہ سے بولی۔

"ہوں۔"

اس نے ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لئے۔

"عقلمند ہو کافی اچھا دیکھو میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں؟"

اس نے پیچھے سے ایک بنڈل اٹھا کر اس کے سامنے کر دیا

"یہ کیا ہے؟"

وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

"کیا ہے اس میں؟"

"کھول کر دیکھ لو۔"

وہ مسکرایا۔

"نہیں نہیں مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے میں یہ نہیں لوں گی۔"

وہ گھبرا کر انکار کرنے لگی۔

"پہلے کھول کر تو دیکھو پھر انکار کرنا۔"

"نہیں جب لینا ہی نہیں ہے تو کھول کر کیوں دیکھوں۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"میں کہہ رہا ہوں پہلے کھولو پھر بڑبڑ کرنا!"

وہ بہت رعب سے بولا تو سارہ نے جلدی سے بنڈل کھول ڈالا مگر یہ کیا اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں وہ تو کچھ اور ہی چیزیں سمجھ رہی تھی مگر اس میں بی اے کے کورس کی کچھ کتابیں تھیں

"یہ کیا۔"

وہ حیرت سے بڑبڑا کر رہ گئی۔

"یہ تھوڑی ہیں باقی اور لا دوں گا۔ اب تم باقاعدہ پڑھائی شروع کر دو۔"

"اب میں نہیں پڑھ سکتی۔"
وہ دکھ سے بولی۔
"کیوں؟"
وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
"وہ مجھے عرصہ ہوگیا ہے کتابیں چھوڑے ہوئے اب میں پچھلا بھی سب کچھ بھول چکی ہوں تو آگے کیا پڑھوں گی۔"
"کوئی حرج نہیں ہے تم کوشش تو کرو رفتہ رفتہ سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ میں کون سا فوراً تمہیں امتحان میں بٹھائے دے رہا ہوں، آرام سے پڑھو مگر پڑھو ضرور تعلیم بہت ضروری چیز ہے جو کچھ سمجھ میں نہ آئے مجھ سے پوچھ لینا میں سمجھا دوں گا۔"
اس نے بڑے پیار سے سمجھایا تو وہ اس کی ضد کے آگے خاموش ہوگئی۔ شاہ رخ نے بستے کا بنڈل بنا کر اسے ریک پہ رکھ دیا۔
"اوہ!"
اچانک سارہ نے تیزی سے مڑ کر توا چڑھایا اسے خیال آیا کہ اگر پھر شاہ رخ سے باتوں کی وجہ سے دیر ہوگئی تو خواہ مخواہ چچی کی صلواتیں سننا پڑیں گی۔
"کیا ہوا؟"
شاہ رخ نے اس کو تیزی سے کام کرتے دیکھ کر پوچھا۔
"کچھ نہیں آج پھر کام میں دیر ہوگئی ہے اس لئے جلدی کر رہی ہوں۔"
وہ ڈر کر بولی۔
"ارے تم بے فکری سے کام کرو۔"
اس نے پیار سے اس کے سر پہ چپت جمائی۔
"اگر خالہ جان آئیں تو ایسا باتوں میں لگاؤں گا کہ ادھر کا رخ بھی نہ کر سکیں گی۔"
وہ چٹکی بجا کر بولا سارہ مسکرا دی۔
"شاباش بس تم اسی طرح ہنستی مسکراتی رہا کرو۔"
وہ پرشوق نگاہوں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ جو شعلوں کی تپش سے سرخ ہو رہا تھا اسے اپنی طرف غور سے دیکھتا پا کر اسے آپ ہی آپ شرم آنے لگی۔
"پیچھے ہٹیے نا کیا دیکھ رہے ہیں۔"
وہ شرمیلے تبسم سے بولی۔
"تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"
وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔
"کیا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"
اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"دیکھا ہے دیکھتا ہوں مگر دل ہی نہیں بھرتا۔"
اس نے اس کے چہرے پر جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر سرگوشی کی وہ شرم سے سرخ ہوگئی۔
"سارہ!"
اس نے سحر زدہ سا ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں اس کا چہرہ لے لیا۔
"میں تمہیں" مگر اس سے پہلے کہ وہ بات پوری کرتا گھنٹی کی تیز آواز پورے گھر میں گونج کر رہ گئی۔
"چچی جان چچی جان آگئیں۔"
بے حد سٹپٹا کر سارہ نے اس کے ہاتھ جھٹکے اور چولہے پہ جھک گئی شاہ رخ کھڑا اس کی گھبراہٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
"جائیے نا دروازہ کھولیے۔"
وہ اس کو کھڑا دیکھ کر گھبرا گھبرا کر بولی۔
"میں کہہ رہا ہوں سارہ تم اتنا ڈرنا چھوڑ دو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔"
وہ اس کی اتنی گھبراہٹ دیکھ کر چڑ گیا تھا
کر کے غصے سے بولا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔
اوہ تو شاہ رخ ناراض ہوگیا۔
اس کے جانے کے بعد سارہ نے دکھ سے سوچا مگر وہ بھی کیا کرتی ایک خوف جو اس کے دل میں شروع سے بیٹھ گیا تھا نکلتا ہی نہ تھا اسی لئے تو اس نے ان کے کسی کام سے کبھی انکار نہ کیا تھا وہ ان کی بے بھاؤ کی صلواتوں سے بہت ڈرتی تھی۔ شروع سے جو انہوں نے اس پر رعب گانٹھا تھا۔ وہ ان سے بے حد مرعوب ہو چکی تھی ان کی شکل دیکھ کر اس کی روح فنا ہو جاتی۔ شاہ رخ نے بہت کوشش کی کہ وہ ان سے ڈرنا چھوڑ دے خواہ مخواہ خوف زدہ نہ ہوا کرے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ سارہ کے ڈر کا بدستور وہی حال تھا اسی لئے اس وقت اسے غصہ آگیا کہ اس کے ہزار بار سمجھانے کے باوجود بھی سارہ کے خوف میں ذرا سی کمی نہ آئی۔
اس نے جلدی جلدی روٹی پکا کر ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔ سب ہی وہاں بیٹھے ہوئے تھے اس نے ایک اچٹتی سی نظر شاہ رخ پر ڈالی جس نے اسے دیکھ کر نہایت بے نیازی سے ایک رسالہ اٹھا لیا تھا پھر حمیدہ بیگم سے مخاطب ہوئی۔
"کھانا لگا دوں۔"

"ہاں لگا دو۔"

انہوں نے خشک لہجے میں جواب دیا اور وہ ایک حسرت بھری نگاہ شاہ رخ پر ڈالتی ہوئی باہر نکل آئی۔

کھانے کے دوران بھی شاہ رخ نے اس کی طرف بالکل توجہ نہ دی پھر شام کو جب وہ چائے بنانے نکلی تو وہ لان میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس کو مخاطب کرتی وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ وہ اس کے بے نیازانہ رویہ پر بے چین ہو گئی تھی۔ شاہ رخ کا بے توجہی اور بے رخی برداشت کرنا اب اس کے بس میں نہ تھا مگر وہ تو کچھ کہنے کا موقع بھی نہ دے رہا تھا پوری سنجیدگی سے ناراض ہو گیا تھا وہ نہایت بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگی۔ کہ رات کو اسے منا لے گی۔ ایک رات ہی تو ملتی تھی اسے کھل کر شاہ رخ سے بات کرنے کو ورنہ سارا دن تو اسے ان لوگوں کا خوف کھائے جاتا۔

مگر رات کو جب وہ کام سے فارغ ہو کر برآمدے میں آئی تو بجھ کر رہ گئی شاہ رخ وہاں نہیں تھا وہ جھجکتے جھجکتے شاہ رخ کے کمرے تک پہنچ گئی اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ مگر پتہ نہیں وہ سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا یہی معلوم کرنے کیلئے ... کھڑکی کا پردہ سرکا کر جھانکا وہ سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا کھڑکی کی طرف سے اس کی پشت تھی اس لیے وہ چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکی ہاں البتہ کمرے میں منتشر سگریٹ کا دھواں اس کی بے چینی کا غماز تھا۔ اس کو جگتا دیکھ کر وہ دروازے پر آ گئی ہلکے سے دروازہ بجایا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔

"تم۔"

وہ اس کو دیکھ کر ایک لمحہ کو چونکا پھر فوراً ہی تاثر دیئے بغیر ایش ٹرے میں سگریٹ مسلنے لگا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب آ گئی وہ خاموش سر جھکائے اس کے قدموں کو دیکھتا رہا۔

"شاہ رخ۔"

اس نے ہولے سے پکارا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے۔"

وہ اس کے قریب بیٹھتی ہوئی آہستہ سے بولی۔

"نہیں۔"

وہ اس کو روکھا سا جواب دیتے ہوئے تھوڑا سا پرے کھسک گیا اور وہ اس کی اس حرکت کو برداشت نہ کر سکی پھٹ پڑی۔

"پھر آپ دن سے میری طرف دیکھ کیوں نہیں رہے ہیں مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے ہیں اور اب میں خود آ گئی ہوں تب بھی ناراض ہیں۔"

اس کے اس طرح چراغ پا ہونے پر شاہ رخ کو اس پر رحم آ گیا ایک بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی جسے چھپانے کو اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔

"شاہ رخ۔"

وہ سسک کر اس کے شانے سے ٹک گئی۔

"اگر آپ بھی مجھ سے ناراض ہو گئے تو میں کس کے سہارے جیوں گی۔"

روتے روتے اس نے الفاظ ادا کئے تو اپنی ناراضگی کو طول دینا شاہ رخ کے بس میں نہ رہا بے اختیار دوسرا ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بے خود سا ہو کر اس کے گھنے بالوں میں منہ چھپا لیا۔

اور وہ رونا دھونا بھول کر اس کی شکل دیکھنے لگی وہ نہایت دلکش انداز سے مسکرا رہا تھا شرما کر جلدی سے الگ ہو گئی مصنوعی خفگی سے بولی۔

"جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔"

"کیوں جی میں نے کیا کیا ہے۔"

شوخی سے پوچھنے لگا۔

"آپ نے دن سے مجھے خواہ مخواہ پریشان کر رکھا ہے۔"

اس نے شکائتی لہجے میں کہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"سارہ۔"

وہ نہایت گمبھیر آواز میں بولا۔

"میں نے تم سے ہزار بار کہا ہے نا کہ تم خواہ مخواہ ڈرنا اور گھبرانا چھوڑ دو مگر تم نے ذرا میرا کہنا نہ مانا ان کا نام سنتے ہی تم پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ اور شکل دیکھتے ہی روح فنا ہو جاتی ہے تم خود سوچو کہ اگر تمہارا یہی حال رہا تو کیا ہو گا۔ اگر انہوں نے تم سے سخت لہجے میں کہہ دیا کہ تم مجھ سے شادی نہ کرو تو تم نہیں کرو گی۔ بات مان لو گی۔ اور میں یونہی سر پٹختا رہ جاؤں گا مجھے بتاؤ تم کیوں ڈرتی ہو ان سے کیوں دبتی ہو کیا جرم ہے تمہارا۔"

اچانک ہی اس کو جوش آ گیا۔ نہایت جوشیلے انداز میں اس کے شانے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"شاہ رخ۔"

وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"مجھے خود نہیں پتہ کہ میں کیوں ڈرتی ہوں بس شروع سے جو انہوں نے ڈانٹ کر اپنی شخصیت کا خوف بٹھایا ہے وہ نہیں نکل پاتا میں بہت کوشش کرتی ہوں مگر ناکام رہتی ہوں۔"

وہ بے بسی سے پھر رو پڑی۔

"بے وقوف لڑکی۔"

شاہ رخ نے پیار سے اس کے آنسو پونچھے۔

"اپنے دل سے یہ خوف نکال دو کہ وہ تمہارا کچھ نہیں کر سکتی مگر جب تم بلاوجہ ہی ان سے ڈرتی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اور دبائیں گی، ادھر دیکھو میری طرف۔"

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔

"وعدہ کرو کہ آئندہ نہیں ڈرو گی۔"

اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کوشش کروں گی۔"

وہ آہستہ سے نظریں جھکا کر بولی۔

"کوشش نہیں عہد کرو پلیز میری خاطر۔"

وہ منت سے بولا۔

"اچھا وعدہ رہا۔"

وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"خالی خولی وعدہ نہیں میری قسم کھاؤ۔"

وہ پھیل گیا۔

"نہیں نہیں وعدہ جو کر لیا ہے قسم کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ گھبرائی۔

"نہیں جناب میری قسم کھائیے مجھے اعتبار نہیں آپ پر۔"

وہ شوخی سے بولا۔

"پلیز ایسی قسم مت کھلوائیے۔"

وہ منت سے بولی۔

"پلیز ایسی ہی قسم کھائیے۔"

اس نے شرارت سے نقل اتاری۔

وہ خاموش ہو گئی اتنی بڑی قسم نہیں کھانا چاہ رہی تھی۔ جو پوری نہ کر پائے تو خود ہی کا نقصان ہو مگر وہ بعض اوقات بہت ضدی بن جاتا تھا وہ الجھن میں پڑ گئی۔

"سارہ۔"

وہ اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

"جلدی سے قسم کھاؤ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے جو وعدہ کیا ہے وہ جھوٹا ہے تمہاری نیت میں اب بھی کھوٹ ہے۔"

اس کے کہنے پر سارہ کو اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔

"اچھا آپ کی قسم۔"

وہ سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔

"گڈ۔"

وہ نہال ہو گیا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہو بھئی۔"

اس نے ہنستے ہوئے اس کا سر ہلایا۔

"کچھ نہیں۔"

سارہ نے اس کی طرف دیکھا آنکھوں میں بے انتہا اداسی گھلی ہوئی تھی جسے شاہ رخ نے صاف محسوس کیا۔

"کچھ نہیں تو پھر خاموش کیوں ہو سارہ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم اب بھی خوش نہیں رہتیں ہر دم کچھ سوچتی رہتی ہو جیسے کسی الجھن میں گرفتار ہو مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔"

اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔"

اس نے پھر ٹالا۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی کیا سوچ رہی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں جھانک کر بڑی محبت سے اصرار کیا۔

"میں سوچتی ہوں اگر آپ کی امی نہ مانیں تو۔"

اس نے آخر کار اٹک اٹک کر اپنا خدشہ بیان کر ہی دیا۔

"بے وقوف ہو بالکل کیوں نہ مانیں گی۔"

وہ ہنسنے لگا۔

"اگر نہ مانیں تو۔"

اس نے پھر اپنی بات پر زور دیا۔

"بھئی وہ ضرور مان جائیں گی اور اگر فرض کر لو کہ نہیں مانیں تب بھی کیا ہے شادی کے لئے میری رضامندی ضروری ہے کہ امی کی جب ہم دونوں راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

اس نے مسکراتے ہوئے اس کا سر ہلایا تو اس کے آخری فقرے پر وہ بھی مسکرا دی۔

"چلو شاباش اب سو جاؤ جا کر الٹی سیدھی باتیں مت سوچا کرو خوامخواہ خود کو بھی پریشان رکھتی ہو اور مجھے بھی پریشان کرتی ہو۔"

اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھا لیا۔

شاہ رخ نے اپنی امی کو خط لکھا تھا آج اس کا جواب آیا تھا۔

اس نے بے چین ہو کر خط کھولا مگر جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جا رہا تھا چہرے کی رنگت متغیر ہوتی جا رہی تھی دماغ میں آندھیاں سی چلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

یہ کیا۔ اس نے خط ختم کر کے غصے سے پٹخا امی نے صاف انکار کر دیا تھا انہوں نے لکھا تھا۔ میں نے تمہیں حمیرا اور فوزیہ میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ میں ان کے علاوہ کسی تیسری لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی چہ جائیکہ ایسی لڑکی کہ جس کے متعلق مشہور ہو کہ وہ پاگل ہے تم خود سوچو دنیا کیا کہے گی کہ سیٹھ فرخ کی بہو پاگل ہے تم فوراً واپس آ جاؤ اب۔ میں خود اپنی پسند سے تمہارے لئے دلہن منتخب کروں گی۔

ہنہ دلہن اب سارہ کے علاوہ اور کوئی میری دلہن نہیں بن سکتی۔

وہ آہستہ سے بڑبڑایا پھر اب کیا کرنا چاہیئے وہ منتشر سے خیالات لئے مضطربانہ انداز میں ٹہل ٹہل کر سوچنے لگا۔ بہت دیر کی سوچ وبچار کے بعد بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جا کر ان سے بات کرے گا۔ ان کو پوری تفصیل سے بتائے گا۔ حمیدہ بیگم کے ظالمانہ رویئے اور سارہ کی مظلومیت کے سارے قصے کھول کھول کر انہیں سنائے گا اور پھر دیکھے گا کہ ان کا دل موم ہوتا ہے۔ کہ نہیں سارہ کے دکھوں پر ان کا دل پسیجتا ہے کہ نہیں۔

فیصلہ کر کے فوراً اپنا سامان باندھنے لگا۔

”یہ کیا کر رہے ہو بیٹے؟“

اچانک حمیدہ بیگم کی آواز پر وہ چونک پڑا وہ اُسے کھانے کے لئے بلانے آئی تھیں مگر سامان باندھتے دیکھ کر حیران رہ گئیں

”سامان باندھ رہا ہوں؟“

اس نے ادھورا سا جواب دیا۔

”وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں مگر کیوں؟“

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”گھر جا رہا ہوں۔“

وہ جواب دے کر پھر اپنے کپڑے اُلٹے سیدھے سُوٹ کیس میں ٹھونسنے لگا۔

”یہی تو پوچھنا چاہ رہی ہوں بیٹے کہ کیوں جا رہے ہو ہم سے کچھ کوتاہی ہو گئی ہے یا ہماری کوئی بات بری لگی ہے آخر وجہ کیا ہے یوں بیٹھے بٹھائے اچانک جانے کی۔“

انہوں نے نہایت شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

”نہیں خالہ جان ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بس امی نے بلایا ہے۔“

اس نے سوٹ کیس بند کر کے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

”کمال ہے آخر یکا یک کیوں بلایا آپا نے میں تو ٹھیک طرح سے تمہاری خاطر بھی نہ کر پائی۔“

انہوں نے دنیا جہان کی افسردگی اپنے لہجے میں پیدا کی۔ انہیں تو افسوس اس بات کا تھا کہ شاہ رخ اتنی جلدی جا رہا تھا کہ وہ اس کے خیالات سے آگاہ بھی نہ ہو پائیں تھیں کہ اس نے ان کی کس لڑکی کو منتخب کیا ہے کس لڑکی کو پسند کیا ہے۔

”بے فکر رہیئے خالہ جان میں جلد لوٹ کے آؤں گا۔ پھر کیجیئے گا میری خاطریں۔“

وہ ان کا مقصد بھانپ کے مسکرایا۔

”ہاں بیٹے ضرور آنا تمہارے دم سے تو ہمارے گھر میں رونق ہو گئی ہے سچ مجھے تو بہت افسوس ہو رہا ہے تمہارے جانے کا اگر آپا نہ بلاتیں تو میں ہرگز نہ جانے دیتی۔“

انہوں نے پھر چاپلوسی دکھائی۔

وہ صرف مسکرا کر رہ گیا ایک زہریلی سی مسکراہٹ۔

”ارے ہاں بیٹے میں تمہیں کھانے کے لئے بلانے آئی تھی چلو کھانا لگ گیا۔“

انہیں جیسے ایک دم ہی یاد آ گیا۔

”چلیئے۔“

وہ ان کے ساتھ ہو لیا۔

”ارے سُنا تم نے حمیرا اور فوزیہ؟“

انہوں نے کرسی پر بیٹھتے کے ساتھ ان دونوں کو مخاطب کیا۔

”کل صبح شاہ رخ واپس جا رہا ہے۔“

”کیا؟!“

وہ دونوں حیرت سے اچھل پڑیں۔ پاس کھڑی سارہ بھی اس خبر پہ بھونچکی ہو کر شاہ رخ کی شکل دیکھنے لگی کل تک تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا پھر آج اچانک یہ پروگرام کیسے بن گیا۔

وہ سوچنے لگی۔

”ہاں بھئی تو اس میں اتنی حیرانگی کی کیا بات ہے۔“

وہ ان دونوں کو سوالیہ نظروں سے اپنی جانب دیکھتا پا کر آہستہ سے مسکرایا۔

سارہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ کر اس کے دلی جذبات و تاثرات کا اندازہ لگانا چاہ رہی تھی۔ وہ بہت پریشان اور الجھا الجھا

سالگ رہا تھا اتنا تو وہ سمجھ چکی تھی مگر ابھی وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"یقین نہیں آ رہا نا کیونکہ کل تک تو آپ کا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔"

اس کے دل کی بات حمیرا نے کہہ دی۔

"ہاں بس سمجھو کہ اچانک ہی بنا لیا ہے کیونکہ آج ہی اور ابھی بنایا ہے۔"

وہ سارہ کے سامنے خط کا ذکر نہیں کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ سارہ کو خط کے متعلق پتہ تھا اور وہ سمجھ جاتی کہ اقی نے اجازت نہیں دی ہوگی پھر خواہ مخواہ ہی پریشان ہوتی۔

مگر فوراً ہی حمیدہ بیگم بول اٹھیں۔

"اصل میں آپا نے اس کو بلایا ہے ورنہ میں تو یوں ہرگز نہ جانے دیتی۔"

ان کے تڑ سے بول دینے پر وہ بہت جز بز ہوا۔

"اچھا تو خالہ جان نے بلایا ہے۔"

وہ دونوں جیسے معاملہ سمجھ کر بولیں۔" وہ خاموش رہا کن انکھیوں سے سارہ کی طرف دیکھا وہ چہرے پہ سوچ کی گہری لکیریں لیے سر جھکائے کھڑی تھی۔

وہ لوگ اس کے جانے پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتی رہیں مگر اس نے پھر کوئی بات نہ کی خاموشی سے کھانا کھا کر اٹھ گیا۔

"سارہ"

اس نے دھیمے سے پکارا وہ باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں۔ وہ ٹکٹ وغیرہ کے کام سے فارغ ہو کر ابھی ابھی باہر سے آ رہا تھا وہ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھیں اس لئے وہ چپکے سے باورچی خانے میں آ گیا۔

اس کی آواز پر سارہ نے مڑ کر دیکھا اور وہ شرمندہ سا ہو گیا سارہ کی آنکھیں سوجی اور متورم ہو رہی تھیں وہ دن سے اب تک روتی رہی ہے یہ احساس اسے شرمندہ کر گیا۔

"پگلی اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو میں جلدی ہی آؤں گا۔"

اس نے اس کا جھکا جھکا چہرہ اونچا کیا۔

"شاہ رخ ایک بات پوچھوں۔"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے ضبط سے بولی

"پوچھو۔"

وہ نظریں چرا گیا۔

"اقی نے انکار کر دیا نا آپ کو اجازت نہیں دی نا؟"

وہ اس کے شانے جھنجھوڑ کر رو پڑی۔

"ہاں۔"

وہ اس سے جھوٹ نہ بول سکا۔

"میں تو پہلے ہی سمجھ رہی تھی۔"

بے حد شکستہ آواز میں وہ بولی۔

"مگر تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ میں اسی لئے تو جا رہا ہوں کہ انہیں اپنے اٹل فیصلے سے آگاہ کر سکوں میں جلدی ہی آؤں گا سارہ چاہے وہ مانیں یا نہ مانیں میں تمہیں اپنا کر رہوں گا۔ اگر انہوں نے تمہیں قبول نہ کیا تو اس گھر کو چھوڑ دوں گا سارہ مگر تمہیں نہیں چھوڑوں گا اس نے ٹھوس لہجے میں کہا مگر خوشی نہ محسوس کر سکی پتہ نہیں کیا ہو وہ کبھی نہ کسی طرح تایا جی کو رام کر لیں تو..... اس کو یہی دھڑکا لگا تھا۔

"سارہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے کہ نہیں۔"

وہ اس کو بدستور آنسو بہاتے دیکھ کر شاکی انداز میں پوچھنے لگا۔

"ہے۔"

سارہ نے اس کی خفگی کے ڈر سے آہستہ سے کہا۔

"بس تو پھر یہ رونا دھونا بند کرو مجھے مسکرا کر خدا حافظ کہو اور دعا کرو کہ میں اپنے سچے اور پاک ارادے میں کامیاب ہو جاؤں۔"

اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے وہ خاموش رہی البتہ اپنے آنسو روک لئے کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے چلتے چلتے وہ اس کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"چلو پھر ابھی مجھے خدا حافظ کہہ دو کل تو شاید موقع ہی نہ ملے اور رات کو بھی چانس کم ہی ملے۔"

اس نے کہا تو سارہ نے بمشکل اپنے دل کے درد کو دبا کر لرزتے کانپتے لبوں سے اسے "خدا حافظ" کہا۔

"ایسے نہیں مسکرا کر کہو ایک دلنشیں سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر کہو تا کہ وہاں جب بھی تمہارا تصور آئے سدا مسکراتا اور ہنستا ہوا ہی آئے میں روتی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔"

وہ بچوں کی طرح مچل کر بولا اور سارہ اس کی خواہش پر مجبور سی ہو کر جبراً مسکرا کر بولی۔

"خدا حافظ۔"

"دل سے نہیں مسکرائی ہو۔"

وہ اس کے چہرے پہ چھایا حزن و ملال بھانپ کر بولا۔

"آپ جا رہے ہیں پھر میں دل سے کیسے مسکرا سکتی ہوں؟"

وہ کرب سے ہونٹ کاٹ کر بولی۔

"پلیز میری خاطر۔"

وہ اس کا چہرہ تھام کر اپنے چہرے کے بالکل قریب کر کے منت سے بولا وہ سوچ میں پڑ گئی بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زبردستی مسکرائے بھی اور مسکراہٹ میں اداسی بھی نہ ہو جب روح ہی گھائل ہے جب دل ہی اداس ہے تو وہ دل سے کیسے مسکرا سکتی ہے۔

"چلو چلو جلدی کرو ورنہ اب میں دوسرا حربہ استعمال کرتا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔

"وہ کیا؟"

اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ گدگدی کر دوں گا۔"

اس نے جلدی سے ہاتھ آگے بڑھایا تو ایک بے ساختہ قسم کی ہنسی سارہ کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑی۔

"بس بس کہو جلدی سے؟"

اس نے اصرار کیا تو وہ تیزی سے ہنسی کے درمیان ہی بولی

"خدا حافظ۔"

"شاباش اب ہوئی نا بات اچھا تو خدا حافظ۔"

وہ اس کے دونوں ہاتھ بڑی گرم جوشی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بولا۔

"میرا انتظار کرنا میں جلد ہی آؤں گا۔"

سرگوشیانہ انداز میں کہہ کر وہ بڑی عقیدت سے اسکے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر تیزی سے باہر چلا گیا کہ وہ کہیں پھر نہ رو پڑے۔

اور کچن کی کھڑکی سے لگی حمیدہ بیگم سارا جغرافیہ سمجھ کر بڑے تمسخر سے مسکرائیں۔ وہ جو اس کو کھانے کے متعلق کچھ ضروری ہدایتیں دینے آئیں تھیں شاہ رخ کی آواز سن کر چونک پڑیں تھیں اور پھر تو جیسے ان کی آنکھوں سے تمام پردے سرکتے چلے گئے تھے۔

"کمبخت چڑیل دیکھوں گی تو میری بیٹیوں کے حق پر کیسے ڈاکہ ڈالتی ہے ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ شاہ رخ کا نام تک بھول جائیگی۔"

انہوں نے غصے سے دانت کچکچائے اور پھر شاہ رخ کے جانے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگیں۔

شاہ رخ کیا گیا گویا سارہ کے لئے قیامت آ گئی اس کے جاتے ہی حمیدہ بیگم بم کی طرح پھٹ پڑیں اس کو سینکڑوں صلواتوں سے نوازا دل کھول کر گالیاں اور کوسنے دیئے اور سب سے بڑا ستم یہ توڑا کہ اس کو گھر چھوڑ دینے کا حکم دے دیا وہ بری طرح گھبرا گئی اس گھر کے سوا اور کہاں جاتی کوئی عزیز اقارب رشتہ دار اور کوئی بھی تو نہیں تھا یہاں یا اگر تھا بھی تو وہ ان کے ٹھکانے سے کب واقف تھی اس گھر میں آنے کے بعد بھی گھر سے ہی نہ نکلی تھی یہاں کے راستوں سڑکوں اور گلیوں تک سے تو واقف نہ تھی وہ چہ جائیکہ لوگوں سے۔ وہ اپنی بے بسی پر تڑپ تڑپ کر رو دی رو رو کر ان سے اپنے ناکردہ گناہ کی معافیاں مانگیں ہاتھ جوڑے پیر پکڑے مگر ان کی بات پتھر کی لکیر تھی۔ وہ خود ہی مجسم پتھر تھیں جس پر آنسوؤں کا آہوں کا فریادوں کا کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ چچا بھی گھر پہ نہیں تھے اور اگر ہوتے بھی تو وہ کون سا اس کی طرف سے بولتے اتنے عرصے میں کب انہوں نے اس پر توجہ دی تھی دو بول تو محبت کے کبھی بولے نہ تھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کیا کرے کہاں جائے کس کے گھر پناہ لے اس کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

مگر یہ سچ ہے کہ بعض اوقات خدا دشمنوں میں سے بھی دوست پیدا کر دیتا ہے سو ایسے میں روتی تڑپتی سارہ پر کریمن کو رحم آ گیا وہ جو شروع سے اب تک حمیدہ بیگم کے ظلم دیکھتی آ رہی تھی اس لمحے برداشت نہ کر سکی حمیدہ بیگم سے تو کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اس کی نوکری کا سوال تھا۔ البتہ چپکے سے سارہ کو ہزاروں تسلیاں اور دلاسے دے کر اپنے چھوٹے سے کوارٹر میں لے آئی۔

اس چھوٹے سے کوارٹر میں آ کر سارہ نے سکون و اطمینان کا سانس لیا اسے یوں لگا جیسے وہ کسی قید خانے سے نکل کر کھلی اور تازہ ہوا میں سانس لے رہی ہے جیسے وہ درندوں اور جنگلیوں کے جنگل سے نکل کر کسی شفیق و محفوظ پناہ گاہ میں آ گئی ہے۔ کریمن اس کا بہت خیال رکھتی تھی اور وہ بھی کریمن کو بالکل اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ یہاں رہ کر اسے احساس ہوا تھا کہ پیار محبت خلوص شفقت کسی کی میراث نہیں بعض امیروں کا دل کتنا بھیانک اور بعض غریبوں کا دل کتنا حسین ہوتا ہے۔

اتنے بڑے سانحے کے بعد اس نے شاہ رخ کو بھولنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ ابھی تک اس میں ناکام ہی رہی تھی۔ جب بھی وہ شاہ رخ کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتی اس کا ہیولا اپنی تمام تر وجاہتوں اور سنجیدگیوں سمیت سامنے آ کر اس سے پوچھتا کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔

نہیں نہیں وہ بے بسی سے رو پڑتی مجھے تو صرف اپنی قسمت پر اعتماد نہیں ہے تمہیں کیا خبر مجھ پر کیا قیامتیں بیت گئیں تمہیں کیا پتہ مجھ پر کیا حادثہ گزر گیا۔ تم پتہ نہیں کہاں ہو کیا کر رہے ہو۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بھی یا نہیں یا پھر مجھے بھول ہی

گئے ہو اور اس خیال سے ہی اُسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوتا وہ پہروں روتی رہتی اور اگر ایسے میں کریمن اس کو روتا دیکھ لیتی تو بہت بگڑتی پیار سے ڈانٹ دیتی اور وہ اس کی خوشی کی خاطر جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگتی۔

ادھر شاہ رخ ابھی اتی رئیسہ بیگم کو سارے واقعات الف سے یے تک سنانے کے بعد جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا"

انہوں نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا۔

"وہ لڑکی واقعی مظلوم ہے اور میں کوشش کروں گی کہ اس کے اوپر جو مظالم ڈھائے گئے ہیں ان کی تلافی ہو سکے اس کے لئے میں اس کو خوب سارا جہیز دے کر کسی اچھے اور شریف آدمی سے اس کی شادی کر دوں گی۔"

"مگر اتی"

وہ ان کی بات پر حیران رہ گیا۔

"کسی آدمی سے کیوں میں جو کر رہا ہوں اس سے شادی"

"تمہارے قابل تو وہ نہیں ہے بیٹے"

انہوں نے قدرے نرم لہجے میں سمجھایا۔

"کیوں اتی مجھ میں کون سے لعل ٹنکے ہیں جو اس میں نہیں ہیں وہ بھی ایک شریف خاندان کی شریف لڑکی ہے رہا دولت کا سوال تو اول تو میں اُسے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا دوسرے وہ بھی دولتمند ہوتی اتی اگر اس کی ساری دولت آپ کی بہن صاحبہ ہتھیا نہ لیتیں آخر اس کا روپیہ پیسہ کوٹھی کار اور گھر کی دوسری چیزیں کیا ہو گئیں اتی جو کہ اس کو ایک پیسہ بھی نہ ملا"

وہ بڑے جوش سے بولا۔

"مگر وہ جس حیثیت میں رہی ہے اب تمہارے قابل قطعی نہیں ہے لوگ کیا کہیں گے کہ تمہیں اور کوئی لڑکی نہ ملی سوائے اس لاوارث اور بے سہارا لڑکی کے جس کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں جس کی سوسائٹی میں کوئی حیثیت نہیں"

انہوں نے اس کو پھر اونچ نیچ سمجھانا چاہی۔

"تو کیا ہوا اتی مقام بنانے سے بنتا ہے اگر اب تک اُسے یہ مقام حاصل نہیں ہو سکا تو میں دلواؤں گا۔ اُسے یہ عزت و اونچا مقام یہ کوئی گناہ تو نہیں اتی بلکہ ایسا نہ کرنے سے ہم ضرور گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے"

شاہ رخ نے تیزی سے اٹل سے لہجے میں کہا تو انہیں اس کے گستاخانہ انداز پر غصہ آ گیا۔

"شاہ رخ"

انہوں نے غصے سے کہا۔

"کچھ بھی ہو میں تمہاری بات نہیں مان سکتی تمہیں ایسا کام کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی جس میں تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی رسوائی ہو"

وہ نہایت طیش سے کہہ کر باہر نکل گئیں تو شاہ رخ پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہ چاہتا تو فوراً ہی واپس جا کر ان کی مرضی کے بغیر بھی شادی کر سکتا تھا مگر اس نے انہیں کچھ دن اور سوچنے کا موقع دیا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کب تک پتھر بنی رہیں گی کب تک اس سے ناراض رہیں گی۔ وہ روزانہ صبح سے نکل کر جاتا اور رات گئے واپس آ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا اور اب تو اس نے اتی سے بات کرنا قطعی چھوڑ دی تھی نا ہی گھر میں کھانا کھاتا یا ناشتہ کرتا اگر کبھی گھر میں ہوتا بھی اور اتی پوچھ لیتیں تو صاف انکار کر دیتا۔

مجھے نہیں کھانا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا رئیسہ بیگم بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس گئیں تھیں مگر وہ تو ایسا روٹھا تھا کہ منتی کا نام ہی نہ لیتا تھا اور اس کو منانا رئیسہ بیگم کی شان کے خلاف تھا وہ اس کے سامنے جھکنا نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی دانست میں بیٹے کو ان کے سامنے جھکنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ وہ غلطی پر تھا کبھی وہ سوچتیں کہ اس کی بات مان لیں مگر پھر اپنی ذلت و رسوائی کا خیال آ جاتا ملنے والی عورتوں کے طنز و طعنے یاد آ جاتے اور وہ اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دیتیں۔

اس دن شاہ رخ خلاف معمول کچھ جلدی گھر آ گیا تو رئیسہ بیگم کو فوراً اس کی فکر لگی انہوں نے خود تو اس کے کمرے میں جانا مناسب نہ سمجھا البتہ گھر کے پرانے نوکر فضلو کو بھیجا کہ اس کو چائے کے لئے بلا لائے فضلو کمرے میں داخل ہوا تو شاہ رخ بستر پر چت لیٹے پر بازو دیئے چھت کو گھور رہا تھا۔

"چھوٹے صاحب"

فضلو نے آواز دی تو شاہ رخ نے ایسی سرخ سرخ انگارہ جیسی آنکھوں سے اُسے گھورا کہ فضلو گھبرا کر رہ گیا۔

"چھوٹے صاحب وہ میں آپ کو چائے کے لئے بلانے آیا تھا"

اٹک اٹک کر فضلو نے کہا۔

"مجھے نہیں پینا چاہیے۔"
نڈھال سے لہجے میں کہہ کر شاہ رخ نے ایک بازو اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا وہ بڑا مضمحل اور شکستہ سا لگ رہا تھا جیسے اپنا سب کچھ ہار بیٹھا ہے اور فضلو جس نے اُسے بچپن سے پالا تھا اس کی یہ حالت دیکھ کر برداشت نہ کر سکا۔

"چھوٹے صاحب!"
اس نے پاس آکر بڑے پیار سے شاہ رخ کی آنکھوں سے بازو ہٹایا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولا۔
"آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ کیوں اتنے پریشان ہیں میری تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا ادھر بیگم صاحبہ ضدی بن گئی ہیں ادھر آپ ضدی بن گئے ہیں کوئی ایک تو اپنی ضد چھوڑ دے۔"

"بابا!"
ایک جنون کے عالم میں شاہ رخ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"امی نہیں مان رہی ہیں اپنی ضد نہیں چھوڑ رہی ہیں ان کو پچھتانا ہوگا۔ انہیں ضرور پچھتانا ہوگا۔ کل صبح وہ اپنی ضد پر ضرور پچھتائیں گی مگر پھر انہیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کچھ نہ ملے گا بابا!"
عجیب وحشت بھرے جنونی سے انداز میں وہ بولا تو فضلو سرتاپا کانپ کر رہ گیا اس کا چہرہ اس کے خطرناک عزائم کا ثبوت دے رہا تھا اور فضلو شاہ رخ کو چھوڑ کر سیدھا رئیسہ بیگم کی طرف دوڑ گیا اس نے سوچا کہ بیگم صاحبہ کو چھوٹے صاحب کے ارادوں کے متعلق بتا دینا چاہیے شاید اسی طرح وہ مان جائیں اپنی ضد سے باز آجائیں۔
رئیسہ بیگم جو چائے کے لیے شاہ رخ کے جواب کی منتظر بیٹھی تھیں فضلو کو حواس باختہ آتے دیکھ کر گھبرا کر بولیں۔

"کیا ہوا؟"
"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا ہے بیگم صاحبہ مگر جلد ہی کچھ ہو جائے گا"
فضلو کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔
"کیا کہہ رہے ہو فضلو؟"
وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے بولیں اور جب فضلو نے شاہ رخ کی کیفیت اور اس کے کہے ہوئے جملے بیان کیے تو وہ بھی پریشان ہو گئیں اس لمحے اپنی ممتا سے ہار گئیں اپنی ضد پر قائم نہ رہ سکیں۔
تیزی سے چلتی ہوئی شاہ رخ کے کمرے میں داخل ہو گئیں وہ بازوؤں میں منہ چھپائے اوندھا لیٹا تھا۔ انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔
"رخی بیٹے۔"
نہایت شفقت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں وہ ویسے ہی لیٹا رہا ان سے روٹھا ہوا جو تھا۔
"بیٹے اپنی امی کو معاف نہیں کرو گے۔"
انہوں نے اس کے چہرے پر سے بازو ہٹائے۔
"امی!"
وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا۔
"ہاں بیٹے میں غلطی پر تھی نادانی میں اپنے بیٹے سے زیادہ دنیا والوں کو اہمیت دے بیٹھی تھی مگر اب مجھے اندازہ ہوا کہ ایک ماں کو اپنے بچوں کی خوشیوں سے زیادہ اور کوئی چیز پیاری نہیں ہوتی۔"

وہ شرمندہ شرمندہ سے لہجے میں بولیں۔
"امی!"
شاہ رخ وفور مسرت سے ان سے لپٹ گیا "کتنی اچھی ہیں۔ میری امی اور ایک میں کتنا خراب ہوں کہ اپنی چاہنے والی شفیق ماں سے اتنے دن تک بات ہی نہ کی۔
وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔
"امی مجھے معاف کر دیجیے میں بہت برا ہوں اتنے دن تک آپ کو ناراض رکھا!"
بچوں کی سی معصومیت سے اس نے ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔
"پگلے۔"
امی نے محبت سے اس کے ہاتھ علیحدہ کیے۔
"کہیں کوئی ماں بھی اپنے بیٹے سے ناراض ہو سکتی ہے چلو اٹھو چائے وائے پی کر جلدی سے تیاری شروع کر دو ہم کل ہی کراچی جائیں گے۔"
"امی کل!"
وہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔
"ہاں کل ہی!"
انہوں نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔
رئیسہ بیگم اور شاہ رخ کی اچانک آمد سے حمیدہ بیگم کے تو ہاتھ پیر پھول گئے ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اچانک بغیر اطلاع دیئے ان دونوں کا آنا کیا مقصد رکھتا ہے۔
"خیریت تو ہے آپا بغیر اطلاع دیئے آئیں کوئی خاص بات ہے کیا۔"
انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہاں بس خاص ہی بات سمجھ لو مگر پہلے یہ بتاؤ کہ میری بیٹیاں حمیرا اور فوزیہ کہاں ہیں۔"

انہوں نے فوراً ہی اصل بات کرنا مناسب نہ سمجھی اسی لئے گول مول سا جواب دیا۔

"اندر ہیں آپ بیٹھ رہی ہیں آپ کو اطلاع دینے آئی ہیں نا اس لئے انہیں پتہ ہی نہیں آپ کی آمد کے متعلق۔"

وہ اپنی بیٹیوں کے ذکر پر کھل گئیں تھیں سوچنے لگیں یہ یقیناً میری بیٹیوں ہی کے متعلق بات کرتے آئی ہیں بہن کی خاطر کرتے ہیں۔ کچھ کچھ ہیں ان کی چاپلوسانہ باتیں خوشامدی انداز دیکھ دیکھ کر شاہ رخ زیر لب مسکرا رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں چائے آگئی اور شاہ رخ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ چائے سارہ کے بجائے کریمن لائی ہے شاید سارہ یہاں آتے ہوئے شرما رہی ہوگی۔ اس نے سرشاری سے سوچا جلدی جلدی چائے ختم کی اور پھر چپکے سے باورچی خانے کی طرف نکل گیا خوشی کے بھرپور تاثر اور کامیابی کے گہرے احساس کے ساتھ باورچی خانے میں قدم رکھا مگر یہ دیکھ کر مایوس سا ہو گیا کہ سارہ باورچی خانے میں بھی نہیں تھی بلکہ کھانا کریمن ہی پکا رہی تھی۔

"کیا بات ہے صاحب جی؟"

کریمن نے اس کو باورچی خانے میں دیکھ کر سوال کیا۔

"وہ تھوڑا سا نمک دے دو چائے میں ڈالوں گا۔"

اس نے کریمن سے اس کے بارے میں کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اسی لئے بات بنا کر بولا۔

"اب تو بس ایک ہی جگہ رہ گئی ہے اور وہ ہے اس کا کمرہ۔"

اس نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے سوچا مگر ابھی اس کے کمرے میں جانے کا موقعہ نہیں تھا۔ آخر وہ خلاف معمول آج کام کیوں نہیں کر رہی کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئی اس خیال سے ہی اسے عجیب سی اذیت اور بے چینی کا احساس ہوا۔

وہ ... مضطرب سا آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔

جہاں باتوں کا ایک طویل سلسلہ چھڑا ہوا تھا پھر کھانے کے بعد بھی وہ لوگ رات گئے تک باتیں کرتے رہے اسی لئے شاہ رخ کو اس کے کمرے تک جانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ ذہن میں ہزاروں الجھن لئے بے دلی سے ان کی باتوں میں حصہ لیتا رہا وہ پتہ نہیں کیسی ہے کس حال میں ہے دل و دماغ تو مسلسل سارہ ہی کے متعلق سوچ رہا تھا پھر وہ کیسے بحالی و بشاشتی کا مظاہرہ کرتا

رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے سب ابھی تک سو رہے تھے شاہ رخ نے گھڑی دیکھی صبح کے سات بجے تھے وہ چپ چاپ باہر آگیا اور سیدھا سارہ کے کمرے کا رخ کیا مگر وہاں پہنچ کر وہ بری طرح چونک گیا سارہ کمرے میں بھی نہیں تھی کمرے میں ہر چیز ویسے ہی اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ مگر صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عرصے سے اس کمرے میں کوئی نہیں رہا ہے ہر چیز پر حتیٰ کہ بستر تک پر گرد کی ایک موٹی تہہ سی جمی تھی اب تو شاہ رخ سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ سارہ گھر میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے کہاں چلی گئی کہاں جا سکتی ہے وہ اس گھر کے علاوہ اور کہاں اس کا ٹھکانہ تھا۔ وہ سخت الجھن میں مبتلا ہو گیا۔

پھر ناشتے کی میز پر اس نے اپنی اس الجھن کا اظہار حمیدہ بیگم پر کر ہی دیا۔

"خالہ جان سارہ کہاں ہے؟"

اس نے غور سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

اس کے اچانک سوال پر ایک دفعہ تو وہ چکرا گئیں پھر لہجہ سنبھال کر بولیں۔

"ارے بیٹے سارہ کا کیا پوچھتے ہو اس نے تو انتہا کر دی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھولی بھالی صورت والی لڑکی ایسے گھناؤنے کرتوت بھی کر سکتی ہے تمہارے جانے کے دو تین روز بعد ہی وہ کسی آدمی کے ساتھ معاشقہ لڑا کر بھاگ گئی۔"

انہوں نے خالص کٹنیوں والے انداز میں کہا۔ اور پاس کھڑی ہوئی کریمن ان کے سفید جھوٹ پر تلملا کر رہ گئی مگر اپنی ملازمت کے خیال سے مصلحتاً چپ رہی۔

"کیا"

شاہ رخ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ بے یقینی سے بولا۔

"ہم کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا بیٹے مگر یہ حقیقت ہے بہرحال تسلیم کرنا پڑے گی۔"

وہ زہر طنز سے مسکرائیں۔

اس انکشاف پر ربینہ بیگم کی تو عجیب حالت تھی وہ کبھی شاہ رخ کی طرف دیکھتیں اور کبھی حمیدہ بیگم کی طرف وہ دل ہی دل میں شکر کرنے لگیں کہ ابھی تک انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ورنہ پھر خواہ مخواہ انہیں شرمندگی اٹھانا پڑتی۔

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا یقیناً اس میں بھی کوئی سازش ہے۔

شاہ رخ نے بڑے وثوق سے سوچا۔ اس کا ذہن یہ ماننے کو قطعی تیار نہیں تھا کہ سارہ ایسی حرکت کر سکتی ہے وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس میں بھی ان کا ہاتھ ہے مگر خاموش رہا جب تک کوئی ثبوت نہ مل جائے وہ ان کی بات کی نفی کس طرح کر سکتا تھا۔

"شاہ رخ ناشتے کے بعد میرے کمرے میں آنا مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہے۔"

رئیسہ بیگم نے اچانک شاہ رخ کو مخاطب کیا تو حمیدہ بیگم کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ اور شاہ رخ نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ناشتے کے بعد وہ الجھا الجھا سا ان کے کمرے میں داخل ہوا وہ کرسی پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"بیٹھو۔"

انہوں نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"سنا تم نے۔"

انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"وہ تو شکر کرو کہ میں نے ابھی تک حمیدہ سے اس کے متعلق کوئی بات ہی نہیں کی ورنہ مجھے کتنی شرمندگی اٹھانا پڑتی۔"

"امی یہ جھوٹ ہے اس میں بھی ان کی کوئی سازش ہے۔"

اس نے برملا اپنی سوچ کا اظہار کر دیا۔

"یہ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو ہو سکتا ہے وہ ان کے ظلم سے ہی تنگ آ کر ایسا قدم اٹھا سکتی ہو۔"

انہوں نے دلیل پیش کی۔

"نہیں امی وہ ایسا نہیں کر سکتی۔"

وہ بڑے وثوق سے بولا۔

"بیٹے تم خواہ مخواہ حقیقت سے منہ موڑ رہے ہو بہر حال اب میں اپنی خوشی سے تمہارے لئے لڑکی منتخب کروں گی۔"

انہوں نے جیسے اسے فیصلہ سنایا۔

"امی"

وہ بے چین ہو کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"امی پلیز ابھی ایسی کوئی بات نہ کہیئے گا پہلے میں اس بات کا اچھی طرح پتہ چلا لوں ثبوت مہیا کروں پھر اگر یہ بات سچ ہو تو آپ اپنی مرضی سے کہیئے گا۔"

وہ منت سے ان کے ہاتھ تھام کر بولا۔

"اچھا بیٹے جیسی تمہاری مرضی۔"

انہوں نے اس کی منت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے

"ظاہر ہے میں یہاں آئی تو تمہاری ہی خوشی کے لئے تھی۔ اب اگر وہ ہی نہیں ہے جس کے لئے ہم آئے تھے تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

ان کے لہجے میں بے بسی کی جھلک تھی۔

"امی مجھے یقین ہے کہ اس میں بھی کوئی چال ہے میں جلد ہی یہ راز کھولنے کی کوشش کروں گا۔ پھر اگر میں ناکام ہو جاؤں تو آپ ضرور اپنی خوشی پوری کیجئے گا۔"

اس نے خوشامدانہ انداز میں ان کے ہاتھ سہلائے اور پھر اٹھ کر باہر آ گیا۔

اس نئی صورت حال سے تو وہ سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ وہ بھاگی تو نہیں تھی اس کا تو اسے یقین تھا مگر پھر آخر وہ کہاں چلی گئی یہ عقدہ بھی وہ حل نہ کر پا رہا تھا سارہ کے کہنے کے مطابق نہ یہاں اس کا کوئی اور رشتہ دار تھا اور نہ کوئی جاننے والا پھر وہ کہاں جا سکتی ہے دوسرے وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ حمیدہ بیگم کی سازش کے متعلق کس سے پوچھے کون اسے حقیقی صورت حال کے بارے میں بتائے گا۔ وہ سخت الجھن میں تھا خالو جان سے کچھ پوچھنا بیکار ہی تھا کیونکہ ان کو بھی یہی بات بتائی گئی ہو گی پھر وہ آخر کار کس سے پوچھے بہت سوچ و بچار کے بعد وہ کریمن کے پاس آیا گو کہ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ صحیح بات بتائے گی کیونکہ وہ بھی تو آخر انہی کی ملازمہ تھی مگر اس نے آزما لینا بہتر سمجھا۔

"بوا تم سارہ کے بارے میں کچھ جانتی ہو وہ کہاں گئی ہے کیوں گئی ہے؟"

وہ الجھا الجھا سا کھڑا تھا۔

کریمن اس کی شکل دیکھ کر مسکرائی۔

"آپ کو بیگم صاحبہ کی بات پر یقین نہیں آیا کیا۔"

مسکراہٹ روک کر کڑے انداز میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔"

وہ بلا خوف و خطر بولا۔

"کیوں۔"

اس نے پوچھا۔

"بس میرا دل نہیں مانتا کہ وہ ایسی حرکت کر سکتی ہے تمہیں اگر کچھ معلوم ہے تو خدا کے لئے میری اس الجھن کو دور کر دو مجھے بتا دو مجھے بتاؤ وہ کیوں گئی کہاں گئی ہے۔"

وہ ملتجی انداز میں بولا۔

"صاحب جی!"

کریمن نے ایک لمبی سانس لی۔

"جب بیگم صاحبہ نے اس معصوم کے متعلق ایسا الزام ...تو مجھے بہت غصہ آیا تھا دل چاہا تھا فوراً انکا جھوٹ کھول ...مگر اپنی ملازمت کے خیال سے خاموش ہو گئی تھی۔"

"تم بتادو ملازمت کی فکر مت کرو میں دوسری ملازمت دوں گا۔"

وہ جلدی سے بولا۔

"شکریہ آپ کا صاحب جی ویسے میں اپنا فرض سمجھ کر بتا ...ہوں آپ جس دن یہاں سے گئے تھے اسی دن بیگم صاحبہ ...بات معلوم ہو گئی تھی

آپ شاید ان سے شادی کرنا چاہتے تھے پتہ نہیں ...سے بیگم صاحبہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ اسی لئے آپ کے جاتے ...ہنوں نے سارہ بی بی کو بہت گالیاں دیں کوسنے دیئے اور ...ر سے نکال دیا وہ بہت روئیں معافیاں مانگیں مگر بھلا ...ن کے دل میں بھی کبھی رحم آیا ہے۔"

بڑے جوش میں بولتے بولتے کریمن کی آواز بھرانے لگی۔ ...وہ خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا۔"

شاہ رخ نے بے تابی سے ہاتھ مسلے۔

"پھر کیا ہوتا تھا صاحب جی وہ بہت روتی رہیں ان کی کچھ ...میں ہی نہیں آرہا تھا۔ کہ کہاں جائیں یہاں کوئی ان کا جاننے ...بھی نہ تھا پھر میں ان کو بیگم صاحبہ سے چھپ کر اپنے گھر ...وہ جب سے میرے یہاں ہی ہیں۔"

کریمن نے رک رک کر بتایا تو شاہ رخ نے اطمینان کی ...س لی۔

"بوا تم نے بہت اچھا کیا اس کو اپنے یہاں لے گئیں میں ...را یہ احسان حشر تک نہیں بھول سکتا۔"

وہ بڑے ممنون سے لہجے میں بولا۔

"نہیں صاحب جی میں نے کبھی پر کوئی احسان نہیں کیا ایک ...وم کو ظالم سے رہائی دلانا اور حق دار کو اس کا حق دلوانا سب کا ...ض ہے۔"

"بوا تم مجھے اپنے گھر لے چلو۔"

"صاحب جی میں لے تو چلوں گی مگر سارہ بی بی کو یہ نہ بتایئے گا کہ میں نے آپ کو ان کے متعلق بتایا ہے۔"

"کیوں؟"

شاہ رخ حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"سارہ بی بی نے مجھے منع کیا تھا کہ میں ان کے متعلق کسی کو بھی نہ بتاؤں۔"

"مجھ کو بھی نہیں۔"

اس نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں۔"

وہ بولی۔

"کیوں" وہ مجسم سوال بن گیا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ سے ملنے کا یہ مطلب ہو گا کہ بیگم صاحبہ کو بھی ان کے متعلق پتہ چل جائے گا۔ تو وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں بیگم صاحبہ ان کو وہاں سے بھی نہ نکال دیں۔"

"پاگل ہے وہ۔"

شاہ رخ بڑے پیار سے بولا۔

"مجال ہے ان کی جو میرے ہوتے ہوئے کچھ کہیں بھی۔"

اس کے پر عزم انداز پر کریمن مسکرا دی۔

"تو پھر چلو۔"

شاہ رخ اس کو خاموش دیکھ کر بولا۔

"صاحب ابھی تو مجھے بہت کام کرنا ہے شام تک فرصت ہو گی۔ ایسا کیجئے میں آپ کو پتہ سمجھائے دیتی ہوں آپ وہاں ہو آیئے۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ راضی ہو گیا۔

اور پھر آدھے گھنٹے بعد ہی وہ اس کے کوارٹر کے سامنے کھڑا تھا اس نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟"

اندر سے سارہ کی آواز آئی اور اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔

"کھولو۔"

اس نے شرارت سے زنانہ آواز نکالی فوراً ہی دروازہ کھلا مگر غیر متوقع طور پر اس کو کھڑا دیکھ کر سارہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ڈر گئیں۔"

وہ ہنستا ہوا اندر آ گیا۔

"آپ ... عورت کی آواز۔"

وہ ہکلا ہکلا کر بولی۔

"ہاں میں نے ہی نکالی تھی مذاق میں مگر تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو۔"

وہ غور سے اس کی اڑی اڑی سی صورت دیکھ کر بولا۔

"نہیں تو۔"

اس نے اپنے اوپر قابو پایا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔"

اس کی طرف سے پشت کر کے بولی۔

"کیوں کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔

"نہیں۔"

وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"کیوں۔"

اس نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں نہیں چاہتی کہ دوبارہ انہی لوگوں میں جاؤں جنہوں نے مجھے اس حال پر پہنچایا ہے۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے۔"

وہ تلخی سے بولی۔

"ہوں اور نفرت سے زیادہ تمہیں ان سے ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں وہ لوگ تمہیں یہاں سے بھی نہ نکال دیں۔"

وہ اس کی بات سے مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

وہ خاموش رہی ویسے اس کے آخری جملے سے وہ سمجھ گئی کہ کریم نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔

"بتاؤ۔"

اس نے اسے خاموش دیکھ کر شانوں سے تھام لیا۔

"جبکہ میں نے تمہیں ڈرنے سے منع کیا تھا اور تم نے وعدہ بھی کیا تھا یاد ہے تمہیں تم نے میری قسم کھائی تھی۔"

وہ جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ جو اس کی بات پر بھیگنے لگی تھی۔ اس کے آنسو دیکھ کر جیسے اس پر جنون سا سوار ہو گیا

"بتاؤ تم وعدہ خلافی پر آمادہ کیوں ہو گئیں۔ قسم توڑ کر کیوں بیٹھیں مجھ سے کیا ہوا وعدہ بھول کیوں گئیں۔"

وہ اس کے شانے جھنجوڑ کر بولا۔

"شاہ رخ۔"

وہ سسک پڑی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں ان لوگوں نے میری زندگی عذاب کر دی ہے۔ آپ نہیں جانتے آپ کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے کیسی کیسی باتیں سنائی ہیں جو میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔"

بے اختیار روتے ہوئے وہ بولی۔

"میں سمجھتا ہوں سارہ انہوں نے تمام اخلاق سے گری ہوئی شرمناک اور ناشائستہ باتیں کی ہوں گی۔ مگر تم کیوں ہمت ہار گئیں یہ سب باتیں انہوں نے اسی لئے تو کہی تھیں کہ تم ڈر کے اپنے ارادے سے باز آ جاؤ مجھ سے دستبردار ہو جاؤ تاکہ ان کی بیٹیوں کے لئے راستہ صاف ہو۔"

وہ اپنی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

"اور تم اتنی بے وقوف ہو کہ سچ مچ ڈر گئیں۔ ارے پگلی کم از کم یہ تو سوچا ہوتا کہ میں جو اتنی کوشش کر رہا ہوں وہ سب رائیگاں تو نہ جائیں۔"

وہ بڑے پیار سے بولا۔ سارہ چپ چاپ کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

"اچھا ایک بات بتاؤ۔"

وہ ایک دم اس کا چہرہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں نگاہیں ڈال کر بولا۔ اگر میں چلا جاؤں تو میرے بنا خوش رہ سکو گی۔

اور اس کے سوال پر بے اختیار ہی اس کی نظریں جھک گئیں اس کے بغیر تو جینا ہی محال تھا اس سے جدائی کا تصور ہی اذیت ناک تھا۔ نا کہ وہ پوچھ رہا تھا کہ خوش رہ سکو گی۔

"سارہ اگر تم ہاں کہہ دو تو میں ابھی چلا جاؤں۔"

اس نے اسے خاموش دیکھ کر پھر چھیڑا اور سارہ کو ایک دم ہی اس کی بات پر شرارت سوجھ گئی۔ سر اٹھا کر بڑی بے باکی سے بولی۔

"ہاں۔"

"اوہ۔"

اس کے جواب پر شاہ رخ بجھ کر رہ گیا ایک لمحے تک غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر فوراً ہی گھوم کر واپس مڑا۔

سارہ تیزی سے بڑھ کر دروازے پر کھڑی ہو گئی وہ دروازے تک آ کر رک گیا۔

"ہٹو راستے سے۔"

غصے سے اسے گھورا۔

وہ مسکرا رہی تھی اس نے مسکراتے ہوئے بڑی معصومیت سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اوہ"

وہ ایک دم ہی نہال ہو گیا یہ مذاق کر رہی تھی دل اچانک ہی مسرت سے جھومنے لگا۔ مگر وہ بناوٹی غصے سے بولا۔

"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے"

"کیوں"

وہ ڈر گئی گھبرا کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"بس میں جا رہا ہوں تم نے پہلے ایسی بات کہی ہی کیوں"

وہ تیز لہجے میں بولا۔

"میں نے تو مذاق کیا تھا۔"

اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"تو میں بھی مذاق کر رہا ہوں"

وہ اس کے آنسو دیکھ کر پسیج گیا

"پگلی ذرا سا دل ہے تمہارا فوراً آنسو نکلنے لگے"

اس کے کان میں سرگوشی کی تو ایک حیا آلود تبسم اس کے لبوں پر پھیل گیا۔

"چلو اب اٹھو"

اس کے شانے تھپتھپا کر بولا۔

"کچھ ضروری باتیں ہو جائیں۔"

اور پھر شام تک وہ اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کو اپنی اسکیم سمجھائی ہزاروں تسلیاں اور دلاسے دیتا رہا دن کا کھانا بھی اس نے سارہ کے ساتھ ہی کھایا پھر شام گہری ہوتی دیکھ کر گھر آ گیا پہلے کرین کے پاس جا کر اس کو تمام صورت حال سمجھائی پھر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔

"کہاں غائب تھے بیٹے۔"

امی نے فوراً پوچھا۔

"ایسے ہی ذرا گھوم پھر رہا تھا۔"

وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا اور پھر ان کی باتوں میں شریک ہو گیا۔

دوسرا دن چھٹی کا دن تھا ناشتہ کرنے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھے باتوں کے دوران شاہ رخ نے سارہ کا ذکر چھیڑ دیا۔

"خالہ جان آپ کو کچھ معلوم ہے سارہ کس کے ساتھ بھاگی ہے"

اس نے براہ راست حمیدہ بیگم سے سوال کر لیا اچانک سارہ کا ذکر چھیڑ دینے سے حمیرا اور فوزیہ کا سا منہ بنا کر رہ گئیں رئیسہ بیگم اور صغیر احمد حیرت اور تجسس کے ملے جلے تاثرات لئے شاہ رخ کی طرف دیکھنے لگے اور حمیدہ بیگم نے کمال چالاکی سے جواب دیا۔

"بیٹا مجھے تو کچھ معلوم نہیں رات کو اچھی بھلی سوئی تھی صبح غائب تھی ہم نے بہت ڈھونڈا نہیں ملی تو خود ہی سمجھ گئے۔"

"خالہ جان آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کس کے ساتھ جا سکتی ہے۔"

وہ اچانک صغیر احمد کو مخاطب کر بیٹھا۔

"بیٹا مجھے تو سرے سے اس بات پر یقین ہی نہیں مگر یہ لوگ یہی کہتے ہیں اور اس کی غیر موجودگی اس بات کا ثبوت بھی پیش کرتی ہے۔"

وہ سنبھل کر بولے۔

"تم میں سے کوئی"

اس نے باری باری حمیرا اور فوزیہ کی طرف دیکھا۔

سوری ہمیں تو جو امی نے بتایا مان لیا اور ظاہر ہے۔ امی جھوٹ تو نہیں بولیں گی۔"

"ہوں"

اس کی ہوں بڑی معنی خیز تھی جسے سب ہی نے محسوس کیا۔

"کرین"

وہ اچانک چلایا اور کرین فوراً ہی کمرے میں داخل ہوئی جیسے منتظر ہی کھڑی تھی۔

"شروع ہو جاؤ ان سب کو بتاؤ کہ سارہ کیوں گئی کہاں گئی اور کس کے ساتھ گئی۔"

وہ بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔

اور پھر جو کرین نے حمیدہ بیگم کے پول کھولے تو رئیسہ بیگم کے ساتھ ساتھ صغیر احمد بھی بھونچکے رہ گئے۔

"ابھی اس دنیا میں کچھ انسان باقی ہیں خالہ حضور ورنہ یہ دنیا تباہ ہو جاتی۔"

کرین کی بات کے اختتام پر نہایت طنز سے وہ بولا۔

وہ سب خاموش بیٹھے اس کی صورت دیکھتے رہے۔

"خالو جان آپ نے اسے یہاں لانے کا احسان عظیم کر کے اس کی زندگی برباد کر دی آپ نے اس سے پلٹ کر کبھی یہ نہیں پوچھا کہ وہ جی رہی ہے یا مر رہی ہے اسے کوئی تکلیف تو

ہیں ہے اُسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں آپ نے یہ تک
نہ سوچا کہ وہ آپ کے مرحوم بھائی کی اولاد ہے اور اُسے تکلیف
میں دیکھ کر ان لوگوں کی روح کتنا تڑپتی ہوگی۔ کتنا بے چین ہوتی
ہوگی۔ آپ قیامت کے دن انہیں کیا منہ دکھائیں گے کیا حساب
دیں گے۔ ان کی دولت کا کروڑ جائیداد سب کیا ہو گئی جن کا ایک
پیسہ بھی سارہ کو نہ مل سکا وہ یہاں نوکروں سے بدتر زندگی گزار رہی
تھی اور آپ سب اس کے پیسے سے عیش اڑاتے رہے۔"
وہ بڑے جوش میں بول رہا تھا۔ اور اس کی باتیں آج
صغیر احمد کا ضمیر جھنجھوڑ ڈال رہی تھیں وہ غیر تھا مگر اس کو اس کا
کتنا خیال تھا اور وہ اس کے سگے چچا ہو کر اس کے لئے کچھ نہ کر سکے
تھے شاہ رخ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کی عزت پہ
تازیانے برسا رہا تھا انہیں سخت شرمندگی کا احساس دلا رہا تھا۔
"بیٹے سارہ کہاں ہے اسے بلاؤ میں اس سے اپنی کوتاہیوں
کی معافی مانگوں گا اور حتی الامکان کوشش کروں گا کہ اس کے
ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔"
وہ بھرائی ہوئی آواز میں ندامت سے بولے۔
"کریمن جاؤ سارہ کو لے آؤ۔"
اس نے جیسے حکم دیا اس وقت وہ کوئی کھلنڈرا یا شریر نوجوان
نہیں بلکہ بڑا ہی پروقار، بارعب سا شخص لگ رہا تھا۔
کریمن فوراً باہر چلی گئی اور پھر دو منٹ کے اندر ہی کمرے میں
داخل ہوئی سارہ اس کے ساتھ تھی سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدم
اُٹھاتی۔ اس کے چہرے پر پاکیزگی تقدس اور معصومیت کا کچھ ایسا
نور تھا کہ رئیسہ بیگم پلکیں جھپکا کر رہ گئیں۔
صغیر احمد اُسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور بڑی
شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر نادم سے لہجے میں بولے۔
"سارہ بیٹی مجھے معاف کر دو مجھ سے بڑی کوتاہیاں ہوئی ہیں"
ان کے شفیق انداز پر وہ ضبط نہ کر سکی آنسو لڑیوں کی سی
صورت میں اُس کی آنکھوں سے بہنے لگے تو انہوں نے نہایت
محبت سے اُسے اپنے شانے سے لگا لیا اور اس کے شانے
تھپک تھپک کر اُسے چپ کراتے لگے بڑی مشکل سے اس نے
اپنے آنسو روکے اور ان سے علیحدہ ہو گئی۔
"سارہ یہاں آؤ۔"
فوراً ہی شاہ رخ کی آواز آئی تو وہ مشینی انداز میں اس کی
طرف مڑی۔
"یہ میری امی ہیں۔"
اس نے رئیسہ بیگم کی طرف اشارہ کیا تو سارہ نے نہایت
ادب سے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر انہیں آداب کیا۔

"جیتی رہو بیٹی۔"
انہوں نے اچانک ہی اُٹھ کر اُسے سینے سے لگا لیا اس ہونق
سی معصوم صورت والی مظلوم سی لڑکی پر انہیں پیار کے ساتھ ساتھ
ٹوٹ کر رحم بھی آیا۔ ان کی شفیق چھاتی سے لگ کر وہ ایک بار پھر
پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
"اب بس کرو بیٹی بہت رولیں۔"
انہوں نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔
"خالہ جان۔"
وہ آنسوؤں کے درمیان سر اُٹھا کر بولی۔
"خالہ جان نہیں امی جان"
انہوں نے محبت سے ٹوکا۔
"مجھے اپنی ماں سمجھو بیٹی"
"ماں۔"
اس نے سرشاری سے کہہ کر ان کے سینے میں دوبارہ منہ
چھپا لیا انہوں نے بڑے پیار سے اس کی پیشانی چومی پھر پروقار
سی چال چلتی ہوئی شاہ رخ کے قریب آئیں اور اس کے سر پر محبت
سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔
"مجھے تمہاری پسند پر فخر ہے بیٹے۔"
"امی۔"
وہ خوشی سے لپٹ گیا ان کے کندھے پر سے شوخ شوخ
نگاہوں سے سارہ کی طرف دیکھا جو ایک شرمگیں مسکراہٹ لبوں
پر سجائے اسی کو دیکھ رہی تھی سارہ نے اس کی شوخ نظروں کی
تاب نہ لاتے ہوئے جلدی سے نظریں چرا لیں۔
"پگلے"
انہوں نے شاہ رخ کو الگ کیا پھر بولیں۔
"چلو بچو تم لوگ باہر جاؤ میں ذرا صغیر بھائی سے کچھ ضروری باتیں
کرلوں اور ہاں کریمن تم گرما گرم چائے لے آؤ۔"
ان کے کہنے پر سب اُٹھ گئے حمیرا اور فوزیہ منہ ہی منہ میں
کچھ بڑبڑاتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں
کریمن باورچی خانے کی طرف چلی گئی
تو شاہ رخ نے سارہ کو آدھے ہی میں روک لیا۔
"آپ نے تو مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جو میں مر کر بھی نہیں
بھول سکتی۔" وہ ممنون سے انداز میں بولی۔
"اچھا جی پھر کہیں" اس نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکالیں۔
"ابھی دو نگا ایک ہاتھ تو سب احسان وحسان بھول جاؤ گی۔"
اس کی پیار بھری دھمکی پر وہ بڑے دلنشین انداز میں ہنسنے لگی تو
اسکو ہنستا دیکھ کر وہ بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

سعادت نسرین

ہاتھ کی لکیریں

پی۔ کے۔ بوئنگ ۷۰۷ لاہور سے کراچی جانے کیلئے تیار کھڑا تھا۔ طیارے کے دروازے پر کھڑی ایئر ہوسٹس ہر آنے والے مسافر کو مسکرا مسکرا کر خوش آمدید کہہ رہی تھی
نائمہ تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نگاہیں جھکائے خاموشی سے اندر چلی گئی۔ اور اپنا سیٹ نمبر دیکھ کر کھڑکی کے برابر سیٹ پر جا کر بیٹھی۔ تمام مسافروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر وہ کھڑکی سے باہر کھلے آسمان کو گھورنے لگی۔
سرمئی رنگ کے بادل جا بجا آسمان پر چھائے جا رہے تھے
آج اس کا دل بہت اداس تھا جیسے اندر ہی اندر ٹوٹے جا رہا ہو عجیب سا کرب اس کی روح پر چھایا ہوا تھا، بار بار ویران آنکھوں میں نمی سی تیر جاتی تھی۔ اس نے دبی گھٹی سی سرد آہ بھری۔۔۔۔
صرف ایک ماہ ہی تو گزرا ہے اتنی قلیل مدت میں کیا سے کیا ہو گیا۔ کراچی سے لاہور آتے ہوئے میں کتنی خوش تھی۔ مسکراہٹ میرے لبوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مسرت میرے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔ اور آج جیسے اس نام کی کسی شے کو میں جانتی ہی نہیں۔ انجانے بوجھ تلے میرا وجود دبتا جا رہا ہے۔ سانس تک لینی دشوار ہے۔
ماموں جان کے اس درجہ اصرار پر میں پورے دو سال کے بعد ان کے ہاں لاہور آئی تھی۔ عائشہ اور صوفیہ میرے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ ماموں اور ممانی مجھ پر نثار ہو رہے تھے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ زندگی سے بھرپور تھا۔ شب و روز خوب عیش سے گزر رہے تھے کہ خلافِ توقع اماں کا سنسنی خیز فون آ گیا۔
وہ فون پر مجھ سے مخاطب تھیں۔۔۔ نائمہ میری بات کو غور سے سنو کچھ خواتین تمہیں دیکھنے کے لئے تمہاری ممانی کے ہاں آ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ٹھیک طرح سے پیش آنا۔ سمجھی تمہاری ہڑبونگ سی عادت کو میں خوب جانتی ہوں ہر آدمی کو ہنسی مذاق میں لتاڑ جاتی ہو۔ لیکن اب تمہیں سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ کوئی غیر مناسب حرکت مت کر ڈالنا۔۔۔
اماں کہتی رہیں اور میرے قدموں تلے سے زمین سرکتی رہی جس بات کا ڈر تھا وہ تو ایک روز پیشتر ہی ہو چکی تھی۔ اماں نے فون کرنے میں تاخیر کر دی۔
واقعہ یوں ہوا کہ ماموں اور ممانی کی غیر موجودگی میں چند اپ ٹو ڈیٹ سی خواتین آ گئیں۔ عائشہ اور صوفیہ ان سے ناواقف تھیں مجھے کچھ شبہ سا ہوا کہ وہ عائشہ کو دیکھنے آئی ہیں۔ اور اس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ انجم کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ چنانچہ اپنی فطری شوخی کے باعث ان خواتین سے تفریح کرنے کی سوچی بلاخوف و خطر ان کے ساتھ نہایت نامعقول سے سوالات کرتی رہی۔۔۔ لڑکا کیا کرتا ہے تنخواہ کے علاوہ بھی آمدن کا کوئی ذریعہ ہے کہ نہیں۔ کتنا خوبصورت ہے چلیئے خوبصورتی کو جانے دیجئے یہ بتلایئے۔ گھر کے کام کاج کتنے آتے ہیں روٹی پکانا تو آتی ہی ہوگی یہ کام لڑکیوں کو ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ آیا گیری بھی اس زمانے میں بڑی مہنگی ہے۔ شوہر نامدار کو بچے بھی سنبھالنا پڑیں گے۔
یاد نہیں پڑتا کیسے کیسے فضول سوالات کر ڈالے تھے مگر وہ خواتین جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں مسکراتی بلکہ ہنستی ہی رہیں میری اس نازیبا حرکت پر پردہ ڈالنے کے لئے صوفیہ نے ان کی چائے اور دیگر لوازمات سے خوب خاطر تواضع تو کر دی مگر ان کے رخصت ہونے کے بعد میری بھی خوب خبر لی۔ کہ جانے کون شریف لوگ تھے کس مقصد کے لئے آئے تھے۔ اماں کتنا ناراض ہوں گی۔ نیر میں تو کراچی سدھار جاؤں گی۔ لاہور میں ان کا جینا محال ہو جائے۔
جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ ہم نے ممانی جان اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اب اماں کے فون نے مجھے چونکا کر رکھ دیا تھا۔ تو گویا یہ خواتین مجھے دیکھنے آئی تھیں۔ جبھی سب سے پہلے یہی پوچھا تھا کہ کراچی سے آپ تشریف لائی ہیں،
جانے میری عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے تھے اپنی طرف میرا رتی برابر دھیان نہ گیا ورنہ کم سے کم ان سے فضول سے سوالات تو نہ کرتی۔
اپنی حماقت پر تو میں اتنی نادم نہ تھی جتنا دل مجروح ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہیں میرے اور آصف کے درمیان خاندانی دیواریں نہ حائل ہو جائیں۔ ہمارے جذبات نہ کچلے جائیں۔۔۔ موتی سی محبت حالات کی نذر نہ ہو جائے کیسا والہانہ پیار ہے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ۔۔۔ تین برس سے آصف میرے ساتھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے جب سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ گھائل سے ہو گئے تھے ہر نیا لمحہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب کرتا گیا۔ زندگی کی پھیکی تصویر میں رنگ بھرتے گئے دھندلے دھندلے نقوش ابھر کر واضح ہوتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے محبت کے ایسے شاہکار نے جنم لے لیا کہ قدرت بھی دنگ رہ گئی سوچا تھا تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گا۔ تو نئی زندگی کی بات کریں گے۔ کہیں ہماری محبت مصلحتوں کے قدموں تلے نہ روندی جائے

اِک پھانس سی ہر وقت میرے دل میں اُترنے لگی، کبھی وقت میں اپنے آپ کو تسلی دے لیتی۔

اوّل تو وہ خواتین دوبارہ قدم رنجہ نہیں ہو سکتیں، غیرت مند کے لئے اِس قسم کا سلوک ایک مرتبہ ہی کافی ہے۔

دوسرے اماں آخر اماں ہیں۔ میرا دل توڑنے کا موجب کیوں بنیں گی۔ ساری عمر ان کی گود سے ممتا کی مہک اٹھتی رہی، میری رتی رتی بھر تکلیف کا مداوا بنی رہیں تو کیا اب میرے ارمانوں کا خون کر دیں گی۔ ہاں نہیں ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ ماں تو اولاد کو صرف خوشیاں ہی بانٹتی ہیں۔ سکھ ہی سکھ مہیا کرتی ہیں۔

لیکن میرے ڈھکے چھپے خدشوں نے آخر حقیقت کا روپ دھار لیا، جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی۔

دو روز قبل اماں نے ممانی جان کو فون پر بتایا کہ ایک نہایت اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ کے ساتھ نائمہ کا رشتہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ صرف رسمی سی بات باقی رہ گئی ہے کہ نائمہ سے اس کا تذکرہ کرنا ہے۔ لڑکا خوبصورت، قابل اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اور معلوم نہیں کیا کیا۔

میری عقل دنگ رہ گئی کس دھڑلے سے اماں نے کہا تھا... صرف رسمی سی بات باقی رہ گئی ہے۔ کہ نائمہ سے اس کا تذکرہ کرنا ہے۔

گویا میری حیثیت اِس گھر میں اتنی ہے کہ مجھ سے میری زندگی کے بارے میں صرف تذکرہ ہی کیا جائے یہ حق انہیں کس نے دیا ہے۔؟

میری تابعداری کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی زندگی سے کھیل جاؤں آصف کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکوں گی اماں کو میری بات سننا پڑے گی۔ ماننا پڑے گی۔ میری خوشیوں کو پامال کرنے کا انہیں کوئی حق نہیں۔ میں احتجاج کروں گی۔ بیٹی ہوں تو کیا ہوا۔ اپنے حقوق کے لئے جنگ کروں گی۔

گزشتہ دو راتوں سے میں جاگ رہی ہوں۔ نیند کی دیوی مجھ سے رُوٹھ گئی ہے۔

میری آنکھوں میں بغاوت کا خون اُتر آیا ہے والدین کی محبت نہ جانے کہاں جا چھپی ہے۔

کبھی وقت میرے دل کے کواڑ پہ دستک ہونے لگتی ہے۔

نائمہ یہ تم ان والدین کے بارے میں سوچ رہی ہو جنہوں نے جانے کتنی محنت، مشقت کے بعد تمہیں پرورش کیا ہے۔

اپنی ہر خوشی تج کر تمہاری ذرا ذرا سی خوشی پوری کی ہے تمہاری معمولی معمولی سی خواہشوں کا بھی احترام کیا ہے جو ہر گھڑی تمہاری بھلائی کے لئے متفکر رہے ہیں پھر میں سوچتی ہوں یہ سب کچھ کیا ہے تو کون سا انہوں نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ یہ تو والدین کا فرض ہے لیکن میری زندگی سے کھیلنے کا انہیں کوئی حق نہیں میں آصف کو حاصل نہ کر سکی تو مر جاؤں گی۔

والدین تو ہمیشہ سے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ شادی سے پہلے محبت ایک حسین سپنا ہے۔ دلفریب خواب ہے جو وقتی طور پر اپنا سحر طاری کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے گویا بیدار ہونے کے بعد انسان اپنی غفلت پر نادم ہو جائے۔

جانے والدین اتنے سنگدل کیوں ہوتے ہیں صرف ہماری مالی حیثیت کا ہی سوچ سکتے ہیں دل کو اہمیت نہیں دیتے اگر دل ہی مجروح ہو جائے تو خوشیاں کہاں سے حاصل ہوں گی۔

ہمارے اِس احتجاج پر والدین کا ازل سے یہی جواز ہے کہ حقیقی زندگی کا آغاز تو شادی کے بعد ہوتا ہے شادی سے پیشتر دلوں کا ٹوٹنا اور جڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا... یہ نوعمری کی بھول ہے اب ان سے بحث کون کرے اور انہیں کیسے سمجھائے۔

جہاز نے کب کراچی ائر پورٹ پر لینڈ کیا تھا اور کب وہ گھر پہنچی تھی اُسے کچھ ہوش نہ تھا اس کا دل کرچی ہوا جا رہا تھا لیکن اس نے دیکھا اماں بابا کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے۔

ایسی خوشی، ایسی شادمانی اس سے پہلے اس کی نگاہوں سے نہیں گزری تھی جیسے انہوں نے کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ زیر کر لیا ہو۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ کیا کروں۔ انہیں اپنے فیصلے سے کیسے آگاہ کروں کہیں ان کی بے پناہ مسرتوں کی قاتل نہ بن جاؤں... یہ بھی مجھے زیب نہیں دیتا۔ جن دودھ کی مہک میرے خون پسینے میں رچی بسی ہے اِس سے بے مروتی کروں، میری اس گستاخی کو تو شائد خدا بھی معاف نہ کرے۔ اور جب اماں نے اُسے اپنے سینے سے بھینچ کر بھیگی آنکھوں اور گلوگیر آواز میں کہا۔

میری بچی۔ تو تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ صد شکر کہ مولا نے اپنی رحمت سے تیرے نصیب روشن کر دیئے تو اس کی زبان گنگ ہو گئی اس کی سوچوں پر پہرہ لگ گیا۔ نہیں نہیں میں ممتا کی گناہگار نہیں بنوں گی۔ اپنے ارمانوں کا گلا تو گھونٹ سکتی ہوں۔

ماں کی خوشیاں مجروح کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی میری ہر خوشی پر اس کا حق مقدم ہے۔

اگلے بہت سارے دنوں میں اس نے بہت کچھ سنا گھر کا ہر فرد طرح طرح سے اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کر رہا تھا وہ پتھر کی مورت بنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب دیکھتی رہی سنتی رہی لیکن اس بات کا اُسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ اب یہ آتش فشاں باہر نہیں نکل سکتا۔ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں اگر کبھی ایسا ہو گیا۔ تو زبردست بھونچال آجائے گا۔ ہر چیز تہہ و بالا ہو جائے گی۔

سینے کی یہ گھٹن لیئے وہ دلہن بن کر پیا دیس سدھار گئی۔ چہرے پر کھنڈی ویرانی اور لبوں پر جمی تلخی سُرخی غازے کی تہوں میں چھپ گئی۔ لٹے لٹے بکھرے بکھرے وجود کے ساتھ اس نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔۔۔ شب بھر یوں لگتا ہے کہ کوئی بھاری انجن اس کے انگ انگ کو کوٹتا رہتا ہے۔ تمام دن اس کی ٹیسیں روح میں سمیٹے رکھتی۔ بظاہر زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیل رہی تھی۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے قدم بھاری بھاری سلاخوں میں جکڑے جا چکے ہوں۔۔۔

دنیا کی نگاہوں میں اس کے حصے پر خوش نصیبی آئی تھی۔ لیکن اس کے وجود کے اندر ٹوٹ پھوٹ کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی۔ زخمی روح میں سے ابلتا ہوا سُرخ سُرخ خون کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

یوں تو جاوید کو شب عروسی کو ہی اس نے جسمانی طور پر اپنا شوہر تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن ذہن کو مائل ہوتے ہوتے ایک مدت لگ گئی جاوید بلاشبہ ان گنت خوبیوں کے مالک تھے۔ پیار میں حرارت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا ٹھہراؤ بھی تھا۔ شخصیت میں وقار اور انتہا درجہ ملائمیت تھی یہی سب کچھ مل ملا کر نائمہ کے زخموں کی پیوند کاری کرنے لگا۔ جاوید صحیح معنوں میں انسان تھے اور یہی نائمہ کی سب سے بڑی خوش بختی ثابت ہوئی۔ انسان ہی انسان کا مرہم بن سکتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے انہیں ذہنی طور پر بھی قبول کر لیا اب ذہن کے دریچے سے آصف جھانکتا بھی تو وہ اسے منع کر دیتی۔ جو بیت گئی سو بیت گئی۔ کاتب تقدیر کے آگے ہمارا زور نہیں میں ایک شفیق مہربان شوہر کی وفا شعار بیوی ہوں۔ میری سوچوں میں بھی کوئی دوسرا نہیں آنا چاہیئے۔

اب راتوں کو اس کے وجود پر گھوڑے نہیں دوڑتے تھے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دھیمے دھیمے پیار کی پھوار برس رہی ہو۔۔۔ دن بھر اک نشہ سا اس پر چھایا رہتا۔

وقت ٹھنڈے میٹھے چشمے کی طرح زندگی کے قدموں میں مچلنے لگا تھا کہ قدرت نے ایک اور آزمائش کے لئے اس کا انتخاب کر لیا۔

ایک شام جاوید آفس سے آتے تو ڈرائنگ روم سے ہی شور مچا دیا۔

"ارے بھئی نائمہ کہاں ہو دیکھو تو کون آیا ہے۔"

وہ شام کی چائے کے لئے کریم رولز بنا رہی تھی۔ ہاتھ صافی سے پونچھ کر بال درست کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ لیکن جاوید کے برابر آصف کو کھڑے دیکھ کر اس کے قدم زمین میں جیسے پیوست ہو گئے ہوں آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں وہ ایک لفظ بھی تو منہ سے نہ بول سکی چہرہ سفید ہوتا چلا گیا۔

آصف بھی نگاہیں جھکائے کھڑا رہا۔

جاوید کی شوخ آواز گونجی۔"

"واہ بھئی کیسے دیور بھابی ہو۔ سلام نہ دعا۔ دونوں نے ہی منہ میں گھونگھٹ ڈال لئے۔

جاوید نے آصف کو صوفے پر بٹھایا اور نائمہ سے مخاطب ہوئے۔

"بھئی صاحبزادے ہمارے بڑے ماموں کے پرنس آف ویلز ہیں۔ کراچی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ خیر سے یونین کے صدر ہیں کسی کام کے سلسلے میں چند روز کے لئے لاہور تشریف لائے ہیں۔

ذرا توقف کے بعد دوبارہ بولے۔

"یہ تو بغیر ملے ہی بھاگ جاتے۔ مال روڈ پر گزرتے ہوئے اچانک میں نے انہیں جا دبوچا اور پکڑ دھکڑ کر یہاں لے آیا ہوں۔ ہماری شادی کے دنوں میں سخت بیمار ہو گئے تھے۔ یوں سمجھ لو نئی زندگی ہوئی ہے تم سے تو آج ہی ملاقات ہو سکی۔"

منہ موڑ کر آصف سے پوچھا۔

"کیوں میاں پہلے یہ تو بتاؤ۔ یہاں قیام کیوں نہیں کیا ہے دوست کے ہاں کیوں ٹھہرے ہو۔"

آصف بولا۔

"میں نے عرض کیا نا بھائی جان میرے ہمراہ دو لڑکے اور بھی ہیں۔ ہم اکٹھے ٹھہرے ہیں۔"

جاوید نے گلہ کیا۔

"اور ملنے کیوں نہیں آئے تھے؟"

آصف جھجکتا ہوا بولا۔

فرصت نہیں مل رہی تھی ورنہ ضرور آتا۔ ویسے کل صبح آفس میں تو ضرور ملنے آجاتا۔

جانا تو مجھے کل شام کو ہے۔

جاوید نے آنکھیں نکالیں۔

"اچھا تو حضور کا ارادہ اپنی بھابی سے ملنے کا نہیں تھا۔ کیوں بھئی، اس گستاخی کی جرأت کیسے ہوئی۔"

آصف نے نائمہ کو دیکھے بغیر پھر نگاہیں جھکالیں۔

جاوید خوشدلی سے بولے۔

"نائمہ! تم ان کے بارے میں کوئی غلط رائے نہ قائم کرلینا ان دنوں کچھ مصروف یا شاید پریشان سے لگ رہے ہیں۔ ورنہ ان کی خوش مزاجی اور بذلہ سنجی کا تو خاندان بھر میں شہرہ ہے تم فرسٹ کلاس سی کافی بنا کر لاؤ میں ذرا اس کے کان مروڑ کر حال چال پوچھ لوں۔"

نائمہ ڈگمگاتے قدموں سے باورچی خانے میں آگئی۔

خانساماں سے کافی بنانے کا کہہ کر وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ یہ کیا ہوا۔ آصف میں تو تمہیں ایک حد تک فراموش کر چکی تھی، دوبارہ میری زندگی میں کیوں چلے آئے ہو اگر میری ہنستی مسکراتی زندگی کو کچھ ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہو گا۔ خطا تمہاری ہے، نہ میری۔ ہم مل کر جدا ہو گئے ہماری راہیں الگ ہو گئیں وقت ابھی ہمارے زخمی سینوں پر پھاہے رکھ رہا تھا کہ قدرت کو یہ کھیل سوجھ گیا۔ کہیں ہم تماشہ نہ بن جائیں آصف ہمارے وجود زبان حال سے کہیں بھری محفل میں اقرار محبت نہ کرلیں۔

میں رسوا ہو گئی تو اس گھر میں ہی نہیں دنیا میں میرا ٹھکانہ نہ ہو گا۔ محبت کی خوشبو کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ بولو آصف ہم کیا کریں گے۔ ہمارے انگ انگ نے حقیقت کشائی کردی تو ہم کہاں جائیں گے۔ میں تو اس آگ کو ارمانوں کی منوں مٹی تلے دفنا چکی تھی۔ پھر اس کی چنگاریاں کیوں ہوا دینے لگیں۔

اے خدا اب کیا ہو گا۔ تو نے کس مشکل میں مبتلا کر دیا ہے ہمیں۔

نائمہ سر نہوڑائے اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ کہ اچانک جاوید اندر آگئے اور محبت سے شکایت کی۔

"تم بھی خواب ہو نائمہ، یہاں آکر بلا وجہ بیٹھ گئی بھئی ہمارے پاس آکر بیٹھو نا۔ آصف کیا سوچے گا۔"

نائمہ نے بہانہ بنایا۔

"وہ۔ کافی کا انتظام ہے نا۔"

جاوید بولے۔

"ارے بھئی کافی کا کیا ہے۔ خانساماں لے آئے گا۔"

نائمہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ صوفے کے کونے میں دھنس کر اس نے دزدیدہ نگاہوں سے آصف کی طرف دیکھا۔

مرجھایا ہوا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ویرانی کھنڈر ہی تھی ہونٹوں پر پیڑی جمی تھی۔ نائمہ روح کی گہرائیوں سے لرز اٹھی یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے آصف۔ زندگی ہر حال میں اپنا حق مانگتی ہے۔

جاوید کی آواز سے وہ چونکی۔

"ارے بھئی نائمہ۔ تم بھی تو اسی یونیورسٹی میں تھی۔ کیا کبھی اس سے نہیں ملی تھی۔ پھر آصف سے مخاطب ہوتے۔

"کیوں مسٹر کبھی اپنی بھابی کو دیکھا تھا"؟

آصف دھیمی آواز میں بولے۔

"یاد نہیں پڑتا ممکن ہے کبھی نگاہ پڑی ہو۔"

نائمہ کے دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

تم کیا جانو جاوید ہمارے دکھی دلوں پر اس وقت کیا بیت رہی ہے قدرت کو جانے ہمارا یہ امتحان کیوں مقصود ہے۔ ایسی تو کوئی سزا ہم سے سرزد نہ ہوئی تھی۔ جرم محبت اس اذیت کا تو مستحق نہیں۔

آصف جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو جاوید بولے۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو یار کافی تو پی لو۔"

خانساماں ٹرالی لے آیا اور جاوید نے ایک پیالی کافی آصف کو پیش کی اور دوسری خود اٹھالی۔ نائمہ نے پینے سے منع کر دیا تھا۔ کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے جاوید نے کہا۔

"کل دوپہر کا کھانا تم ہمارے ساتھ کھاؤ گے۔ آصف تمہاری بھابی چائنیز کھانا بہت عمدہ بناتی ہیں۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا سمجھے!"

آصف نے کہا۔

"نہیں بھائی جان کل آنا تو بہت مشکل ہے بہت کام ہے مجھے بلکہ ابھی بھی جلد پہنچنا ہے۔"

جاوید نے ضد کی۔

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا میاں کہ تم ان کے ہاتھ کا پکا ہوا چائنیز کھانا نہ کھاؤ جیسے بھی ہو تمہیں وقت نکالنا پڑے گا۔"

آصف نے دبی گھٹی آواز میں کہا۔

"پھر کبھی سہی بھائی جان۔ آپ بلا وجہ اصرار کر رہے ہیں۔"
جاوید نے خفگی سے کہا۔
"بڑے گستاخ ہو گئے ہو میاں بزرگوں کا کہا نہیں مان رہے ہو۔ ذرا دیر کی کونسی بات ہے۔"
آصف بے بس ہو گئے اور لاچار حامی بھرنا پڑی۔
انہیں رخصت کرنے کے بعد جاوید نے نائمہ سے کہا۔
"تم نے آج بے چارے آصف کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے کوئی لفٹ ہی نہیں کرائی بیچارے کو کوئی بات ہی نہیں کی اس کے ساتھ وہ بھی کیا سوچتا ہوگا کہ کیسی بد مزاج بھابی ہے۔"
نائمہ زخمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے ہوئے سے مسکرا دی مگر اندر سے جیسے ٹوٹ کر رہ گئی ہو۔ رات بھر بستر اُسے سولی کا تختہ معلوم ہوتا رہا۔ کہیں پل چین نہ آیا۔ روح پر برچھے چل رہے ہوں تو قرار کیسے آئے۔ بے آب ماہی کی طرح تڑپتے تڑپتے صبح ہو گئی۔ اذیت تھی کہ اس کے گرد اپنا حلقہ تنگ کئے جا رہی تھی۔ اُسے نہیں معلوم دن کیسے گزرا کیسے آصف کے لئے کھانا تیار کیا اور تب جاوید آصف کو لئے گھر آ گئے۔
میز پر کھانا چن دیا گیا۔ رنگ رنگ کی خوشبو سے کمرہ مہک اُٹھا تھا۔ جاوید ہنس ہنس کر آصف کی پلیٹ میں چیزیں بھرتے جاتے تھے اور وہ سہمی ہوئی کونے کی کرسی میں دبکی بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں کسی کی کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ وہ ذرا سا کھانا پلیٹ میں ڈالے ذرا ذرا سا چکھے جا رہی تھی۔ کسی وقت جاوید اس کی طرف بھی متوجہ ہو جاتے مگر پھر جیسے کچھ سوچتے ہوئے چپ ہو جاتے ہوں۔ آج پھر آصف نے اور اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ ایک دوسرے کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا تک نہ تھا۔
آصف چلا گیا۔ نائمہ تھکے تھکے وجود کے ساتھ بستر پر دراز ہو گئی۔ جاوید صوفے پر لیٹے کوئی میگزین دیکھتے رہے کب شام ہوئی۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ نائمہ کا ذہن ماؤف ہی رہا۔ لٹی پٹی سی بستر پر پڑی رہی۔ جانے کیوں۔ کوشش کے باوجود اسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا عقل پر پتھر پڑ گئے ہوں۔ یا قوت گویائی سلب ہو چکی ہو۔ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ کیسا جھٹکا لگا تھا کہ وہ ساری کی ساری اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔
جاوید نے کمرے کی بتی جلا کر اُسے اندھیرے میں چھت کو گھورتے دیکھا۔ تو سٹپٹا کر بولے۔
"طبیعت تو اچھی ہے تمہاری نائمہ کیا بات ہے؟"
وہ شبنمی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بمشکل بولی۔
"کچھ نہیں۔ ذرا سر میں درد ہے۔"
جاوید اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے محبت سے بولے۔
"میں سر دباتا ہوں۔ انشاء اللہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"
جاوید نگاہوں میں پیار کی جوت جگائے ہوئے ہوئے اس کا سر دباتے رہے اور وہ کرب سے اندر ہی اندر سسکتی رہی۔
میں تو ان کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔ انہی کے ساتھ کیا ہوا۔ وفا کا وعدہ نبھانا چاہتی ہوں۔ ماضی کو بھلا کر ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکروں کی یہ بارش کیوں برس رہی ہے، اب قدرت کو کیا منظور ہے اگلے بہت سارے دنوں میں اس کا یہ کرب گھٹنے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ جانے کس دکھتی رگ پر مضراب آن لگا تھا کہ زندگی کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی اب کیا ہوگا۔ یوں لگتا تھا اس کے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا جاوید اُسے اداس پریشان دیکھ کر طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔
وہ کسی بات کا کوئی معقول جواب نہ دے سکی۔
جاوید مضمحل سے دکھائی دینے لگے۔
نائمہ نے ایک بار پھر اپنی قوتوں کو سمیٹ کر ماضی سے برسرِ پیکار ہونے کا ارادہ کر لیا یا پھر خوفی آندھی اپنی تمام تر تباہ کاریوں کیساتھ آ کر گزر چکی تھی دھیرے دھیرے وہ سنبھلنے لگی اپنے کھوئے کھوئے حواس مجتمع ہونے لگے لیکن شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی تیر کمان سے نکل چکا تھا یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جاوید اندیشوں، خدشوں کا شکار ہو چکے ہوں۔ ہر وقت گم سم سے رہنے لگے تھے۔ دزدیدہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے رہتے منہ سے کچھ نہ بولتے آفس سے آ کر چپ چاپ ڈرائنگ روم میں رسالے لئے پڑے رہتے یا پھر کسی کو ملنے چلے جاتے۔ کھانے کی میز پر بھی چہکنا جیسے بھول گئے ہوں گھر کے اندر داخل ہوتے ہی نعرہ لگانا بھی شاید اب یاد نہ رہتا تھا کھوئے کھوئے جانے کیا سوچتے رہتے۔
نائمہ روح کی گہرائیوں سے لرز اٹھی یہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہیں وہ خوشبو تو نہیں سونگھ لی جسے میں سو پردوں میں چھپا رکھنا چاہ رہی ہوں۔ اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا۔ آسمان دہل اُٹھے گا۔ زمین شق ہو جائے گی۔ میں برباد ہو جاؤں گی۔ شرافت کے نام پر بٹہ لگ جائے گا..... یہ اندیشے یہ وسوسے [illegible] زیر و زبر بڑھتے ہی گئے نائمہ اپنے شوہر کو دیکھتی تو دل مسوس کر رہ جاتی کچھ پوچھتی تو جواب ہمیشہ ہوں ہاں میں ہی وصول کرتی۔ وہ خدا کے حضور گڑگڑائی۔ اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی مگر تقدیر جیسے اس سے

روٹھی ہی رہی وہ بے بسی کا شکار ہوگئی اس کے اختیار میں کچھ نہ رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہ رہا تھا۔ حالات نے اُسے اپنے شکنجے میں پھانس لیا تھا۔ بدنصیبی نے اپنے [illegible] اس کے وجود کے اندر پیوست کر دیئے تھے۔ اور ایک شب جبکہ وہ دونوں بستر پر دم سادھے پڑے تھے کہ مبادا ایک دوسرے کو اس کرب کی خبر نہ ہو جائے جو ان کی روحوں میں دھنسا ہوا تھا۔ جاوید کی مدھم جذبات سے عاری آواز سنائی دی۔

"نائلہ جاگ رہی ہو کیا۔"

نائلہ نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔"

"جی"

جاوید بولے۔

"تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا ایک سانس اکھڑ سی گئی تھی۔ کیا ہونے والا ہے، جاوید کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ اس کا سر چکرانے لگا ہر شے تیزی سے گردش کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

جاوید نے ٹھہرے ہوئے انداز سے کہا۔

"میرے والدین نے تمہارا انتخاب کیا اور میں انکار نہ کر سکا نائلہ تم ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی اور میں زندگی سے مطمئن ہو گیا لیکن۔"

جاوید رک گئے، نائلہ کا دل اچھل کر حلق میں جا اٹکا۔ لیکن کیا؟ کیا ہمارا ناطہ ختم ہونے لگا۔"؟

جاوید قدرے جذباتی آواز میں بولے۔

"میں نے تمہیں تمہارے ماضی کی تمام تر تلخیوں، شیرینیوں سمیت اپنایا ہے نائلہ، ہمارے ہاتھ کی لکیروں نے اس منزل کا انتخاب کیا ہے۔"

نائلہ ورطہ حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دوبارہ اس کے کانوں میں جاوید کی مضمحل سی آواز گونجی۔

"میں نے بھی ایک لڑکی کو چاہا تھا۔ لیکن معاشرہ ہمارے درمیان سنگین دیوار بن کر حائل ہو گیا میں اسی لٹی ہوئی محبت کی تجدید چاہتا ہوں نائلہ تم سے اپنی شریک حیات سے... صورتیں فرق ہیں۔ نام مختلف ہیں تو کیا ہوا انسان ہونے کے ناطے تو ہم سب ایک ہیں۔"

نائلہ کو یک لخت یوں محسوس ہوا کہ جاوید نے اُسے عمیق ترین پستیوں سے نکال کر مینار کی چوٹی پر لا کھڑا کیا ہو۔ یا اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی کو اپنی مضبوط باہوں میں سمیٹ کر زندگی کی روشنیوں میں لے آئے ہوں۔

جاوید اُسے انسان کے روپ میں فرشتہ دکھائی دیئے نور کی ایک طویل لکیر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ ہاں جاوید ہاتھ کی لکیروں کو ہم بدل نہیں سکتے اب میں بھی تو تم سے ایسی ہی تجدید محبت کی خواہاں ہوں....

وہ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر جاوید کے بازوؤں میں جا سمٹی اور آنسوؤں کے چند قطرے بے اختیار اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر ان کی قمیض میں جذب ہو گئے۔ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی

جاوید نے فرط مسرت سے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا اور چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ ان کی زبان سے سرک گئے۔ "میری نائلہ۔ تم ہی تو میری زندگی ہو، میری منزل ہو...."

ان میں اپنی برتری کا احساس غیر معمولی طور پر پیدا ہو گیا تھا اس کا سبب وہ دولت، ثروت حسن و خوبصورتی کی دولت تھی جس سے خدا نے انہیں مالا مال کر دیا تھا اور شاید جس طرح ہر چیز کی زیادتی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اسی طرح ان کا یہ غرور تمکنت ان تمام چیزوں پر بڑے بھدے اور دبیز پردے ڈالے دے رہا تھا مگر وہ سارا کنبہ ان چیزوں سے بڑا بے نیاز تھا، پھر وہ کنبہ بڑا کتنا تھا، چار افراد ماں باپ اور دو بھائی بہن، ہاں امراء کی شان و شوکت کی نشانی مالکوں سے زیادہ نوکروں کی تعداد ضرور موجود تھی جن کی ہی وجہ سے اس محل نما عالیشان کوٹھی میں کبھی بھی تنہائی کا احساس نہ ہونے پاتا تھا۔

چاند

ملکہ معین

بیرسٹر شوکت کی ہستی بذات خود بڑی متین، پر وقار، اور بظاہر سنجیدہ تھی مگر ان کی سنجیدگی پر شگفتہ مزاجی کا رنگ بڑی خوبصورتی سے چڑھا ہوا تھا، زندگی کے بیس سال ایران میں گذارنے کی وجہ سے ایرانیوں کے حسن نے ہندوستانی خون میں شامل ہو کر بڑی کشش پیدا کر دی تھی لیکن بیگم شوکت ان ملکی اثرات سے بے نیاز تھیں، ان میں تو وہی پرانی لکھنؤ کی نازک اندام خاتون موجود تھی جو زمانے کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کے باوجود ابھی آنکھوں میں شرم و حیا کے گلابی ڈورے چھپائے قہقہہ لگانے کے بجائے صرف ہولے ہولے مسکراتی ہے جس کی دلچسپیوں کا انحصار کلبوں اور ڈانس پارٹیوں پر نہیں ہوتا بلکہ جس کی حقیقی خوشی اس کے شوہر اور بچوں کی پر خلوص مسکراہٹوں میں پوشیدہ ہوتی ہے زندگی کی الجھنوں اور بکھیڑوں سے بے نیاز بیگم شوکت کی دنیا ان کا اپنا چھوٹا سا تخت تھا جس پر بیٹھی ہوئی وہ سارے دن پرانے شعراء کے دیوان الٹتی رہتیں، یا پھر رضوان اور عمرانہ دو بچے تھے جنہیں دیکھ کر شعراء کے دیوان تو دیوان خود شاعر تک کو بھول جایا کرتیں۔

ہر شام جب بیرسٹر شوکت واپس آجاتے۔ وہ اپنے تخت سے بڑے بڑے پائنچوں والے غرارے کو سنبھالتی ہوئی باہر لان میں چائے کے لیے آجاتیں، یہ بھی اپنی خوشی سے نہیں، بلکہ میاں کی دلجوئی، اور بچوں کی خوشی کی خاطر۔ بیرسٹر شوکت ان کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر اخبار رکھ دیتے۔ اپنی کرسی ایک خاص انداز سے آگے سرکاتے۔ اُن کے ہونٹوں پر بڑی شرارت آمیز سی ہنسی مچلنے لگتی۔ اور بیگم شوکت اس ہنسی کے معنی سمجھ کر کچھ جھجکتی، کچھ شرماتی، برآمدے سے اتر کر لان میں آجاتیں۔ میز کے قریب آتے آتے ان کا چہرہ گلنار بن جاتا۔

"آخر آپ کی یہ عادت کب جائے گی پچیس برس تو گذر گئے۔" وہ شرم چھپانے کے لیے زبردستی خفا ہوتیں۔

بیرسٹر شوکت کہتے "کیا کروں۔ ہر بار تمہارے اس عجیب و غریب حلیہ کو دیکھ کر ضبط کرنے کے باوجود یہ کم بخت ہنسی نکل ہی جاتی ہے۔"

بیگم شوکت بولیں۔

"جی ہاں —— جیسے میں کوئی عجوبہ ہی تو ہوں۔ ویسے بھی آپ بھلا اس ذوق کے حامل کہاں ہو سکتے ہیں۔ کہاں لکھنؤ کی نزاکت اور کہاں ——"

"جی بجا فرمایا بیگم صاحبہ! لیکن اگر نزاکت کے معنی یہی پندرہ گز کا لمبا چوڑا پاجامہ ہے تو خدا بچائے، ہمیں ایسی نزاکت سے ہم تو بس اپنی اس دو گزی پتلون میں ہی بھلے ہیں۔"

"جی ہاں، دوسروں کی نقل، اپنا لباس پہنتے تو پھر بات تھی، اللہ بخشے ابا جان نے ساری زندگی ان انگریزوں کے لباس کو نہیں اپنایا۔ انہوں نے ہمیشہ وہی تنگ پاجامہ اور شیروانی پہنی یا گرمیوں میں باریک کرتہ پہنتے تھے۔"

عمرانہ بولی "یہ بات تو ٹھیک ہے ابو۔ یہ لباس لگتا بہت اچھا ہے۔"

"قسمت والوں پر ہی لگتا ہوگا اچھا۔ ورنہ تمہارے ابو نے تو زندگی میں صرف ایک بار پہنا، اور پھر پچاس بار اٹھا بیٹھی کی کان پکڑ کے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی۔"

بیگم شوکت ہنس پڑیں۔

بیرسٹر شوکت نے کہا "اب آپ کو ہنسی آرہی ہے۔"

عمرانہ نے پوچھا "کیا ہوا تھا، ممی؟"

بیگم شوکت نے کہا۔

"کچھ نہیں بیٹی، درزی کی غلطی سے وہ۔ ذرا زیادہ تنگ

ہو گیا تھا اور۔“

اور ہنسی کے مارے ان کو اچھو ہو گیا۔

”اور جناب بیرسٹر شوکت عید کی نماز پڑھ کر جب گھر لوٹے تو معلوم ہوا۔ قبلہ پاجامہ صاحب دونوں پنڈلیوں کو اپنے زبردست شکنجے سے آزاد کر چکے ہیں۔“

عمرانہ نے پوچھا ”تو وہ پھٹ گیا تھا۔“

بیرسٹر شوکت نے کہا ”ارے ہاں بیٹا۔ معاملہ صاف تھا بہر حال بیگم صاحبہ، اس تلخ تجربہ کے باوجود میں تو یہی کہوں گا کہ

آپکے اس بھول سے پھر بھی غنیمت ہے۔"
انہوں نے بیگم شوکت کو ہنستے دیکھ کر پھر حملہ کیا۔
عمرانہ نے کہا۔" لیکن ابو۔ آپ کو یہ بات تو ماننا ہی پڑے گی کہ ہماری ممی پر یہی بھول بڑا پیارا لگتا ہے، اگر وہ اس کو اتار کر ساری یا شلوار پہن لیں تو پھر وہ ممی کہاں رہیں گی۔"
بیرسٹر شوکت بڑی زور سے ہنس پڑے۔ بیگم شوکت دھیرے سے مسکرا دیں اور بات بدلنے کی خاطر انہوں نے بسکٹ کی پلیٹ جلدی سے بیرسٹر صاحب کے سامنے کر دی۔
"اچھا یہ کھائیے، میں نے آج خود اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں۔"
"وہ میں نے کہا تھا نا، کہ کھانا پکانے میں تو تمہیں تمغہ دینا ہی پڑے گا۔"
"تمغہ نہیں ابو! سرٹیفکیٹ کہیئے۔ لیکن ایک بات اور اس پر نام مت لکھیئے گا تاکہ وقت ضرورت میں بھی استعمال کر سکوں۔"
بیرسٹر صاحب نے ایک بار پھر وہی فلک شگاف نعرہ بلند کیا، لیکن بیگم شوکت کے ہونٹوں پر وہی ملائم سی شگفتہ مسکراہٹ پھیل گئی جیسے نسیم سحر کے جھونکے سے کوئی کلی دھیرے سے کھل جائے۔
بیگم شوکت نے کہا۔
"رضوان ابھی تک کھیل کر واپس نہیں آیا حالانکہ کہہ کر گیا تھا کہ آج چائے کے وقفے تک ضرور واپس آجائے گا۔"
عمرانہ نے کہا۔" ممی آپ جانتی ہیں انکی کوئی بات سچ نہیں ہوتی۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔ اگر اس وقت انہیں ڈھونڈا جائے تو بس دوستوں کے جمگھٹے میں گپیں مارتے ہوئے ملیں گے۔"
بیرسٹر شوکت نے کہا "بات تو ٹھیک کہی عمرانہ نے۔ یہ آپ کا بیٹا بچپن میں جتنا کم سخن اور بھولا تھا اب اتنا ہی تیز ہو گیا ہے۔"
بیگم شوکت نے جلدی سے کہا۔" تو ماشاءاللہ کہیئے نا۔ خدا اس کو نظر بد سے بچائے۔"
"ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ لیجیئے اب تو خوش ہیں۔ ارے ہاں یاد آیا کل میرے پاس سرفراز بھائی کا خط آیا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے، وہ لوگ اسی ہفتہ یہاں پہنچ رہے ہیں۔"
بیگم شوکت نے حیران ہو کر انکی طرف دیکھا جیسے ان کے منہ سے کوئی انہونی بات نکل گئی ہو۔

عمرانہ نے کہا۔" کون ابو! یہ سرفراز بھائی اپنے کون ہیں؟"
بیرسٹر شوکت نے کہا۔" کون ہیں۔ ارے لڑکی ہمارے یعنی تمہاری ممی صاحبہ کے بھائی ہیں اور تمہارے ہوتے ماموں صاحب۔ بس اب آجائیں تو دیکھ بھی لینا۔"
اور آخری جملہ پر انہوں نے بڑے مفکر خیز انداز سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔
عمرانہ نے پوچھا۔" ان کے بچے بھی ہیں کیا؟"
بیرسٹر شوکت نے کہا۔" ہاں۔ لیکن بس ایک پیاری سی بچی۔"
پھر بیگم کو مخاطب کر کے کہا۔
"کیوں بیگم یاد ہے نا سرفراز بھائی کی وہ بچی۔ اسے دیکھ کر تو مجھ جیسا کافر بھی خدا کے کمال پر ایمان لے آیا۔ حد ہے صاحب۔ بچو جیسے آدمی کی حوروں جیسی بچی۔"
بیگم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔
"اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ اللہ بخشے بھابی جان بھی تو ہزاروں میں ایک تھیں۔ ویسے سرفراز بھائی کا بھی صرف رنگ ہی تو کالا ہے، ورنہ ناک نقشے میں وہ بھی کسی سے کم نہیں۔"
بیرسٹر شوکت نے کہا۔" واہ کیا فرمایا ہے آپ نے بھی سچ پوچھیئے تو وہ مجھے شروع سے ہی ایک عجیب و غریب مخلوق نظر آئے۔ سوکھے ساکھے سیاہ فام، رات میں بچے دیکھ لیں تو سہم جائیں۔"
عمرانہ زور سے ہنس پڑی۔ بیرسٹر شوکت نے بھی بیٹی کا ساتھ دیا، مگر بیگم کا چہرہ نہایت سنجیدہ تھا۔ انہوں نے بڑی آہستگی اور مشکل سے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار لیا۔ ان کا سفید چہرہ اب بھی سرخ ہو رہا تھا، مگر یہ سرخی طلوع آفتاب کی سرخی نہیں تھی، بلکہ یہ شفق کی لالی تھی جس میں اداسی جھلک رہی ہو۔ پیالی رکھ کر انہوں نے ایک بڑی سرد آہ بھری۔ بیرسٹر شوکت متواتر ان ہی کے چہرے کو تک رہے تھے۔ انکے لبوں پر ہنسی مچل رہی تھی مگر کسی خیال کے تحت انہوں نے موضوع سخن بدل دیا اور عمرانہ کو مخاطب کر کے بولے۔
"ہاں تو بیٹی تم کل ہی اوپر والے دونوں کمرے خالی کروا دینا وہیں ان لوگوں کو ٹھہرا دیا جائے گا۔ ویسے ان کی لڑکی۔ خدا جانے کیا نام تھا اس کا" کچھ سوچ کر "کیوں بیگم، کیا نام تھا اس بچی کا؟"
بیگم شوکت نے کہا "بھابی نے تو اس کا نام فرزانہ رکھا

تھا۔ مگر سرفراز بھائی اسے چاند کہا کرتے تھے۔"

بیرسٹر شوکت نے کہا۔ "ہاں شاید اسی لیے کہ ان کی بچی کو خدا نے چاند ہی جیسا حسن دیا تھا۔"

بیگم نے کہا۔ "شاید ایسا ہو۔"

انہوں نے دھیرے سے جواب دیا اور کھڑی ہو گئیں، ان کے اٹھتے ہی عمرانہ اور شوکت بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا پھر ہم تو چلے۔ اب رات کھانے پر ملاقات ہوگی ہاں بیگم اگر مجھے دیر ہو جائے تو تم دونوں بچوں کے ساتھ کھانا کھا لینا۔"

"کیوں دیر کیوں ہوگی؟ آپ کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔ سون کے کھانے کا وقت تو خراب ہی ہو جاتا ہے۔ اگر رات کا کھانا بھی وقت سے بے وقت ہونے لگا تو صحت کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

بیرسٹر شوکت نے کہا۔ "میری صحت کا تم اتنا خیال مت رکھا کرو۔ میں تو پہلے ہی پہلوان سا ہوں۔ ویسے کھانے پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ خدا حافظ۔"

"ممی کون ہیں یہ سرفراز بھائی؟" کمرے میں پہنچتے ہی سب سے پہلے پہلا سوال عمرانہ نے یہی کیا۔

اس وقت سے اس کے ذہن پر سرفراز بھائی اور چاند، بس یہی دو نام چکر لگا رہے تھے۔ ایک کی بدصورتی اور دوسرے کی خوبصورتی کا تذکرہ سن کر فطری طور پر اس کی حساس طبیعت نے اس کو نہ جانے کیا کیا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر ابو کی مضحکہ خیز ہنسی پر ممی کی افسردہ سی خاموشی نے اس کے تجسس کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

"بولیے نا! آخر ہمارے کون ہیں وہ؟ ہم نے تو آج تک انہیں نہیں دیکھا۔"

بیگم شوکت کی خاموشی نے اسے پھر سوال کرنے پر اکسایا۔

"بیگم شوکت نے کہا۔ "اپنا کام کرو جا کر آ جائیں تو خود دیکھ لینا۔ ویسے وہ تمہارے ماموں ہیں اور چاند بہن ہے۔"

"یہ تو ابو نے بھی بتا دیا تھا مگر وہ ہمارے یہاں کبھی تو آئے نہیں۔"

"ہاں وہ ہمیشہ عزیزوں سے دور رہے۔ بلکہ ہندوستان سے بھی باہر رہے ہیں اب کئی سالوں بعد یہاں آ رہے ہیں۔"

"اچھا یہ چاند کتنی بڑی ہیں؟"

"تم سے چند مہینے چھوٹی ہوگی۔ اچھا اب جا کر آرام کرو مجھے بھی پڑھنا ہے۔"

اور عمرانہ نہ معلوم کیا کیا سوچتی ہوئی باہر نکل آئی۔

آج بیگم شوکت نے خلاف معمول بڑا سادا سا جوڑا پہنا تھا لیکن عمرانہ نے کسی کے حسن کا تذکرہ سن کر خود اپنے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ بنفشی ساڑھی باندھی تھی اور جوڑے میں سفید سفید بیلے کی کلیاں بھی اڑس لی تھیں۔ یہ بھی انسانی فطرت کا ایک زبردست تقاضہ ہے اور خاص کر ایک عورت کی فطری کمزوری ـــ کمزوری ہی کہنا ٹھیک ہوگا کیونکہ وہ سوچتی ہے۔ ان ظاہری ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ دوسرے کے دل میں اپنی برتری کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔

عموماً دیکھا بھی یہی گیا ہے۔ زنانہ محفلوں میں کام کی باتیں کم ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے زیورات، حسن اور لباس کے تذکرے زیادہ ہوتے ہیں۔

جہاز پانچ بجے شام پہنچ رہا تھا اور تیاریاں صبح ہی سے شروع ہو چکی تھیں۔ بیگم شوکت نے رضوان کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کھیل پر جانے سے روک دیا تھا۔ اسی لیے تین بج جانے کے بعد بھی وہ بنا کسی تیاری کے اپنے کمرے میں غمزدہ پڑے تھے۔

گھر میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ لوگ خوش و خرم ان دیکھے مہمانوں کے استقبال کے لیے بڑے بڑے انتظامات میں مصروف تھے اور ادھر یہ حال تھا کہ رضوان صاحب سر جھاڑ منہ پھاڑ اپنے عزیز ترین ریکیٹ کو بغل میں دابے، آنکھیں بند کیے مسہری پر چاروں خانے چت چپ چاپ پڑے تھے۔

عمرانہ نے کئی بار پُر امید نظروں سے کمرے میں جھانکا، لیکن ہر بار اس کو ایک ہی پوز میں پڑا ہوا دیکھ کر چلی گئی۔

"گھڑی دیکھی ہے آپ نے؟" اس نے قریب جا کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیوں کیا فرمایا آپ نے؟" اس نے بڑی بے نیازی سے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مگر فوراً ہی بعد آنکھیں پھاڑ دیں اور جیسے کسی نے کاٹ کھایا ہو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"باپ رے باپ۔ یہ آپ ہیں۔ یعنی مس عمرانہ شوکت خوب۔ تو گویا آپ کے بھی پر نکل آئے۔"

عمرانہ کو بے ساختہ ہنسی آ رہی تھی۔ مگر زبردستی غصہ کا

موڑ بناتے ہوئے بولی "آپکی بلا سے۔ میرے پر نکلیں یا پرنچے مگر آپ صاحب فوراً اٹھیں اور تیار ہو کر ایرپورٹ جائیں۔"

"آپ خواہ حکم دیں۔ خوشامد کریں یا میرے کمرے کے چکنے فرش پر ناک رگڑ ڈالیں۔ مگر یہ بندہ اپنی جگہ سے نہیں ہلنے کا۔ بقول ابو کے ایک چرچڑی مار قسم کے آدمی کے استقبال کے لیے میرا شاندار میچ غارت کر دیا گیا۔ میں تو کبھی نہیں جاؤں گا۔"

"رضوان بھائی!" عمرانہ چلا پڑی "آئندہ سے آپ سرفراز ماموں کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہ کریں۔ اگر کبھی ممی نے سن لیا تو کتنا دکھ ہوگا انہیں۔ وہ خواہ کچھ بھی ہوں، بہرحال انکے بھائی ہیں۔"

"بجا فرمایا۔ اور کوئی بہن بھائی کی برائی نہیں سن سکتی۔ مگر سقراطن صاحبہ! آپ جیسی بہن تو بھائی کو ڈانٹ بھی سکتی ہے وہ بھی ایسے نازک موقع پر جبکہ اس پر غموں کا ہمالیہ پہاڑ ٹوٹا ہوا ہو۔ وہ کمرے میں مقید کر دیا گیا ہو۔ اور میدان میں میچ ہو رہا ہو۔"

عمرانہ ہنس پڑی۔

"اچھا۔ اب تھوک دیجیے اس غصہ کو۔ اٹھ کر تیار ہو جایئے، ذرا سوچیے تو سہی کتنی بری بات ہے۔ کوئی پہلی بار ہمارے یہاں آ رہا ہو۔ اور ہم اس کے استقبال کو بھی نہ جائیں!"

"نہیں جناب۔ جائیں اور ضرور جائیں

مگر رضوان اللہ تو ہرگز نہیں جائیں گے۔"

"ممی کیا سوچیں گی؟"

"آپکی طرح ممی ایسی فضولیات نہیں سوچا کرتیں۔"

"اب ختم بھی کیجیے غمزے۔ اور اٹھ کر جلدی سے تیار ہو جایئے۔ دیکھیے نا ساڑھے چار ہو رہا ہے اور ابھی ابو کا پیغامبر آتا ہے بلانے کو۔"

اور سچ مچ اس وقت رشید کھانستا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"چھوٹے بابو۔ آپ کو بڑے سرکار بلاوت ہیں۔ کہیں رہے چھورن آؤ، ٹیم بہت ہو لی رہا ہے۔"

بہت تیرے کی .... اچھا بابا تم تو ہمکا معافی دہیں رہو چلو یہاں سے کہہ دینا آتے ہیں۔" وہ مجبوراً اٹھ کھڑا ہو گیا۔ عمرانہ منہ چڑا کر ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

ٹھیک چھ بجے بیرسٹر شوکت کی نیلی کار گیٹ میں داخل ہوئی۔ عمرانہ وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر ستون سے ٹیک لگائے مجسم انتظار بنی کھڑی تھی اور بیگم شوکت اسکے نزدیک کرسی پر بیٹھی اپنے پسندیدہ شاعر کو پڑھ رہی تھیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بظاہر پڑھ رہی تھیں تو زیادہ موزوں ہوگا کیونکہ ہلکی سی ہلکی آہٹ پر بھی وہ چونک کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگتیں۔

کار برآمدے کے سامنے پرساتی میں آ کر رک گئی۔ سب سے پہلے بیرسٹر شوکت باہر نکلے۔ انکے ہاتھ میں دبلے پتلے نازک اندام سرفراز بھائی کا ہاتھ تھا۔

بیگم شوکت دوڑ کر بھائی سے لپٹ گئیں۔

"ارے شمو۔ تو تو ابھی تک ویسی ہی پگلی سی ہے۔ بھئی اب تو میں آ گیا نا .... اب رونے سے کیا فائدہ۔ ایں .... بس بس .... اب چپ ہو جاؤ .... توبہ۔ توبہ۔ کوئی ماشاءاللہ اتنے بڑے بچوں کے سامنے روتا ہے۔ اب دیکھنا یہ تمہارے ہی صاحبزادے رضوان اللہ کیا مذاق بناتے ہیں۔ اور ہاں یہ صاحبزادی .... کیا نام بتایا تھا .... شوکت نے ہاں عمرانہ .... دیکھا بیٹی .... اپنی ماں کو بالکل بچوں کی طرح بھسر بھسر روئے جا رہی ہیں .... چھی چھی۔"

سب ہنس رہے تھے، خود سرفراز بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن عمرانہ دیکھ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں بھی کوئی چیز چمک رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے، گول گول، چمکدار موتی۔

وہ سوچنے لگی۔

یہ ابو بھی بس ایسے ہی ہیں .... اور رضوان بھائی تو بالکل اودبلاؤ ہی ہیں .... بھلا یہ سرفراز ماموں۔ اب ایسے بھی برے نہیں صرف رنگ ہی تو کالا ہے اور کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر موٹے نہیں .... دنیا میں کوئی ہر آدمی ہی تو موٹا نہیں ہو جاتا۔

"آؤ بیٹی عمرانہ اپنی بہن چاند سے تو ملو آ کر۔"

بیرسٹر شوکت کی آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

عمرانہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا .... سب سے الگ ستون کے قریب سفید ساری میں وہ سچ مچ بڑی معصوم لگ رہی تھی حسن میں ایک انجانی کشش کے ساتھ ساتھ بڑا تقدس جھلک رہا تھا۔ کاجل اور سرمے سے بے نیاز آنکھیں

حیران حیران سی سارے لوگوں پر اس طرح پڑ رہی تھیں ۔ گویا ایک ہی نظر میں سب کو اپنا لینا چاہتی ہوں۔
رضوان نے عمرانہ کے قریب سے گذرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"جانو نا۔ قیامت آگئی ہے، چاند زمین پر اتر آیا"
عمرانہ کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی۔ مگر ضبط کر گئی۔
بیگم شوکت نے چاند کو گلے لگا کر بے شمار پیار کر ڈالے۔
بیرسٹر شوکت نے سینے سے لگا کر بڑی شفقت سے سر پہ ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں۔ اور جب عمرانہ کی باری آئی تو دونوں ہی شرمائی شرمائی مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ایک دوسرے کو دیکھا ۔ اور ایکدم لپٹ گئیں۔ سب ہنس پڑے جس میں بیرسٹر شوکت کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ اور بیگم شوکت صرف مسکرا دیں۔
بڑی دیر بعد بیگم شوکت کو خیال آیا۔
"ارے عمرانہ ۔ رضوان کہاں گیا؟"
"وہ شاید اپنے کمرے میں ہونگے"
اس نے جلدی سے جواب دیا۔ اور پھر وہ دونوں باتوں میں مشغول ہو گئیں۔
"شمو۔ تیرے دونوں بچے بڑے پیارے ہیں۔ خدا انکی عمر میں ترقی دے" باتیں کرتے کرتے سرفراز بھائی نے عمرانہ کو تجسس آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
بیگم شوکت کا چہرہ لال پڑ گیا —— یہ بھی ان کی ایک بڑی کمزوری تھی۔ غم غصہ اور خوشی، تینوں کے اظہار کے لئے ذرا نازک سا امتیاز انکے چہرے پر ظاہر ہوتا۔ اور اکثر اوقات یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ چہرے پر پھیلی ہوئی یہ شفق مسرت کی ہے یا دکھ کی۔
"اوں ہونہہ —— یہ غلط ہے سرفراز بھائی۔ آپکا ایک ... ہمارے دونوں پر بھاری ہے" بیرسٹر شوکت چاند کو ... دیکھتے ہوئے بولے۔
"کیوں بیٹا —— ٹھیک ہے نا؟"
اُن کے اس بیساختہ سوال پر چاند نے شرما کر گردن جھکا لی۔ عمرانہ نے دیکھا بیرسٹر صاحب کی نظریں چاند پر سے ہٹ کر سرفراز ماموں کے چہرے پر رک گئیں۔ ہونٹوں پر ... یہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ایک بات ہے سرفراز بھائی۔ آپ ہیں بڑے خوش قسمت" ... سب عادت کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بیگم شوکت بیچ میں بول پڑیں۔
"عمرانہ بیٹی۔ ذرا جا کر دیکھو تو بالو نے چائے لگوا دی یا نہیں، ورنہ پھر تمہارے ابو کو جانے میں دیر ہو جائے گی"

چائے پر ایک طرف بیگم شوکت، بیرسٹر شوکت اور سرفراز بھائی باتیں کر رہے تھے، دوسری طرف عمرانہ اور چاند محو گفتگو تھیں لیکن رضوان سب سے الگ تھلگ بڑی خاموشی ۔ بلکہ بے دلی سے بس چائے پیئے جا رہا تھا۔ عمرانہ نے ایک دو بار کنکھیوں سے اسے دیکھا اور آخر مسکراتے ہوئے سموسوں کی پلیٹ آگے بڑھا دی۔
"قبلہ اس سے بھی شوق فرمایئے"
چاند نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور شاید بیرسٹر صاحب نے بھی دیکھ لیا تھا بولے۔
"ہاں بھئی! کیا بات ہے رضوان خلاف معمول آج چائے پر بڑے خاموش خاموش بیٹھے ہو"
عمرانہ نے سنجیدگی سے کہا "ابو اب یہ بیچارے کیا بولیں دراصل آج دوپہر ممی نے ذرا سی ٹھکائی کر دی تھی"
"ٹھکائی" سرفراز بھائی اور بیرسٹر شوکت دونوں زور سے ہنس پڑے۔
بیگم شوکت ہنستے ہوئے بولیں۔
"یہ تو دیوانی ہے۔ خواہ مخواہ بیچارے کا مذاق بنا رہی ہے۔ آج سرفراز بھائی کو لینے جانا تھا اس لئے کھیلنے نہ جا سکا۔ شاید اسی لئے خاموش ہیں"
سرفراز بھائی نے کہا "اچھا تو کیا یہ باقاعدہ کھیلنے جاتے ہیں۔ پھر تو واقعی ظلم ہوا۔ اس وقت میچ کے خیال میں ہوگا"
عمرانہ کے ساتھ چاند کو بھی بے ساختہ ہنسی آگئی۔ رضوان نے دونوں کو گھور کر دیکھا۔
"جی نہیں سرفراز ماموں" عمرانہ اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولی۔
"ابھی ہیں نے دیکھا لبکٹ لئے۔ اس لڈو کو گیند بنائے ہٹ لگا رہے تھے"
رضوان کو بھی زبردستی سب کے ساتھ ہنسنا پڑا ۔ حالانکہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ موقع ملے تو اسی وقت عمرانہ کی درگت بنا دی جائے۔ مگر فسٹ امپریشن کا خیال کر کے صرف

مسکرا دیا۔

"بڑی شریر ہے یہ عمرانہ، کیوں رضوان میاں یہی بات ہے نا" سرفراز بھائی نے بڑے پیار سے اس کو تھپتھپایا۔

بیرسٹر شوکت نے کہا: "جی نہیں بھائی صاحب یہ حضرت بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اس وقت تو بیچارے نہ معلوم کس الٹ پھیر میں ہیں!"

عمرانہ نے کہا: "صرف رعب ڈال رہے ہیں!"

"اور آپ کو معلوم ہے سرفراز بھائی اولاد کس کی ہے بیرسٹر شوکت کی!"

بیگم شوکت نے آہستہ سے جملہ کسا۔

"خوب" سرفراز بھائی اور بیرسٹر شوکت نے بڑا زوردار قہقہہ بلند کیا۔ عمرانہ اور چاند بھی ہنس پڑیں۔

"یہ تمہارا ڈاکٹری کا آخری سال ہے؟"

سرفراز بھائی نے رضوان سے براہ راست سوال کیا۔

"جی نہیں۔ آئندہ سال آخری سال ہوگا!"

"اور عمرانہ کس ایئر میں ہیں؟"

"یہ تو بی اے میں چار سال سے فیل ہو رہی ہیں!"

رضوان نے بدلہ لیا۔

"بڑے آئے وہاں سے خود ہی فیل ہوئے ہونگے سرفراز ماموں یہ تو میرا آخری سال ہے!"

"چاند نے بی۔ اے کر لیا یا ابھی پڑھ رہی ہیں!" بیگم شوکت نے پوچھا۔

"یہ غریب اس سال بی۔ اے کر لیتی مگر میری وجہ سے ایک سال کا نقصان ہو گیا۔"

رضوان نے پہلی بار نظریں اٹھا کر بڑے غور سے چاند کی طرف دیکھا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سال ختم ہو رہا ہے تو کیا ہوا۔ پچھواڑے والے پرائمری میں تو داخلہ مل ہی جائے گا!"

سب ہنس پڑے۔ چاند شرما کر جھک گئی۔

بیگم شوکت کے دل میں بھتیجی کی محبت نے جوش مارا۔ بیٹھے ہی بیٹھے گلے سے لگا کر بولیں۔

"وہ کوئی کند ذہن ہے جو ابھی تک پرائمری اسکول میں پڑی ہوگی۔ بلکہ تم سے تو پڑھائی میں تیز ہی ہوگی!"

بیرسٹر شوکت گھڑی دیکھ کر ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے

"میں تو اب چلا۔ اچھا سرفراز بھائی رات کو باتیں کریں گے۔ خدا حافظ!"

بیگم شوکت اور سرفراز بھائی بھی کھڑے ہو گئے۔

بیگم شوکت نے کہا: "آیئے ہم لوگ بھی اندر چل کر بیٹھیں۔ سردی بڑھ رہی ہے۔ عمرانہ اور رضوان تم لوگ بھی چاند کو لے کر مشرقی برآمدے میں چلے جاؤ۔ وہاں اس وقت زیادہ سردی بھی محسوس نہیں ہوتی — یا کمرے میں بیٹھنا چاہو تو عبدل سے کہہ کر آتشدان گرم کروا لینا!"

انہوں نے جھک کر غرارہ درست کیا۔ بالو نے پیچھے سے ان کی گرم شال کندھوں پر ڈال دی۔

"شمو تو چند سال میں بالکل امی جان بن جائے گی۔ وہی شکل وہی آواز، وہی چال!"

سرفراز بھائی نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

بیگم شوکت ہلکے سے مسکرا دیں۔ وہی نفیس اور باوقار سی مسکراہٹ جو انکا خاصہ تھی۔

"بالو پردے گرا کر روشنی کر دو — اور ہاں دیکھو رمضانی سے کہنا رات کے کھانے پر ایک کے بجائے دو میٹھی چیزیں ہوں۔ سرفراز بھائی کو میٹھا بہت پسند ہے' ارے ٹھہرو تو ہاں عبدل سے کہہ دینا آج سے تمہاری ڈیوٹی اوپر کے کمروں پر ہے اور چاند بٹیا کو کبھی بھی شکایت نہ ہو!"

کمرے میں آتے ہی بیگم شوکت نے اپنی مخصوص خادمہ بالو کے ذریعہ احکامات جاری کرنے شروع کر دیے۔ سرفراز بھائی دور کھڑے مسکراتے رہے۔ اور بالو کے جاتے ہی بولے۔

"اب یہ عادت چھوڑ دے شمو مجھے ڈر لگتا ہے کہیں مجھے بھی ایک آدھ حکم نہ دے بیٹھے!"

"جی ہاں نہ جیسے ہمیشہ حکم ہی تو دیتی تھی۔ یوں بھی تو ماشااللہ آپ انجینئر سرفراز احمد ہیں۔ سچ کہیے یہ انجینئرنگ آپ نے کب پڑھی کاش ابا جان کی زندگی میں پڑھ لیتے!"

"ارے بٹیا جی! (وہ پیار سے بیگم شوکت کو بٹیا جی کہہ کر بلاتے تھے) یہاں انجینئرنگ وجینئرنگ پڑھنے کا خیال ہی کس کو تھا، وہ تو وہی مثل ہوئی۔ آگ لینے گئے اور پیغمبری مل گئی۔ نوکری ڈھونڈنے گئے تھے، اور پڑھنا پڑی انجینئرنگ اب میں سوچتا ہوں بزرگوں کی کہی ہوئی باتیں کبھی نہ کبھی پوری ہو کر رہتی ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا ابا جان مجھے دیکھ کر ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔ دیکھنا میرا بیٹا انجینئر بنے گا لیکن بی ایس سی کے

بعد جب میں نے تعلیم چھوڑ دی تھی تو ان کو کتنی مایوسی ہوئی تھی۔ مگر کسے خبر تھی کہ ان کا بیٹا بڑھاپے میں انجینئرنگ پڑھے گا۔"

بیگم شوکت نے کہا "واہ کون کہتا ہے آپ بوڑھے ہو گئے پریشانیوں سے اگر بال سفید ہو جائیں تو اسے بڑھاپا نہیں کہتے۔ خدا آپ کو اس سے دوگنی عمر دے۔ چاند کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔"

سرفراز احمد نے ہنستے ہوئے کہا "اور کیا۔ اگر بال سفید ہو گئے، دانت ہلنے لگے آنکھوں سے کم سجھائی دیتا ہے تو اس سے بڑھاپا کہاں آ جاتا ہے ویسے بقول تمہارے اگر واقعی بوڑھا نہیں ہوا ہوں تو اس سے بڑھ کر کیا بات ہے۔ پھر بھی چاند بولے کہ یہاں آنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ میرے بعد کسی در کو اپنا سمجھے تاکہ آئندہ زندگی میں اسے مزید ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔"

"آپ کو یہ خیال بڑی دیر میں آیا۔ حالانکہ چاند مجھ کو اُس وقت بھی اتنی ہی عزیز تھی جتنی کہ اب ہے۔ میں تو اسی وقت آپ سے اس کو لے لیتی لیکن صرف اس خیال سے خاموش رہ گئی تھی کہ آپ کا غم تازہ ہے لہٰذا بہتر ہے کہ بھائی کی نشانی آپ ہی کے پاس رہے حالانکہ جانے کے بعد آپ نے اوروں کی طرح مجھے بھی سمجھ کر سارا رشتہ ہی ختم کر دیا تھا اب نہ جانے کیسے ہمارا خیال آ گیا۔"

سرفراز احمد نے کہا "خیر جی صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہارے پاس زیادہ عرصہ رکھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ اپنے اخراجات کا بار کسی کے سر پر ڈالنا میری طبیعت کے خلاف ہے، اور نوکری کرنا میرے بس کی بات نہیں ——— اپنے ضمیر کو مار کر، خودداری کو فروخت کر کے پندرہ سال صرف چاند کے مستقبل کے لئے نوکری کی، اور اب آخری زندگی میں صرف اپنی راحت و آرام کے لئے اپنے ذہنی و قلبی سکون کو غارت نہیں کر سکتا۔ اگلے سال چاند بی۔ اے کر لے گی۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے زندگی اور اس دنیا میں وہی انسان کامیابی حاصل کرتے ہیں جو اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا سیکھ لیتے ہیں جن میں خود اعتمادی کا جذبہ ہوتا ہے اور جو وقت کے پیدا کردہ جھوٹے سہاروں پر اکتفا نہیں کر لیتے۔"

اسی لئے بی۔ اے کے بعد میں اس کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا اس کے بعد وہ اپنی کفالت آپ کرے گی، رہا شادی کا سوال تو اس معاملہ میں بھی وہ آزاد ہے۔ اپنا شریک زندگی وہ خود منتخب کر لے گی یہ اس کی قابلیت اور انتخاب پر منحصر ہے کہ وہ اچھا ہو گا یا برا ——— ویسے مجھے اپنی تربیت پر اعتماد ہے کہ اس معاملہ میں وہ بھٹک نہیں سکتی۔ جہیز کے لئے میرے پاس کچھ نہیں ہے سوائے ایک بیٹی کے، اور اس تعلیم کے جو اسے دلا دی ہے۔"

کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ سرفراز احمد دونوں ہاتھ پیچھے کئے دھیرے دھیرے ٹہل رہے تھے، انکا سر جھکا ہوا تھا۔ اور چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا۔

بیگم شوکت اپنے تخت پر بیٹھی چپ چاپ بس بھائی کی شکل تکے جا رہی تھیں، ان کا ذہن انسان کے ظاہر و باطن کی سمجھنے کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ جس بھائی کو دنیا بدصورت کہتی ہے وہی اس وقت اُنکی نظروں میں دنیا کا خوبصورت ترین انسان تھا۔

ماتھے پر بکھرے ہوئے پریشان پریشان سفید بال ———
کھوئی کھوئی سی آنکھیں اور دُبلا پتلا سا نازک جسم۔
"کون کہتا ہے میرا بھائی بدصورت ہے!"
اور وفورِ جذبات سے انکی آنکھیں بھیگ گئیں۔

جسٹس زاہد حسین شہر کی مقتدر ہستیوں میں سے تھے ان کا شمار انہیں لوگوں میں تھا جنہیں خدا شہرت بھی دیتا ہے اور عزت بھی۔ جنہیں نہ صرف دولت ملتی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی حقیقی مسرتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں حالانکہ یہ عام حقیقت ہے بلکہ بہت سے لوگوں کا تجربہ اور مشاہدہ بھی کہ دولت دلی سکون چھین کر انسان کو ذہنی خلفشار میں مبتلا کر دیتی ہے، لیکن خوش قسمتی سے زاہد حسین ان دونوں لعنتوں سے آزاد ہے ——— انہیں دولت کے ساتھ ساتھ حقیقی مسرتیں اور دلی سکون سبھی کچھ حاصل تھا۔ ان کا اپنا پُربہار بنگلہ تھا۔ خوبصورت اور خوش اخلاق بیوی تھی، اور ایک لاڈلی بیٹی تھی۔ اور اس طرح اس مختصر سے خاندان میں مسرتوں کے خزانے بھر گئے تھے۔

بیگم زاہد حسین جوانی کی حدود کو پار کر چکی تھیں۔ لیکن حسن وقار اور تمکنت کے نشانات اب بھی انکے بشرے سے عیاں تھے، اور بیٹی کے چہرے پر ماں کا وقار غرور کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

گھر میں، گھر کے باہر، اسکول اور کالج ہر جگہ، ہر موقع پر زندگی اسی مرکز پر قائم رہتی ——— یعنی اپنی برتری کا

احساس اور اپنے سے کمتر سے احتراز، شاید اسی لیے کالج کے ہزاروں طلبا میں اس کے ساتھی صرف دو تین ہی تھے اس لیے اگر کبھی کبھار ان گنتی کے دو تین ساتھیوں میں سے کوئی غیر حاضر ہو جاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے زندگی میں خلا سا ہو کر رہ گیا ہو، کچھ کھو سا گیا ہو۔

دو دن کی تنہائی کے بعد آج بھی وہ اسی طرح چپ چاپ کتابیں سنبھالے جلدی جلدی کلاس روم کی طرف جا رہی تھی کہ خلاف توقع گیلری کے دروازے پر اسے کھڑا ہوا دیکھ کر پژمردہ چہرہ کھل اٹھا۔

"ہلو رضوان۔ کہو دو دن سے کہاں مر گئے تھے؟"

رضوان نے پلٹ کر دیکھا۔

"اوہ آپ ہیں ــــــ مگر دیکھیے محترمہ رعنا زاہد حسین صاحبہ آئندہ سے خاکسار کے نام کے ساتھ مرنے جینے کا لفظ استعمال نہ کیجیے گا...... اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔"

"ہو گے میری بلا سے۔ پہلے جواب دو غائب کہاں تھے؟"

"دیکھیے آپ جج کی بیٹی ضرور ہیں، لیکن وکیل نہیں، اور نہ ہیں مجرم جو جرح کی جائے۔"

"آپ بھی ہمیں کبھی بھی انسان بن کر بات نہیں کی جاتی۔"

رضوان ہنس پڑا۔

"ہنسا مت کرو۔ تمہیں معلوم ہے اگر تم لوگوں میں سے کوئی بھی کسی روز نہیں آتا تو میں تنہا رہ جاتی ہوں۔"

"خوب تو آپ صاحبہ نے ہم لوگوں کو سمجھ کیا رکھا ہے۔"

"احمق مت بنو۔ بتاؤ کل کیوں نہیں آئے تھے، عمرانہ تو ٹھیک ہے نا۔"

"اونہہ کوئی ضروری ہے کہ ہر بات آپ کو ضرور بتائی جائے۔ شاہی لوگ ہیں، دل نہیں چاہا نہیں آئے۔ کسی کی نوکری ہے۔"

"لیکن میں تو پوچھ رہی ہوں تو آپ کو جواب تو دینا چاہیے۔"

"نہیں دیتے جواب بس۔"

اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

رضوان کو پھر ہنسی آ گئی۔

"ہونا جج کی بیٹی۔ بس وہی جی حضور کی عادت ہاں میں ہاں نہیں ملائی تو اینٹھ گئیں۔"

"رضوان۔" رعنا چلا پڑی۔

"تم مجھے ہر وقت جج کی بیٹی ہونے کا طعنہ کیوں دیتے ہو۔"

"تو قسم کھاؤ کہ جج کی بیٹی نہیں ہو۔"

"ہوں، پھر تمہاری بلا سے۔ تم بھی تو بیرسٹر کے لڑکے ہو۔"

"اچھا بابا میں تو یہ چلا۔ خطائیں معاف۔ کلاس شروع ہونے والی ہے۔"

اور رضوان جلدی سے بھاگ نکلا۔

رعنا دور تک اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر خود بھی بڑبڑاتا ہوئی کلاس میں داخل ہو گئی۔

"گدھا کہیں کا، جاہل۔"

اسی شام جب وہ کھیل کر لوٹا تو گیٹ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے رعنا پر نظر پڑی ــــ وہ سامنے ہی لان میں سب لوگوں کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

"باپ رے باپ۔"

وہ جلدی سے پلٹ پڑا۔

لیکن ان سب نے اسے دیکھ لیا تھا، تب ہی سرفراز بھائی نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

"ارے میاں کہاں بھاگے جا رہے ہو پھر۔"

اور اسے مجبوراً واپس آنا پڑا۔

"واپس کہاں جا رہے تھے۔" بیرسٹر شوکت نے پوچھا۔

"جی کچھ نہیں، بس یاد آیا کہ مفلر تو میدان میں ہی بھول آیا ہوں۔"

"لیکن مفلر تو آپ کے گلے میں پڑا ہے۔" عمرانہ نے کہا۔

"اوہ۔" سب لوگ ہنس پڑے۔

"آؤ۔ ادھر میرے قریب آ جاؤ۔"

سرفراز ماموں نے بھانجے کی پریشانی محسوس کر کے اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

بیگم شوکت نے کہا۔ "رضوان تم دو دن سے جج صاحب کے یہاں نہیں گئے تھے۔"

رضوان نے کہا۔ "جی ہاں ممی۔ بس فرصت ہی نہیں ملی۔"

بیرسٹر شوکت نے کہا۔ "تو بس پھر اب سزا کے طور پر رات کا کھانا آپ کو انہیں کے ساتھ کھانا پڑے گا۔"

رضوان نے کہا۔ "مجھے!"

"رعنا نے کہا۔ "جی ہاں، آپ کو۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ عمرانہ بھی ساتھ جائے گی۔"

رضوان نے کہا "نہیں نہیں صاحب بلکہ یہ تو انتہائی مسرت کی بات ہے۔ لیکن!"

اس نے چپکے سے چاند کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی!

عمرانہ نے کہا "میں نے رعنا بہن سے کہہ دیا ہے۔ آپ چلے جائیے میں نہیں جاؤں گی!"

"نہیں بیٹی۔ یہ بری بات ہے!" سرفراز ماموں نے دخل دیا۔

"جج صاحب نے تم دونوں کو بلایا ہے اور دونوں کو چاہیے تم چاند کے لیے مت رکو، اُسے تنہا رہنے کی خاصی عادت ہے!"

"ہاں آپ چلی جائیں۔ میں پھوپھی اماں کے پاس رہوں گی!" چاند نے پہلی بار زبان کھولی۔

رضوان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اور پھر نہایت آہستگی سے بولا "ہوں ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔"

"ارے بھئی، اس کی بھی تو سنو، یہ غریب کیا کہہ رہا ہے!" سرفراز ماموں نے اس کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ کر کہا۔

"میں!" رضوان نے آنکھیں پھاڑ دیں۔

"نہ نہ، سرفراز ماموں، میں تو یونہی ایک تھیوری رٹنے لگا تھا!"

رعنا نے کہا "لیکن اگرچہ یہ چاند صاحبہ بھی چلی چلیں تو کچھ ہرج ہے!"

بیگم شوکت بولیں "نہیں بیٹی، ہرج درج تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن — شاید وہ خود ہی نہیں جائے!"

بیرسٹر صاحب نے کہا "نہیں نہیں۔ واہ یہ ضرور جائے گی۔ کیوں چاند بیٹا ٹھیک ہے نا۔ جج صاحب کے یہاں ضرور جاؤ۔ بڑے اچھے آدمی ہیں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے!"

سرفراز احمد نے کہا "عمرانہ بھی تو ساتھ جا رہی ہے چلی جاؤ اچھا ہے۔ اب تو تمہیں یہیں پر رہنا ہی ہے۔ سب سے مل جل کر رہو گی تو تمہارا ہی اس میں فائدہ ہے!"

"اچھا تو پھر آپ لوگ جلدی سے تیار ہو جائیں!" رعنا نے بات بدل دی۔

عمرانہ نے کہا "اب اور کیا تیاری ہو گی۔ یہی ٹھیک ہے کیا کچھ اور لوگ بھی آ رہے ہیں!"

"رعنا نے کہا "نہیں کوئی بھی نہیں۔ مگر یہ رضوان صاحب کیا اسی حلیہ میں چلیں گے؟"

"کیوں صاحب، مابدولت کا حلیہ کون سا بُرا ہے۔ آپ لوگوں کی طرح اب کمخواب کا سوٹ تو نکالنے سے رہا!"

سب ہنس پڑے۔

رعنا بدستور سنجیدہ تھی۔

"بہرحال کھیلنے کے لباس میں ڈنر نہیں کھایا جا سکتا!"

"اوہ تو آپ کا مطلب ہے کہ میں ابھی جا کر ڈنر سوٹ زیب تن کر لوں نہ صاحب، یہ مجھ سے نہ ہو گا!"

رعنا نے کہا "تم روز بروز تہذیب سے بیگانہ کیوں ہوئے جا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ ان صاحبہ سے ذرا دور کی رشتہ داری تھی، اور میں ایسے رشتوں کا"

بیگم شوکت نے کہا "جاؤ رضوان۔ لباس تبدیل کر آؤ، ان کپڑوں میں تم نہیں جا سکتے!"

رضوان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

بیرسٹر شوکت بولے "ہاں بُرا لگتا ہے۔ انسان کو ہمیشہ ان آداب کا خیال رکھنا چاہیئے!"

"جی ہاں ٹھیک ہے!"

اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اپنے بہترین نئے سلے ہوئے ڈنر سوٹ میں رضوان سب سے پہلے جج صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ رعنا، عمرانہ اور چاند پیچھے تھیں۔

اطلاع ملتے ہی بیگم زاہد حسین نے سب سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ بالوں کو درست کیا۔ لپ اسٹک اور گہری کی گئی۔ اور سفید رنگت کے باوجود پاؤڈر کی ایک دو تہیں اور جما دی گئیں۔ کندھوں پر اپنی پسندیدہ ایرانی شال ڈال کر وہ باہر آ گئیں۔

"ممی دیکھیے، آخر میں ان لوگوں کو لے آئی!" رعنا انہیں دیکھ کر چہکی۔

اور انہوں نے مسکراتے ہوئے قریب آ کر حسب معمول عمرانہ اور رضوان کو گلے لگا کر بہت سے پیار کر ڈالے۔ لیکن ان کے پیچھے سمٹی سمٹائی چاند کو دیکھ کر چونک پڑیں۔

"خالہ بیگم یہ چاند سرفراز احمد ہیں۔ میرے ماموں کی لڑکی۔"
"اچھا ۔۔ اچھا۔"
اور انہوں نے آگے بڑھ کر چاند کو بھی گلے سے لگا لیا۔
"لیکن بیٹی عمرانہ ۔ اس سے پہلے تو کبھی ۔۔۔۔"
"جی ہاں۔"
عمرانہ کچھ سمجھ کر بیچ میں بول پڑی۔
"سرفراز ماموں ہمیشہ ملک سے دور رہے ہیں، جب یہ بہت چھوٹی سی تھیں، تب سے وہ یہاں سے چلے گئے تھے اور اب پندرہ سال بعد آئے ہیں۔"
بیگم زاہد نے کہا۔ "ماشاءاللہ بڑی پیاری بچی ہے۔"
رعنا نے کہا "لیکن امی، ان کے ابا کو دیکھئے تو۔"
عمرانہ نے گھبرا کر بات کاٹ دی۔
"جج صاحب کیا ابھی تک نہیں آئے۔"
"ارے بھئی، میں تو کب سے آیا ہوا۔ تم سب کا انتظار کر رہا ہوں۔"
ڈرائینگ روم کا پردہ سرکا کر جج صاحب نکل آئے۔
"کہاں ہے یہ رضوان۔"
"حاضر ہوں۔ جج صاحب۔ کوئی فیصلہ۔"
"نالائق کہیں کا۔"
انہوں نے آگے بڑھ کر اپنا موٹا تازہ ہاتھ اس کی پیٹھ پر رسید کیا۔
"دو دن سے کہاں سے غائب تھے حضرت ۔۔ کیا بھول گئے کہ کالج کی حاضریوں کی طرح جج صاحب کے یہاں کی حاضریاں بھی شمار ہوتی ہیں۔"
"جی ہاں، غلطی ہوئی، عرضی بھیجنا بھول گیا تھا۔"
سب ہنس پڑے۔
"تو میاں صاحبزادے اب سزا کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔"
"چلئے اب معاف کر دیجئے۔ پہلی غلطی ہے غریب کی۔"
آؤ بچو۔ اب اندر آ کر بیٹھیں۔"
بیگم زاہد پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گئیں۔ جج صاحب صوفے پر تقریباً لیٹ سے گئے۔ رضوان کو انکے نزدیک ہی زبردستی بیٹھنا پڑا۔ اور سامنے بیگم زاہد کے ساتھ رعنا، عمرانہ اور چاند بیٹھ گئیں۔
"بیگم زاہد نے کہا "عمرانہ بیٹی تم اپنی امی کو بھی لیتی آتیں۔ ان سے ملے ہوئے بھی کتنے روز ہو گئے۔"

جج صاحب نے کہا۔ "اور ہاں۔ وہ مسٹر سرفراز شوکت کیوں نہیں آئے۔ بھئی عجیب لوگ ہیں جب تک باقاعدہ بلاؤ نہیں آتے ہی نہیں حالانکہ میں ۔ آں ۔ یہ کون ۔۔ یہ کون ہے۔"
چاند پر نظر پڑتے ہی وہ اس طرح چونک کر اٹھ بیٹھے جانو کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔"
عمرانہ اور رعنا انکی گھبراہٹ پر بری طرح ہنس پڑیں۔ اور رضوان نے تو اپنے بے ساختہ نکل پڑنے والے دانتوں کو چھپانے کے لیے رسالہ بالکل منہ سے لگا لیا تھا۔ بیگم زاہد بھی ہنس رہی تھیں۔
"آپ تو اس طرح چونکے کہ میں تو ڈر ہی گئی۔ اے بھلا یہ کونسی ایسی بات تھی۔"
"یہ عمرانہ کے ماموں کی لڑکی ہے۔"
جج صاحب نے آگے کو جھک کر چشمہ درست کیا۔ اور پھر بڑے غور سے دیکھ کر بولے۔
"اچھی لڑکی ہے۔"
رضوان کی ہنسی قابو سے باہر ہو گئی۔ سب ہی بے تحاشہ ہنس رہے تھے ۔۔ اور چاند اپنے چہرے پر تمام جہانوں کی شفق بکھیرے سمٹی جا رہی تھی۔
"کیا نام ہے بیٹی تمہارا۔" جج صاحب نے بڑی دیر سے سوال کیا۔
"چاند سرفراز۔"
"چاند ۔!!" جج صاحب پر دوسرا حملہ ہوا۔
"جی ہاں، جج صاحب چاند ۔ یعنی مون ۔۔۔"
رضوان نے بمشکل ہنسی روک کر تشریح کی۔
"توبہ۔ کیا کیا نام ہیں، دنیا میں، آگے کو کوئی سورج رکھ لے گا۔"
"میرا خیال ہے کہ دوبارہ عقیقہ کروا کر اپنا نام سورج رکھ لوں۔"
"لیکن میاں صاحبزادے سورج کبھی چاند تک نہیں پہنچ سکتا۔"
رضوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
جج صاحب کا ذہن کہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے تو ارادہ بغیر سوچے سمجھے یہ جملہ چاند کے نام پر کسا تھا۔ اور جج صاحب خدا کی پناہ ۔۔ اللہ بچائے ان بزرگوں سے۔ بدل کر لو لا۔

"اجی جناب چاند کی ہمت ہی کہاں ہے کہ سورج تک پہنچے جل کر بھسم نہ ہو جائے گا۔"

جج صاحب کا تاریخی قہقہہ کمرے کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ گیا۔

ڈنر کا وقت ہو گیا تھا گھنٹی بج رہی تھی، بیگم زاہد کے اٹھتے ہی وہ سب بھی کھڑے ہو گئے۔ چھ سات افراد کے کھانے کے لیے تین گز لمبی ڈنر ٹیبل مختلف انواع واقسام کے کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ عمرانہ اور رضوان کے لیے یہ تو معمولی بات تھی۔ مگر چاند۔ ان تمام امتحانوں سے قطعی بے خبر تھی ۔۔۔ اس کے لیے تو یہ بالکل نئی بلکہ انوکھی چیز تھی کہ دو چار مہمانوں کے لیے تواضع کا یہ طومار۔ دراصل ملک سے باہر رہنے کے باوجود وہ دولت مندوں کی دنیا سے ہمیشہ دور ہی تھی کچھ تو اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اور کچھ سرفراز احمد کے حکم سے۔ اپنی اتنی عمر میں اس نے گنتی کی چند ہی تقاریب میں شرکت کی تھی، وہ بھی ان لوگوں کے یہاں جن کے متعلق سرفراز احمد کو یقین تھا کہ وہ بھی انکے ہم پلہ ہیں۔ کیونکہ ان کا قول تھا انسان پستیوں کا مکین ہے۔ اسکے بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کے بجائے اپنی سطح پر ہی رہنا چاہیے۔ دریا جب تک کناروں کے اندر رہتا ہے تب ہی تک بھلا لگتا ہے لیکن جب ان کناروں کو توڑ کر اپنی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اپنی ساری ہستی کھو دیتا ہے اس دنیا میں خداوند تعالیٰ نے ہر انسان کی زندگی کی کچھ حدود مقرر کر دی ہیں۔ مگر جب وہ ان حدود سے نکلنے لگتا ہے تو گر پڑتا ہے۔

یہ سب کچھ شاید خود ان کی اپنی زندگی کا آئینہ دار تھا اسی لیے چاند اس نئے ماحول اور ان نئے تکلفات کو دیکھ کر حیران سی ہو گئی۔ عمرانہ نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ہی نزدیک بٹھا لیا۔

سالن کی ڈش رضوان کے آگے سرکاتے ہوئے رعنا نے اس کی طرف بھی دیکھا۔ لیکن وہ کھوئی کھوئی سی دھیرے دھیرے کھا رہی تھی۔

"ارے عمرانہ یہ تمہاری بہن چاند کھا بھی رہی ہیں یا محض ٹونگ رہی ہیں؟"

"چاند کبھی کھانا نہیں کھایا کرتا۔"

رضوان نے کنکھیوں سے چاند کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔" رعنا ہنس پڑی۔

"آپ یہ اسٹو لیں مس چاند، ہمارے یہاں کوئی تکلیف نہیں کیا کرتا۔"

"میں کھا رہی ہوں۔" بہت دور سے کسی کی آواز سنائی دی۔

بیگم زاہد نے کہا "بیٹی شرماؤ نہیں، اسے بھی اپنی پھپھی کا گھر سمجھو۔"

جج صاحب بولے "ہاں بھئی، کوئی بھوکا دوکا نہ جائے ورنہ کل کو وہ بیرسٹر عدالت میں میرے ہی خلاف بولنے لگے گا۔"

بیگم زاہد نے کہا "میں تو بیرسٹر شوکت اور ان کی بیگم کو کل کے کھانے پر بلا رہی ہوں۔ ویسے تو بغیر بلائے وہ لوگ کبھی بھی نہیں آئیں گے۔ اور ہاں یاد آیا، رعنا بیٹی تم اس کا بلاوا ان لوگوں کو آج ہی کیوں نہیں دے دیتیں پھر خدا معلوم کل جا سکو یا نہیں۔"

جج صاحب نے پوچھا "کس کا بلاوا بھئی؟"

رعنا بولی "آپ نہیں جانتے پپا۔ واقعی ممی نے بڑے وقت پر بلایا ہے۔"

رضوان نے پوچھا "کوئی خاص تقریب ہے؟"

رعنا نے کہا "جی ہاں بہت خاص۔ اچھا تو ممی میں باقاعدہ اعلان کر دوں؟"

بیگم زاہد نے کہا "کر دو۔ اچھا ہے سب کو معلوم ہو جائے گا۔"

رعنا نے کہا "خواتین وحضرات آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آئندہ منڈے بھی یعنی بارہ تاریخ کو چھ بجے سہ پہر مس رعنا زاہد حسین کے ہاں سالگرہ میں شرکت فرما کر مشکور ہونے کا موقع دیں۔"

رضوان نے ہاتھ سے روک کر کہا "خاتون مجھے اس سے اختلاف ہے۔"

رعنا نے پوچھا "فرمائیے۔"

رضوان نے کہا "کسی کو مدعو کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ گھر پر بلایا اور وہیں پر دعوت نامہ ٹکا دیا۔"

عمرانہ نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں بھی مسٹر رضوان کی تائید کرتی ہوں۔ انہیں چاہیے تھا کہ کل کسی وقت ہماری کوٹھی پر آ کر دعوت نامہ دیتیں۔"

"آرڈر ---- آرڈر"

جج صاحب جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھے سن رہے تھے اپنے مخصوص انداز میں میز پر زور سے ہاتھ مار کر چلائے۔

"میں نے رعنا کی گفتگو سنی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ مس رعنا غلطی پر ہیں انہوں نے قاعدے اور قوانین کی خلاف ورزی کی ہے لہٰذا اس جرم میں انھیں یہ سزا دی جاتی ہے کہ کل وہ اپنا کالج چھوڑ کر شوکت لاج جائیں اور پھر باقاعدہ دعوت نامہ دیا جائے۔"

"لیکن میں عدالت سے اپیل کرتی ہوں یہ سراسر زیادتی ہوگی کیونکہ کل میرا بڑا ضروری پریکٹیکل ہے اس لئے میں کسی طرح بھی کالج نہیں چھوڑ سکتی، اس کی گواہی مسٹر رضوان بھی دے سکتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی انکی طرف سے اپیل کرتا ہوں یہ کالج نہ چھوڑیں بلکہ کالج کے بعد سیدھی شوکت لاج جائیں اور دعوت نامہ دے کر شام واپس آئیں --- بس یہ سزا کافی ہے۔"

"ہیر --- ہیر --- ہیر"

جج صاحب اور عمرانہ نے تالیاں بجائیں۔

"ہے۔ فیصلہ ہوگیا!"

سب کھڑے ہوگئے۔

کھانے کے بعد دوسری مجلس جج صاحب کے کمرے میں آتشدان کے گرد منعقد ہوئی۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کی کئی مجلسیں جج صاحب کے یہاں اسی آتشدان کے گرد منعقد ہوچکی تھیں، اور ہر مجلس میں صدر کے فرائض جج صاحب انجام دیتے۔ نائب صدر رضوان زبردستی بن جاتا۔ یہ مجلسیں زیادہ تر سیاسی مسائل کے بارے میں ہوتیں۔ لیکن اکثر اس میں ادب اور ذاتیات کو بھی شامل کرا یا جاتا۔ اس کا مقصد جج صاحب کے نزدیک اپنی آئندہ نسل کا ذہنی ارتقا تھا انکا خیال تھا کہ ایک طالب علم علم کی طلب میں بہت کچھ سیکھ تو لیتا ہے مگر اس کے باوجود وہ بہت کچھ نہیں بھی سیکھتا۔ اس کا علم صرف گنتی کی کتابوں تک ہی محدود ہوتا ہے اور ان کے باہر اس کی دنیا تاریک ہوتی ہے۔

اسی لئے کچھ دیر حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا۔ مختلف پارٹیوں کے تذکرے چھڑتے۔ آئندہ ترقی کے منصوبے بنتے پڑھائی کے بارے میں گفتگو ہوتی اور آخر میں بیگم زاہد حسین کی طرف سے کچھ گھریلو مسائل پیش ہوتے۔

اس تمام عرصہ میں چاند صرف دو بار بولی۔ ایک بار جب وقت جج صاحب نے براہ راست اس سے سوال کیا۔

"کیوں مس سرفراز احمد ملک سے باہر آپ نے مسلمانوں کو کیسا پایا؟"

اس اچانک سوال پر ایک لمحہ کے لئے اس کا سارا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"اس مجلس میں شرم کرنا خلاف قانون و قاعدہ ہے"

رضوان نے خالص تحکمانہ انداز میں اعلان کیا۔

جج صاحب بولے "ہاں بیٹی یہ تو اچھی چیز ہے تم نے دیکھا ہے ہم سب کو بتاؤ۔"

اور وہ بڑی ہمت کر کے ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"یہاں آئے ہوئے تو ابھی مجھے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ پھر بھلا کیسے بتایا جاسکتا ہے کہ یہاں کے اور باہر کے مسلمانوں میں کیا امتیاز ہے"

جج صاحب نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شاباش۔ بہت خوب ماشاء اللہ"

اور جج صاحب کا دوسرا سوال مصر کے متعلق تھا۔ چاند نے مختصر الفاظ میں جلدی سے جواب دے کر پیچھا چھڑالیا وہاں کے فراعنہ کے محلات تو کھنڈر بن چکے ہیں۔ مگر ان کی ممیز اور داستانیں اب بھی وہاں موجود ہیں"

گیارہ بج چکے تھے۔ رضوان کھڑا ہوگیا۔

"اب اجازت دیجئے جج صاحب کافی دیر ہوگئی"

"اچھا بیٹے بیٹیوں۔ جاؤ۔ خوش رہو۔ تم لوگوں کے ساتھ بڑا پر لطف وقت گذر گیا۔ خدا حافظ۔ شب بخیر"

اور لوگ جج صاحب کے کمرے سے نکل آئے۔ بیگم زاہد اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ رعنا نے کار تک آکر ان کو رخصت کیا۔

عمرانہ اور چاند پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ رضوان آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیوں شمو ایسا بھی بھلا کیا اندھیر آٹھ روز سے سرفراز آیا ہوا ہے اور تم نے ہم کو خبر بھی نہ دی، واہ بہن! ایک تمہیں کی بہن تو نہیں نکلیں۔ ابا کے ناطے ہم بھی کچھ لگتے ہی ہیں

اور تو اور۔ اس سے بھی اتنا نہ ہوا۔ دو قدم چل کر بڑی بہن سے تو مل آتا۔ اندھیر ہے۔ خون سفید ہو گیا ہے دنیا والوں کا۔"

عائشہ بیگم نے کار سے اترتے ہی بیگم شوکت کو خوب ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بات بھی ڈانٹنے والی تھی، شہر کے شہر رہتے ہوئے بھی انھیں آٹھ روز تک یہ خبر بھی نہ ہوئی کہ سرفراز آئے ہوئے ہیں۔ یہ درست کہ عائشہ بیگم کو سرفراز احمد سے ایسی کوئی محبت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی دنیا دکھاوے کی خاطر۔ لبا اوقات انسان ان ظاہری چیزوں کا ہی سہارا لینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پندرہ برس بعد وہ آئے تھے۔ اس لئے ان کا فرض تھا کہ خواہ دکھاوے کے لئے ہی محض کھڑے کھڑے بڑی بہن سے مل آتے۔ یا پھر بیگم خورشید کو تیسرے ہی دن اطلاع کرا دی جاتی۔ مگر۔ نہ وہ ہو سکا اور نہ یہ۔ دلوں میں خلوص نہ ہو تو کاموں میں بھی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہرحال آتش فشاں پھٹنا تھا پھٹ گیا۔ جب تک عائشہ بیگم غصہ میں بکتی چلاتی رہیں بیگم شوکت چپ چاپ اپنی غلطی تسلیم کئے خاموش بیٹھی رہیں۔ جب وہ خاموش ہو گئیں تو انھوں نے بڑے پیار سے بہن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

بیگم شوکت نے کہا "اچھا آپا چلو اب اپنی شمو کو معاف بھی کر دو۔ سچ مچ غلطی ہو گئی۔ ان کم بخت گھر کے جھگڑوں میں تو کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ پھر خود سرفراز بھائی آتے ہی بیمار پڑ گئے۔ ورنہ وہ تو خود ہی تمہارے پاس جاتے۔ اللہ اللہ کر کے آج گھر سے باہر نکلے ہیں۔ فرحت آپا نہیں آئیں۔ عبدل سے کہا تھا صبح ہی صبح آ جاؤں گی۔"

عائشہ بیگم نے کہا "ہاں آ تو رہی تھیں۔ لیکن صبح ہی نوکر سے کہلوا دیا کہ چھوٹے بچے کی طبیعت خراب ہے، اس لئے شام تک آؤں گی۔ اس کے تو نخوڑ مارے بچے ہی سانس نہیں لینے دیتے۔ جب کبھی چلنے کو ہو گی ہر طرف سے چیاؤں ماؤں لپٹ جائیں گے۔"

بیگم شوکت نے کہا "ایسا مت کہئے۔ اللہ رکھے بھرا ہوا گھر ہے ان کا۔ یوں آپا فرحت کو شروع ہی سے بچوں کا بڑا شوق تھا۔ ویسے سچ پوچھئے تو ان کے بچے بھی ایک سے ایک خوبصورت ہیں۔"

عائشہ بیگم بولیں "نہ بابا۔ ایسی مصیبت سے اللہ ہی بچائے۔ اور کہو سرفراز کے کیا حال ہیں۔ پہلے سے کچھ بدلے بھی ہیں یا وہی بے ڈھنگی چال ہے۔ سچ پوچھو تو جب سے اس کا سنا ہے وہی شکل یاد آئے جا رہی ہے جس کو دیکھ کر ہم سب بھاگ جایا کرتے تھے۔"

بیگم شوکت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہوں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔ اور انتہائی ضبط کے بعد دھیرے سے بولیں۔

"اب بھلا کیا بدلیں گے وہ۔ یہ عمریں بھی کیا انسان کے رنگ روپ بدلنے کی ہوتی ہیں۔ بدلنے اور صحت بننے کا تو وہی وقت تھا جو بدقسمتی سے ان کو ملا ہی نہیں۔"

عائشہ بیگم نے کہا "ہاں بیوی یہ بھی بس قسمت کے کھیل ہیں بعض بچے تو ماں کے پیٹ سے ہی موٹی کھوٹی قسمت لے کر آتے ہیں۔"

بیگم شوکت نے کہا "میں اس چیز کی قائل نہیں قسمت تو زبردستی بنا دی جاتی ہے اس میں کسی بچے کا کیا قصور۔ اس غریب کو تو جیسا ماحول ملے گا ویسی ہی قسمت ڈھل جائے گی۔ صغرا خالہ کے لڑکے کو دیکھئے ماں باپ کے مرنے کے بعد آپ ہی سب نے کہا تھا کیسی بری قسمت لے کر آیا ہے مگر اب وہی لڑکا خاندان کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا ہے۔ وہی اب ہر شخص کی نگاہوں میں خوش قسمت انسان ہے۔ اور اسی کو اپنے خاندان کا ہر فرد بلانا باعث فخر سمجھتا ہے۔"

عائشہ بیگم نے کہا "خیر اپنی اپنی رائے ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ وہ لڑکی جو سرفراز لے کر گئے تھے۔ اب بھی ہے یا ختم ہو گئی؟"

بیگم شوکت نے کہا "اللہ رکھے اس بچی کو، ماشاءاللہ اب تو جوان ہے۔ بی۔ اے میں پڑھ رہی ہے۔ سرفراز بھائی نے چاند نام رکھا ہے۔ اور ہے بھی ہو بہو چاند کی طرح۔"

عائشہ بیگم نے کہا "ہوں۔ تو ہو گی بالکل اپنی ماں کی طرح۔"

بیگم شوکت نے کہا "سچ مچ آپا بالکل بھابی مرحومہ کی دوسری تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر تو وہ مجھے بہت یاد آئیں۔"

"اونھ۔ عائشہ بیگم کو اس ذکر سے کچھ خوشی محسوس نہیں ہوئی اور بڑی بیزاری سے منہ پھیر کر بولیں۔

"ذرا بلانا۔ میں بھی تو دیکھوں تمہاری بھاوج کی دوسری تصویر کو۔"

"بالو۔"

بیگم شوکت نے اپنی ملازمہ کو آواز دی جو قریب ہی ایک کرسی پر

ان کی شال بن رہی تھی۔

"دیکھو ذرا اوپر جاؤ اور چاند بٹیا سے کہنا آپ کو پھوپھی اماں بلا رہی ہیں۔"

عائشہ بیگم نے کہا۔ "یہ چاند نام رکھنے کا نیا ہی دلار دیکھا۔ اسے کوئی دوسرا نام نہیں سوجھا تھا سرفراز کو۔"

"نام بھی تو شکل ہی کے لحاظ سے رکھا جاتا ہے۔ آپا اس کی شکل بھی تو چاند جیسی ہے۔"

"اب ان کے ارادے کیا ہیں۔ کیسے ایکدم سے ادھر کا خیال آ گیا۔ کوئی کام وام کریں گے یا بہنوں کے سر کھائیں گے؟"

"بہنوں کے سر کھائیں گے۔ اپنا روپیہ لائے ہیں وہی خرچ کریں گے۔ اب تو ماشاءاللہ انجینئرنگ پڑھ کر آئے ہیں۔"

"اچھا بڑھاپے میں یہ شوق بھی چرایا ہے۔"

علم علم ہی ہے آپا خواہ بڑھاپے میں حاصل کیا جائے یا جوانی میں، اس کی قیمت اور وقعت ہر دور میں ایک ہی رہتی ہے اور پھر یہ تو ابا جان مرحوم کی خواہش تھی اس وقت پوری نہ ہوئی اب ہو گئی۔ لیجیے وہ چاند بھی آ گئی۔"

"آؤ بیٹی۔ ادھر آ جاؤ۔"

بیگم شوکت نے اسے اپنے قریب بلا لیا۔

"یہ دیکھو یہ تمہاری سب سے بڑی پھوپھی ہیں، اور ان سے چھوٹی والی شام تک آئیں گی۔ تم اس روز مجھ سے پوچھ رہی تھیں آج دیکھ لو۔"

"آداب۔" چاند نے دھیرے سے نظریں اٹھا کر عائشہ بیگم کو سلام کیا۔

عائشہ بیگم بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی سرفراز کی لڑکی ہو سکتی ہے یا وہ یقین کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ انسان کی خود غرضی بعض اوقات اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے کو اپنے سے کسی حال میں بڑھا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

"جیتی رہو۔"

انہوں نے بڑے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔ انکی آواز کا کھوکھلا پن انکے چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا

"آپا دیکھا آپ نے۔"

بیگم شوکت کی آواز نے ان کی محویت توڑ دی۔

"سرفراز بھائی نے چاند نام غلط تو نہیں رکھا؟"

"ہاں۔" مجبوراً اقرار کرنا ہی پڑا۔

"آج کیا خیال آپ کو آیا ہو ابا جان ہوتے تو اس بچی کو دیکھ بہت خوش ہوتے۔"

باپ کے نام پر بیگم شوکت کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"تو تم بی اے میں پڑھ رہی ہو۔"

انہوں نے براہ راست چاند سے سوال کیا۔

"جی ہاں۔"

"پھر آگے بھی پڑھنے کا ارادہ ہے کیا؟"

عائشہ بیگم نے کہا۔ "نہیں بس۔ بی اے بھی لڑکیوں کے لیے بہت ہے۔ ہمارے زمانے میں تو یہ بھی نہیں تھا ذرا لکھنا پڑھنا آ گیا تو سمجھو عمر با عزت بن گئے۔"

"لیکن آپا میں سوچتی ہوں اگر کسی بچے یا بچی کو مزید تعلیم کا شوق ہے تو ضرور دلانی چاہیے ورنہ کسی کے شوق و ارمانوں کا گلا گھونٹنا تو اس انسان کا گلا گھونٹنے کے برابر ہو جاتا ہے۔"

"اے بس رہنے دو یہ گلا گھونٹنا اور برابر کرنا۔ لڑکیوں کے لیے یہ بھی کچھ کم نہیں، کوئی نوکری تھوڑی ہی کرنی ہوتی ہے اماں باوا اتنا ہی کر دیں تو قسمت سمجھو۔"

"شمو میں آ جاؤں اندر۔" باہر سے کسی کی آواز آئی۔

"اے لو سرفراز بھائی آ گئے۔" بیگم شوکت کا چہرہ کھل اٹھا۔

"آ جائیے یہاں کون پردہ کر رہا ہے آپ سے۔"

عائشہ بیگم نے کہا۔ "ہاں اور کیا، اب یہ دن بھی آ گیا کہ بڑی بہن پردہ کر کے بیٹھے گی۔"

سرفراز احمد نے کہا۔ "اوہو۔ آپا جان صاحبہ ہیں۔ آداب، تسلیمات کہیئے سب خیریت۔ آپ تو بالکل ہی امی جان بن گئیں۔ وہی شکل، وہی آواز، وہی رعب۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا۔"

بیگم شوکت نے کہا۔ "آپا آپ سے سخت ناراض ہیں کہ اتنے دنوں سے آئے ہوئے ہیں لیکن ملنے بھی نہیں آئے۔"

سرفراز احمد نے کہا۔ "سچ مچ ناراض ہیں۔ لیکن یقین مانیے آپا اس میں میرا قصور نہیں۔ اپنی چھوٹی بہن کی پٹائی لگائیے۔ میں تو روز کہتا آپا کو بلاؤ۔ انکے پاس لے چلو مگر۔"

بیگم شوکت نے کہا۔ "اے ہٹو۔ شکل دیکھ لی تو لگے باتیں بنانے۔ محبت ہوتی تو بنا کہے بھاگے چلے آتے۔ یوں کیوں نہیں کہتے، دل ہی نہیں چاہا۔"

سرفراز احمد نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ آپ تو مانتی ہی نہیں

"ارے بھئی۔ میں تو جس دن آیا تھا اسی دن آپکے پاس آ رہا تھا مگر شمو — جی ہی نہیں لے گئی۔"

بیگم شوکت نے کہا "اے واہ بڑے آئے وہاں سے کچھ بس نہیں چلا تو اب چلے ہم دونوں کو لڑوانے۔ اسی روز تو آپ کو بخار چڑھ آیا پھر کیسے لے جاتی!"

سرفراز احمد نے کہا "اچھا چلیے اب غصہ تھوک دیجیے آپا ورہاں یہ فرحت کہاں ہے۔ کیا پھر ہمیشہ کی طرح کہیں چھپ کر بیٹھ گئی۔ ارے بھئی نکل باہر۔ ورنہ یاد رکھ بڑی پٹائی کردوں گا۔"

بیگم شوکت کو ہنسی آ گئی۔

"وہ ابھی کہاں ہیں۔ شام تک آئیں گی۔ بچے کی کچھ طبیعت خراب تھی!"

"بوڑھے ہو گئے لیکن وہ اوٹ پٹانگ جلبلا پن کی باتیں اب تک نہ گئیں۔ ارے بیٹی کے سامنے تو ڈھنگ سے رہا کرو!"

سرفراز احمد نے کہا "ارے آپا۔ کیا کروں۔ یہ زبان رکتی ہی نہیں۔ دراصل بڑھاپا جسم پر آیا ہے، دل اور زبان پر نہیں۔ جب ان پر بھی آ جائے گا تو دیکھنا جو پل بھر میں ہل جاؤں!"

بیگم شوکت نے کہا "اچھا بس چپ بھی رہیے۔ لگے فضول باتیں کرنے۔"

سرفراز احمد نے کہا "ارے چاند بیٹا۔ دیکھا تم نے اپنی بڑی پھوپھی کو، کتنا ڈانٹتی ہیں۔ ذرا دور ہی رہنا۔ ورنہ"

عائشہ بیگم نے کہا "ہاں ہاں، کہہ دینا، ورنہ کیا — گلا دبا دوں گی نا جیسے اسے کیوں لڑکی کو بھی مجھ سے متنفر کرائے دیتا ہے!"

بیگم شوکت نے کہا "دیکھا آپ نے آپا — پندرہ سولہ برس کے بعد بھی یہ سرفراز بھائی ویسے ہی کے ویسے رہے۔ ذرا بھی تو کوئی فرق نہیں ہوا۔ سوائے ان سفید بالوں کے!"

سرفراز احمد نے کہا "اور کہیں ذرا بھی بدل جاتا تو شاید تم لوگ گھر میں بھی نہ گھسنے دیتیں!"

عائشہ بیگم بولیں "اچھا چل ہٹ پرے۔ مجھے لڑکی سے بات کرنے دے۔"

اور انہوں نے ہاتھ پکڑ کر چاند کو اپنے قریب بٹھا لیا۔

سرفراز احمد نے عائشہ بیگم اور چاند کو قریب قریب بیٹھے دیکھ کر کچھ سوچا — اور پھر بیگم شوکت کے قریب بیٹھتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

"کیوں شمو آپا کچھ بدلی ہوئی لگ رہی ہیں نا؟"

"مجھے کیا معلوم!"

"ارے یہ کہاں ہے سرفراز!"

باہر سے کسی کی جانی پہچانی آواز سن کر سرفراز احمد اچک کر کھڑے ہو گئے۔

"دیکھا۔ وہ فرحت آ گئی۔ ہے نا بالکل میری اپنی بہن!"

وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے۔ عین اس وقت فرحت بیگم شال پہنتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ ان کا چہرہ غیر معمولی خوشی سے تمتما رہا تھا۔

دونوں بھائی بہن لپٹ گئے۔

"نالائق کہیں کی۔ صبح سے کیوں نہیں آئی تھی!" سرفراز احمد نے کہا۔

"گاؤدی کہیں کا۔ اتنے دن سے آیا ہوا ہے۔ اور ہمیں خبر تک نہیں دی!" فرحت بیگم نے بڑے پیار سے ڈانٹا۔

بیگم شوکت، عائشہ بیگم اور چاند تینوں دور بیٹھی بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔

"ارے تم نے تو کہا تھا شام تک آؤں گی۔ یہ اس وقت کیسے بھاگی چلی آئیں!" عائشہ بیگم نے پوچھا۔

فرحت بیگم نے کہا "کیا کروں آپا دل ہی نہیں مانا۔ بھلا سرفراز کے آنے کی خبر سن کر بھی بیٹھی رہتی۔ یہ کیسے ممکن تھا!"

بیگم شوکت بولیں "اچھا بھائی سے مل چکیں اب بھتیجی سے مل لیجیے۔ یہ سرفراز بھائی کی وہی لڑکی چاند ہے!"

فرحت بیگم نے آگے بڑھ کر چاند کو چوم لیا۔

"ہائے کتنا ارمان تھا مجھے اپنی بچی کو دیکھنے کا۔ ہمیشہ وہی ننھی سی گڑیا آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی تھی۔ برا ہو اس سرفراز کے بچے کا جس نے اتنے دنوں تک چھپا کے رکھا۔"

اور سرفراز احمد دور کھڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

رات کھانے پر مسز شوکت کا ڈائننگ روم مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اس وقت انکے دسترخوان پر ایک نہیں چار چار خاندان موجود تھے۔ عائشہ بیگم انکے میاں، دونوں بچے — فرحت بیگم اور انکے شوہر اور بچے۔ زندگی پورے شباب پر تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا میں صرف قہقہے ہی قہقہے اور مسکراہٹیں ہی بکھری ہوئی ہیں آنسوؤں اور آہوں کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

فرحت آپا ہم نے سنا تھا کہ خدانخواستہ دشمنوں کی

طبیعت کچھ ناساز ہے۔"

بیرسٹر شوکت نے کھانا کھاتے کھاتے فرحت آپا سے پوچھا۔

فرحت بیگم نے کہا "اے واہ بیرسٹر۔ تم جب سنتے ہو الٹا ہی سنتے ہو۔"

وہ ان کو ہمیشہ بیرسٹر کہا کرتی تھیں۔

بیرسٹر شوکت نے کہا "تو اس میں خفا ہونے کی کونسی بات ہے بھائی۔ میں نے بھی تو دشمنوں کو کہا ہے آپ کو تو نہیں۔"

فرحت بیگم کے شوہر ارشد احمد نے کہا "دراصل ان بیچاری کو اپنی عزت مآب تندرستی پر بڑا ناز ہے۔ میں بھی تو اللہ کے فضل سے۔"

عائشہ بیگم نے کہا "اچھا بس چپ رہو ارشد۔ آگے مت کچھ کہنا ہم تینوں بہنوں میں ایک انہی کی صحت تو کچھ غنیمت ہے۔"

سرفراز احمد بولے "ارے ارشد جان یہ تو بچپن ہی سے ایسی موٹی کی بلی رہی ہے۔ جب کبھی غصہ میں آکر مجھے ایک آدھ تھپڑ جماتی تو بس تارے نظر آنے لگتے تھے۔"

فرحت بیگم نے کہا "آہا جیسے خود تو بیچارے بڑے سیدھے تھے نا۔ سب سے زیادہ مجھ ہی کو ستاتے تھے۔"

بیرسٹر شوکت بولے "پھر بھی آپ دونوں میں ہمیشہ ہی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔"

عائشہ بیگم نے کہا "ہٹو بھی نہ۔ لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ بھلا ابا جان مرحوم کی زندگی میں کوئی ان سے لڑ بھی سکتا تھا۔"

بیرسٹر شوکت نے کہا "ارے آپ لوگ تو اپنی باتوں میں مشغول ہیں، بیچارے بھائی صاحب چپ چاپ کھاتے چلے جا رہے ہیں۔"

عائشہ بیگم نے کہا "انہیں کچھ نہ کہو، کھانے کو دیکھ کر تو انہیں ایسی ہی چپ لگ جاتی ہے۔ بس اپنی پلیٹ سے کام ہوتا ہے۔ خواہ دنیا میں کچھ بھی ہو جائے۔"

سرفراز احمد نے کہا "بھائی صاحب کی تو یہ ہمیشہ ہی کی عادت ہے۔ میں نے تو انہیں زندگی میں تین یا چار بار زور سے ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔"

بیگم شوکت نے کہا "اور کیا مردوں کی شان ہی یہ ہے۔ ان کو ایسا ہی بردبار ہونا چاہیے۔"

بیرسٹر شوکت زور سے ہنس پڑے،

"لیجیے صاحب آ گئی میری شامت۔"

اور اسی میز پر دوسری طرف عائشہ بیگم کے بچے عذرا اور فرحت بیگم کے بچے شمسہ، انجمہ اور ریحان۔ عمرانہ، رضوان اور چاند سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

عمرانہ نے کہا "عذرا باجی اس روز رضوان بھائی سے آپ نے کچھ کہلوایا تھا۔"

عذرا نے کہا "میں نے ۔۔۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہلوایا۔ بھلا یہ رضوان صاحب آئے ہی کب ہمارے یہاں۔"

رضوان نے کہا "کیوں جھوٹ بولتی ہو عذرا ۔۔۔ تم نے کچھ کہلوایا تو ضرور تھا۔"

عذرا نے پوچھا "مثلاً کیا کہلوایا تھا میں نے بتایئے تو۔"

رضوان نے کہا "ارے میاں ریحان ذرا تگڑے نوالے لو۔ یہ کیا چڑیوں کی طرح میرا مطلب ہے چڑوں کی طرح ٹونگ رہے ہو۔"

قمر نے کہا "دیکھا باجی کتنی جلدی بات بدلی ہے اس شخص نے ڈاکٹری پڑھ کر تو روز بروز چالاک ہوتا جا رہا ہے۔"

رضوان نے کہا "اچھا جی مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ چپ کرا لو عمرانہ انہیں ورنہ۔"

سب ہنس پڑے۔ عمرانہ جھینپ گئی۔

قمر نے کہا "تمہاری یہ بدتمیزی کی عادت کب جائے گی۔"

رضوان نے کہا "جب آپکا عقد ہو جائے گا۔"

عمرانہ نے کہا "اچھا چپ رہو رضوان۔ امی نے سن لیا تو ٹھیک کر دیں گی۔"

قمر نے کہا "مگر اس چالاک ڈاکٹر کے سامنے تو امی بھی بے بس ہو جاتی ہیں۔"

شمسہ نے کہا "اسی لئے تو رمضان بھائی ڈاکٹری پڑھ رہے ہیں ورنہ پھر زیادہ سے زیادہ مریض کیسے آتے۔"

رضوان نے کہا "جیتی رہو شمسہ رانی۔ آج عقل کی بات کہی ہے تم نے۔ یہ قمر تو نرا گاؤدی ہے۔"

قمر نے کہا "شٹ اپ۔ یاد رکھو تم سے ایک مہینہ بڑا ہوں۔"

"تو آپ صرف ایک ہی مہینہ تو بڑے ہیں قمر بھائی۔ اور میں جو اس انجمہ کی بچی سے ایک سال بڑا ہوں تو یہ کونسا میرا ادب کرتی ہے۔"

"جھوٹ تو نہ بولو ریحان بھائی۔ اگر کبھی ذرا بھی کچھ بولتی ہوں

تو وہ بری طرح امی سے کان کھنچواتے ہو کہ اللہ میری توبہ "

سب ہنس پڑے۔

عمرانہ نے کہا "خیر جی جانے دو۔ لو یہ میٹھا کھاؤ۔ ممی نے خاص طور پر تم لوگوں کے لیے بنوایا ہے"

رضوان نے کہا "یہ کیوں نہیں کہتیں قمر کے لیے بنوایا ہے"

عمرانہ نے کہا "میں سچ مچ چلی جاؤں گی۔ رضوان بھائی اگر اب آپ بولے"

عذرا نے کہا "اچھا، اب تم سب چپ ہو جاؤ، یہ چاند صاحبہ بولیں گی، میں اتنی دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ ہم سب بک بک کیے جا رہے ہیں اور یہ"

رضوان نے کہا "بکتی ہی نہیں"

قمر نے کہا "جو بات کرو گے ہمیشہ الٹی"

عمرانہ نے کہا "آپ کو نہیں معلوم عذرا باجی، یہ چاند بہت کم بات کرتی ہے"

رضوان نے کہا "بہت کم کا کیا سوال ہے جی چاند کبھی بات ہی نہیں کرتا"

قمر نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"بات تو ٹھیک کہی رضوان نے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اب آسمان سے زمین پر آ کر چاند کو کچھ نہ کچھ بولنا ہی پڑے گا" کیوں چاند صاحبہ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں"

"چاند ہلکے سے مسکرا دی "جی نہیں"

"یہ جی نہیں کا کیا مطلب ہوا بھائی"

"اچھا بس تم چپ رہو۔ ہاں چاند اب ہمارے یہاں کب تک آ رہی ہو"

"کسی دن بھی آ جاؤں گی"

"نہیں صاحب یہ کسی دن کا سوال ٹیڑھا ہے۔ بس کل یا پرسوں تک آؤ"

"واہ ابھی تو میں خود ہی نہیں بھیجوں گی انہیں"

"سنا ہے آپ اگلے سال کالج میں داخلہ لے رہی ہیں"

"جی ہاں"

"بی۔ اے کا آخری سال ہے نا"

"جی"

"تو پھر آپ ہمارے ہی کالج میں داخلہ لیجیے گا"

"کیوں صاحب کیا میرا کالج برا ہے جو چاند آپ کے یہاں جائیں گی"

"تمہارے سے تو اچھا ہی ہے"

"خیر۔ تم لوگ لڑو نہیں اب مجبوراً مجھے ان کو اپنے ہی کالج سے جانا پڑے گا۔ یہ میٹھا نوش فرمایئے چاند صاحبہ۔ امی نے خاص طور پر آپ ہی کے لیے بنوایا ہے"

آخری جملہ رضوان نے جان بوجھ کر عمرانہ کو چڑانے کے لیے کہا تھا۔

سوائے عمرانہ کے سب ہنس پڑے۔

"تم کسی طرح باز نہیں آؤ گے" عذرا نے ڈانٹا۔

"تو لیجیے چلا جاتا ہوں۔ اب تو خوش ہیں" لیکن چلتے چلتے بھی اپنی حرکت سے باز نہیں آیا۔ چاند کے سامنے میٹھے کی پلیٹ اٹھا کر بولا۔

"آپ کہتی ہیں تو کھا لیے لیتا ہوں۔ ویسے خواہش تو نہیں" اور پلیٹ لیے ہوئے باہر نکل گیا۔

بزرگ پارٹی بھی باہر نکل چکی تھی۔

یہ قربتیں یہ فاصلے

سچی کہانی

بشریٰ رعنا

خانم کے دروازے پہ عورتوں کا ہجوم لگا تھا ساری کالونی کی عورتیں مِل مِل کے اس کے گھر جا رہی تھیں میں بھی دوپٹہ سنبھالتی اس کے گھر کی طرف دوڑی جانے خانم نے کیسی رونق لگائی تھی سب اسی کے گھر کی طرف رواں دواں تھے اِس کالونی میں طرح طرح کے لوگ آباد تھے معاش کے چکر میں جانے کہاں کہاں کے لوگ اس کالونی میں آ بسے تھے خانم گل زمان کی بیوی تھی انگوروں کی بیل سے ڈھکا صاف ستھرا دار... اس نے بڑی محنت سے سنوارا ہوا تھا اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی نو سال سے اسی کالونی میں مقیم تھی خانم کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی مگر وہ اپنی اچھی صحت اور خوبصورتی کی وجہ سے اپنی عمر کی نہ لگتی تھی اُس کے طور طریقوں میں وقار اور چال میں بانکپن تھا اپنی خوبصورتی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے وہ پوری کالونی میں مقبول تھی گھر کے سیاہ سفید کی وہ مالک تھی گل زمان اس کی بڑی عزت کرتا تھا اِس کے مشورے کے بغیر قدم بھی نہ اُٹھاتا خانم کی زندگی میں جہاں مسرتوں کے انبار تھے وہاں ایک بہت بڑی محرومی بھی تھی ایک بڑا خلا تھا خدا نے اُسے اولاد کی نعمت سے نہیں نوازا تھا وہ بے ثمر کی شاخ تھی اِس کے سونے آنگن میں کھیلنے والے بچے نہ تھے وہ اکثر اس بات پہ رنجیدہ ہو جاتی جو بیس سالہ رفاقت میں وہ گل زمان کو یہ خوشی نہ دے سکی تھی اس روگ کا مداوا کرنے کے لئے اِس نے سو جتن کر ڈالے دواؤں کے ساتھ دعاؤں کا بھی سہارا لیا وہ سجدوں میں گِر کے اپنے گلشن میں کھلنے والے پھول کی دعائیں مانگتی جب خان کسی بچے کی طرف حسرت سے دیکھتا تو اس پر قیامتیں ٹوٹ پڑتیں اُسے اپنی بے چارگی پہ خود ہی ترس آ جاتا کتنی بے بس تھی وہ۔ خاوند کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کرنے والی خانم تڑپ تڑپ جاتی وہ خان کے گرد پروانہ وار منڈلاتی کبھی وہ پریشان ہو جاتی وہ دل ہی دل میں خود کو مجرم سمجھنے لگی محبت میں شراکت برداشت کرنا بھی اِس کے بس کا روگ نہ تھا مگر محبت قربانی مانگتی ہے وہ بھی دل ہی دل میں عظیم منصوبے سوچتی مگر اس کے فیصلے آن واحد میں ریت کے محلوں کی طرح ڈھ جاتے وہ بھی پیار میں ایسی مثال بن جانا چاہتی تھی جس کو زمانہ یاد رکھے مگر سوکن کا تصور ہی اُسے دہلا دیتا خان کبھی اُلجھ پڑتا تو اس کی سوچیں تلپٹ ہو جاتی۔ وہ یہ سب بے رخی کی ادائیں سمجھتی خان کے پاس اپنی رفیق کی چاہت کا سرمایہ تھا مگر لوگوں کی باتیں۔ والدین کے تقاضے اب خان کے ساتھ ساتھ اِس کے لئے بھی ناقابل برداشت ہو گئے تھے ایسے میں خانم نے پیا کی دل کے فیصلوں کو یکسر فراموش کر کے اس نے قربانی دینے کی ٹھانی اور یہ فیصلہ اپنے دل کے حکم کو سنایا گل زمان نے چونک کے اُسے دیکھا لاکھ ضبط کے باوجود خانم کی پلکوں پر آنسوؤں کا چراغاں تھا خان نے منع کیا مگر وہ تو اپنی چاہی یہ خوشی دینا چاہتی تھی دو دن ہی سسرال گئی ساس کے ساتھ مل کر خان کی دلہن تلاش کر آئی نئی دلہن اٹھارہ سال کی تھی خیر اس کی شکل و صورت بس واجبی سی تھی مگر چہرے پہ یہ جوانی کا چھب چھب تھا اولاد بھی بڑی نعمت ہے مگر اچھی سنگت کو بھلا دینا بھی کچھ آسان نہیں خان کے کوارٹر کے باہر یہ ہجوم اسی سلسلے میں تھا بہت سی عورتیں جمع تھیں خانم تو کالونی ہی میں جا رہی تھی اور خان دُلہن بھی لے آیا تھا بڑے بڑے پھولوں والا سرخ سوٹ پہنے تھوڑا سا گھونگھٹ کاڑھے دلہن خان کے ساتھ دروازے پہ کھڑی تھی اُس کی ساس پھلوں پھولوں سے اِس کی جھولی بھرتی جاتی اور ساتھ ساتھ دعاؤں سے نوازتی جا رہی تھی میں نے خانم کو تلاش کیا دُور امرود کے درخت کے پاس خانم کھڑی تھی جھکی جھکی گردن سے نگاہوں میں سوچ کے اتھاہ گہرے سمندر لئے اُس نے خود کو بہت اہتمام سے سنوارا ہوا تھا کالونی میں رہنے کی وجہ سے اُسے پہننے اُوڑھنے بیٹھنے کا بڑا سلیقہ تھا اس کا حسن ایسا دلنواز تھا لوگ دیکھتے ہی رہ جاتے گہرا سبز سوٹ پہنے وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی اس کے حسن کو حزن

ملال نے دو چند کر دیا تھا ہونٹوں پہ پھیکی پھیکی مسکراہٹ لئے آنکھوں
ں شکست کا احساس لئے وہ لٹی لٹی درخت کے سہارے کھڑی
ی آنکھوں سے بہت سی ان کہی کہانیاں عیاں تھیں شاید وہ ان
وں کو کھوج رہی تھی جب وہ بھی اسی طرح جھکی جھکی پھولوں کی ڈالی
طرح خان کے پیچھے کھڑی تھی جب ساس نے اس کو بھی پھولوں
سے بھری جھولی کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کروائی تھی اگر خدا نے اس
ے گلشن میں پھول نہیں کھلائے تو وہ مجبور تھی یہ اس کے اپنے
ں کی بات ہوتی تو آج دوسری عورت اس کی دہلیز پار نہ کرتی وہ تبوں

پہ جیب کے پیچھے سر لگائے کھڑی تھی خان ہٹ گیا تو ساس دلہن
کو لے کر کمرے میں چلی گئی سب عورتیں بھی ساتھ ہی اندر گئیں دلہن
نے جھکا ہوا سر قدرے بلند کیا کمرے میں مہندی اور پھولوں کی باس
بکھر گئی خانم قہوے کی پیالیاں ٹرے میں سجائے اندر داخل ہوئی
لبوں پہ دم توڑتی مسکراہٹ کے ساتھ وہ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ
مہمان نوازی کے فرائض انجام دے رہی تھی رسم دنیا نبھا رہی تھی میں
حیران ہو کے یک ٹک اسی کی طرف دیکھے جا رہی تھی دلہن ریشمی
رومال سے کھیل رہی تھی اور خانم چور نگاہوں سے اسی کا جائزہ لے

رہی تھی اس کی روتی مسکراہٹ میرے دل میں ہلچل مچا رہی تھی میں اُٹھ کر گھر آ گئی کالونی میں جیسے گفتگو کے لیے نیا موضوع مل گیا تھا۔ گھر گھر میں خان کے قصے گلی گلی میں اُسکی کہانی خانم کی سانس چلی گئی زندگی معمول پہ آ گئی گلناز اور خانم ساتھ رہتے لگیں ایک ہی نیام میں دو تلواریں بغیر ٹکرائے رہنے لگیں خانم گھر کے بہت سے کاموں سے سبکدوش ہو گئی گلناز نے گھرداری سنبھال لی وہ خاموش رہتی کالونی میں وہ نووارد تھی نہ وہ اردو سمجھتی نہ پنجابی وہ چپکے چپکے گھر کے کام کرتی رہتی خان نے خود پہ بہت زیادہ توجہ دینی شروع کر دی وہ تو خدا کی طرف سے بنی بنائی تھی توجہ سے اس کا حسن یوں نکھرا کہ کالونی والیاں حیران رہ گئیں لوگ جب اس کے حسن کو سراہتے تو وہ فخر سے گردن اُٹھا کے سوکن کو دیکھتی اپنی تمام محبتوں کو پسِ پشت ڈال کر وہ خان سے یوں بیگانہ ہو گئی جیسے اپنی تمام چاہتیں تمام جذبے بھلا بیٹھی ہو شاید اُس سے اجنبیت۔ لاتعلقی ظاہر کر کے وہ اُسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکا لیکن وہ اس کے بغیر بھی رہ سکتی ہے اکثر خان کی موجودگی میں وہ گھر سے نکل جاتی کالونی میں ملنے والیوں کے ساتھ بیٹھی مسکرا مسکرا کر کہتی۔

”اچھا ہوا خان نے آیا دلہن میری جان چھوٹی گھر کے جنجال سے۔“

جانے وہ یہ سب کچھ سچے دل سے کہتی یا اُوپرا اوپر سے کبھی کبھی بہت ترنگ میں آ جاتی تو کہتی دعا مانگو خدا گل زمان کو اولاد دے اور میں اس کے بچے کھلاؤں میں تعجب سے پوچھتی۔

”خانم یہ سب کچھ کیسے برداشت کرو گی۔؟“

وہ قہقہہ لگا کر کہتی۔

”جیسے گلناز کو برداشت کر لیا۔“

خان کی شادی کو چھ ماہ بیت گئے بات پرانی ہو گئی لوگ اب اس موضوع کو بھول گئے خانم بھی کچھ پرسکون ہو گئی گلناز پہ اس کا بہت رعب تھا۔ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی بات پہ اُسے ڈانٹ دیتی غصے میں ہوتی تو مارنے سے بھی گریز نہ کرتی گلناز یہ سب کچھ برداشت کر جاتی وہ خانم کے ستم سہہ لیتی مگر اُف نہ کرتی ہم سب خانم کے رویئے پہ حیران تھے وہ تو بڑی خوش اخلاق بڑی ملنسار خاتون تھی جانے اُسے اب کیا ہو گیا تھا جب وہ گلناز کے ساتھ لڑتی تو اس کی نگاہوں سے قہر برستا وہ پشتو میں جانے کیا کچھ کہتی رہتی جو میری سمجھ سے بالاتر ہوتا کالونی والوں نے تو اُس کا یہ روپ اب ہی دیکھا تھا میری وہ بہت اچھی ہمسائی تھی آج تک اُس کی میرے ساتھ تو کیا پوری کالونی میں کسی کے ساتھ کبھی تلخ کلامی بھی نہ ہوئی تھی جب وہ گلناز کے ساتھ جھگڑتی میں دیوار پہ چڑھ کے نہ سے آواز دے لیتی اس کا رنگ تانبے کی مانند ہوتا کانپتے وجود کے ساتھ وہ یہاں آ کر پلنگ پہ گرتی جیسے لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو اس کی تیز سانسیں اور آنکھوں کی وحشت چند لمحوں کے لیے مجھے ہراساں کر دیتی اس کی بادامی آنکھوں میں نمی تیر جاتی اور وہ پراسرار لہجے میں کہتی۔

”دعا کرو گلناز کبھی ماں نہ بن سکے جو خوشی خان کو میں نہیں دے سکی وہ دنیا کی دوسری کوئی عورت نہ دے سکے۔“

میں حیران ہو کے اس کا دھواں دھواں چہرہ دیکھتی رہ جاتی جانے اس عورت کے کتنے روپ تھے گلناز نہ تو اردو بول سکتی تھی نہ سمجھ سکتی خانم اس کے سامنے بھی جو دل چاہتا کہتی رہتی گلناز چپ چاپ سب کچھ سنتی رہتی اور اپنے کام میں مشغول رہتی پانچ وقت نماز پڑھتی اور وظائف کرتی خانم اس کے ہر کام میں نقص نکالتی کبھی اپنی دیوانگی میں اس کی نماز کو بھی نشانہ بنا جاتی مسلسل سوتن نے اُسے چڑچڑا بنا دیا تھا جب کبھی گلناز طویل وظائف کرتی تو خانم پاؤں جلی بلی کی طرح سارے کوارٹر میں چکر کاٹتی دروازے توڑتی۔ برتن ادھر اُدھر پھینکتی اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں دل کی بھڑاس نکالتی جب دل کی آگ پھر بھی نہ ٹھنڈی ہوتی تو گلناز کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹ لیتی کانپتے بدن اور شعلے برساتی آنکھوں سے وہ گلناز پہ جھپٹ پڑتی اُسے مارتی جاتی اور کہتی۔

”میں نے بھی ساری عمر نمازیں پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگیں مجھے خدا نے کچھ نہیں دیا۔ تو کیا اُس لگانے بیٹھی ہے تیرا خدا کوئی اور تو نہیں وہی خدا ہے تیرا بھی جو میرا ہے۔“

زبان کے ساتھ اس کے ہاتھ بھی چلتے جب گلناز کو مار مار کے تھک جاتی تو بیدم ہو کر گر پڑتی اور پھر اتنے رکھ رکھاؤ والی خانم رونے لگی۔ دن اسی طرح گزرتے گئے گلناز کا صبر اور خانم کی زیادتیاں بڑھتی گئیں لوگوں کا جھکاؤ اب گلناز کی طرف ہو چلا تھا ایک دن خانم ہانپتی کانپتی کھڑاک سے میرے کوارٹر کا دروازہ بند کرتی آندھی طوفاں کی طرح آئی اور میرے پاس فرش پہ بیٹھ گئی اس کی بادامی آنکھوں میں کم نصیبی کے چراغ جل رہے تھے آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں پھولوں کی طرح کھلا چہرہ سبز اور نیلا ہو چلا تھا ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے کشادہ پیشانی پہ پسینے کے قطرے چمک رہے تھے کھلے بال اس کے گلے میں پڑے تھے۔

”کیا ہوا خانم؟“

میں نے جلدی سے پوچھا وہ تو جیسے بولنا بھول آئی تھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکتی رہی میں نے گھبرا کے اُسے جھنجوڑا کیا ہو گیا

ہے، بولتی کیوں نہیں خانم بول نا۔ اس کے نیلے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرایا اور بدنصیب آنکھیں برس پڑیں وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سسک پڑی خدا نے گلناز کی دعائیں سُن لی ہیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا خدا نے میری دعائیں تو نہ سُنیں مگر میری سوکن کو سرخرو کیا وہ آج جیت گئی ہے۔ بے بسی سے تڑپ کے اُس نے آہوں کو روکا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

میں ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"وہ صرافہ مسکرا مسکرا کے خان کو بتا رہی تھی۔" آنسوؤں کا ریلا ایک دفعہ پھر بہہ نکلا۔

"تم نے کیسے سُن لیا؟"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نے سُنا نہیں جانا ہے۔"

وہ بے بسی سے بولی۔

"تم نے اندازہ لگایا ہے ہو سکتا ہے وہ کوئی اور ہی بات ہو؟"

میں نے تسلی دی۔

"نہیں۔ نہیں وہ کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔"

اس کے چہرے پر بکھرے رنگ گواہی دے رہے تھے

اس کے چہرے پر ایسے رنگ بکھرے ہوئے تھے جو آج تک میرے چہرے پہ کبھی نہیں بکھرے۔ وہ ایک بار پھر رو پڑی۔ میرے دل کو خوشی بھی ہوئی مگر خانم کی کم نصیبی پہ دل دکھا بھی اگر خدا کو منظور ہوتا تو خان کی مراد بھی پوری ہو جاتی اور خانم کا دل بھی نہ ٹوٹتا خانم زرد دھو کر اپنے نصیبوں کو کوستی چلی گئی۔ یہ خبر پوری کالونی میں پھیل گئی اس خبر کے ٹھیک پندرہ دن بعد گلناز واپس وطن چلی گئی اس کے جانے سے خانم کا چہرہ کچھ پرسکون ہو گیا وہ جو خان سے اجنبی ہو گئی تھی ایک دم اس کی اپنی بن گئی خالی گھر میں وہ اور گل زمان رہ گئے مسرتیں ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آ بسیں۔ خوشی میں وہ یوں رنگی گئی جیسے وقت ختم جائے گا جیسے گلناز ہمیشہ وطن ہی میں رہے گی وہ بھول گئی کہ گلناز کچھ عرصہ بعد ایسی دولت لے کر آنے والی ہے جس کے لئے گھر کے دروازے بھی منتظر ہیں وہ فراموش کر بیٹھی کہ گلناز گھر میں ایسا چراغ لائے گی جس سے گل زمان کے سونے دل میں روشنی ہی روشنی کرنیں ہی کرنیں سمٹ آئیں گی۔ خوشی کے لمحے گزرتے دیر نہیں لگتی گلناز اپنی ساس کے ساتھ واپس آئی اس دفعہ خان کی دو بہنیں بھی ساتھ تھیں گلناز کی گود میں چاند کا ٹکڑا تھا گول مٹول

سُرخ و سفید رنگت والا بادامی آنکھوں والا شہباز خان ہو بہو گلناز کی تصویر تھا گلناز کے چہرے پہ تخلیق کا نور تھا وہ طنزیہ نگاہوں سے سوکن کی طرف دیکھتی اور خانم کا چہرہ دھواں دھواں ہو جاتا خان نے اس پُرمسرت موقع پہ کالونی والوں کو دعوت دی دعوت والے دن خانم بہت ہی کمزور تھکی تھکی نظر آئی رفاقت کا وہ چند روزہ خواب ٹوٹ چکا تھا خانم اس کی تعبیر بن کے بکھر گئی اس کی رنگت زرد اور آنکھوں تلے سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے دعوت سے فارغ ہو کر خان کی ماں اور بہنیں واپس جانے لگیں خانم ملگجے لباس اور بکھرے بالوں کے ساتھ لٹی لٹی قہوے کی خالی پیالیاں سمیٹ رہی تھی ساس کو جاتے دیکھ کر گلناز نے بلند آواز سے کچھ کہا برتنوں والی بڑے خانم کے ہاتھوں سے گر پڑی وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اس کی سانس اکھڑنے لگی یوں لگا جیسے اس پہ نزع کا عالم طاری ہو گیا ہو اس نے ویران آنکھوں سے ساس کی طرف دیکھا آنسو ان بادامی آنکھوں میں جامد ہو گئے خان سر جھکائے کھڑا تھا خانم تھکے قدموں سے گل زمان کے پاس جا کھڑی ہوئی اور اس کا بازو پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"گل زمان تو مجھے سہرے باندھ کر لایا تھا میں تیرے ساتھ بھاگ کر نہیں آئی اگر خدا نے مجھے اولاد نہیں دی تو اس میں میرا قصور نہیں یہ تو سب خدا کی دین ہے خان... وہ چند لمحے رکی گل زمان کی آنکھیں شدت ضبط سے سُرخ ہو گئیں۔ خانان۔ زندگی کا بھروسہ نہیں جہاں مجھے اتنا عرصہ برداشت کیا ہے چند دن اور سہی زخمی سی التجا کرنے کے بعد وہ کھوکھلے درخت کی طرح خان کے پاس ڈھیر ہو گئی ماں بہن کی پرواہ کئے بغیر اس نے خانم کو بانہوں میں اٹھا کے سہارا دیا اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"ماں جی جب تک میں زندہ ہوں خانم میرے ساتھ رہے گی، اگر اس کا دل چاہے تو یہ آپ کے ساتھ وطن جائے گلناز اُسے گھر بدر نہیں کر سکتی۔"

گلناز نے شعلہ برساتی نگاہوں سے خان کو دیکھا ماں بہنیں وطن واپس چلی گئیں دو دن سکون سے گزرے خانم پھر نہ سنبھل سکی دن بدن لاغر ہوتی گئی دل کا روگ اُسے اندر ہی اندر ختم کر رہا تھا ابھی خان کی ماں کو گئے تیسرا دن تھا خان مل چلا گیا اور گھر میں لڑائی شروع ہو گئی حیرانی کی بات یہ کہ آج گلناز بلند آواز میں لڑ رہی تھی خانم تھکے تھکے جواب دیتی رہی میں خانم کو بلانے چلی ہی خانم فرش پہ بیٹھی رو رہی تھی گلناز منے کو کندھے سے لگائے برآمدے میں ٹہل رہی تھی میں نے خانم کو ساتھ لیا اور واپس چلا

سے نکلتے ہی گلناز کے قہقہے سُنائی دیئے وہ خانم کو نکال کے خوش ہو رہی تھی گھر آ کے میں نے خانم کو بٹھایا تسلی دی لڑائی کی وجہ پوچھی خانم شدت سے رو پڑی اور روتے روتے بتایا گلناز ہر لمحہ اُسے بانجھ ہونے کے طعنے دیتی ہے گھر چھوڑنے کے لئے کہتی ہے خانم دکھ سے بولی۔

”جس چوکھٹ پہ میں نے اتنے برس گزارے ہیں اب اُسے چھوڑ کر کہاں جاؤں وطن چلی جاؤں تو لوگ کیا کہیں گے جس نے زندگی دی تھی کیا موت اِسی کے ہاتھوں سے نہیں آ سکتی۔ لوگ تو ملازموں کا بھی لحاظ کر لیتے ہیں میں نے بھی چوبیس سال خان کے ساتھ گزارے ہیں کیا میرا اِس گھر پہ اتنا حق بھی نہیں کہ میں زندگی کے سانس پورے کر سکوں؟ خانم روتی رہی دل کی بھڑاس نکالتی رہی اِس کی آنکھوں میں دحشت ناچنے لگی۔ شام تک وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی خان بِل سے واپس آیا تو وہ گھر گئی۔

سردیوں کی رات تھی سرِ شام ہی لوگ فارغ ہو کے کمروں میں جا بیٹھے کالونی پہ سناٹے کا راج تھا تقریباً آدھی رات کو اچانک شور سے میری آنکھ کھل گئی گلیوں میں بھاگنے کی آوازیں آ رہی تھیں خانم کے گھر میں کہرام برپا تھا میں بھی جلدی سے اُٹھ کر دیوار پہ جا کھڑی ہوئی میں نے دیکھا خان دیوانوں کی طرح باورچی خانے کے دروازے سے ٹکریں مار رہا تھا روشندان سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے تھے کوارٹر میں خانم کی چیخیں اور کراہیں گونج رہی تھیں ذہن میں ایکدم سمجھا کہ ہوا خانم نے خودکشی کر لی۔ خانم نے آگ لگا لی لوگوں نے گل زمان کو ہٹا کے دروازہ توڑ دیا۔ خانم شعلوں میں لپٹی دیوار کے پاس بیٹھی تھی خان نے دیوانگی میں اُسے اُٹھایا اور صحن میں چارپائی پر ڈال دیا کمبل اِس پہ ڈال کے وہ پانی لینے بھاگا اِس وقت خانم آخری سانسیں لے رہی تھی اِس کی بادامی آنکھیں پگھل کر بہہ رہی تھیں اِس کے خوبصورت ہاتھ جل کر راکھ ہو گئے تھے خان نے پانی اِس کے منہ سے لگایا خانم نے آخری سسکی لی اور اِس کی باہنوں میں دم توڑ دیا چوبیس سال ایک ہی چوکھٹ پہ گزار کے وہ جھکی گردن سے وطن واپس جانا نہ چاہتی تھی۔ گلناز کے طعنے شعلوں کی طرح اِس کے وجود کو جلاتے رہے وہ اِن شعلوں کی نذر تو ہو گئی مگر مرتے مرتے بھی اپنی بات پوری کر گئی جس سے زندگی کا مفہوم سمجھا تھا مری بھی اسی کی باہنوں میں خدا نے اُسے موت خان کے ہاتھوں میں دی اور یہی اس کی عین خواہش تھی۔

ہر آنکھ اشکبار تھی ہر دل رو رہا تھا۔ لوگ اب بھی خانم کو یاد کرتے ہیں گو اِس واقعہ کو گزرے چار سال بیت گئے ہیں خان راتوں کو اُٹھ کر دیوانہ وار اُسے آوازیں دیتا ہے۔ مگر وہ تو ایسی منزل پہ جا چکی ہے جہاں سے کوئی کبھی واپس نہیں آتا۔ اب گلناز کے پاس دو بیٹے ہیں وہ گھر پہ راج کرتی ہے مگر خان کو چپ لگ گئی ہے۔ وہ خاموش ہو گیا ہے جیسے بولنا بھول گیا ہو گلیوں میں یوں سر جھکا کر چلتا ہے جیسے خانم کا مجرم وہی ہو۔

ماں

تنویر اختر

سچی کہانی

"ماں" کتنا پیارا کتنا مقدس لفظ ہے ممتا سے بھرپور ماں کا دوسرا نام محبت ہے پھر نہ جانے کیوں یہ دنیا والے ماں کے ساتھ سوتیلی اور حقیقی کی تو منیع پیش کرتے ہیں،

یہ وہ سوال تھا جو شہوار کے دل میں اس وقت سے گردش کر رہا تھا جب سے اس کو یہ پتہ چلا تھا کہ اس کی ماں حقیقی نہیں ہے بلکہ اس کی ماں تو اس کو جنم دینے کے فوراً بعد ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھی اور اس کے باپ نے خاندان والوں کے بے حد زور دینے پر نہ چاہتے کے باوجود دوسری شادی کر لی تھی ان کا خیال تھا کہ سوتیلی ماں ان کی بیٹی کو ماں کا حقیقی پیار نہ دے سکے گی لیکن اماں کے مسلسل اصرار سے تنگ آ کر انہوں نے رضیہ سے شادی کر لی۔

رضیہ جو ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی جہاں بہن بھائیوں کی ہر وقت کی چیخ پکار رضیہ جیسی نازک مزاج رکھنے والی لڑکی کو ناگوار گزرتی تھی اس گھر میں آنے کے بعد تو رضیہ کو جیسے دونوں جہاں کی دولت مل گئی جہاں نہ بچوں کا شور تھا اور نہ ماں کی جھڑکیاں یہاں صرف وہ تھی اس کا اقبال اور ننھی شہوار۔

رضیہ نے شہوار کو کبھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قدرت نے ان کو اولاد سے محروم کر رکھا تھا اور رضیہ کی تمام تر توجہ کا مرکز صرف اور صرف شہوار تھی لیکن شہوار ان تمام باتوں سے بے نیاز صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کی امی اس کو ہر چیز سے زیادہ پیار کرتی ہیں اور اس کی خوشی کی خاطر دنیا بھر کی چیزیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر سکتی ہیں۔

پیار کے جھولے میں ہلکورے لیتے لیتے شہوار کا بچپن بیت گیا اور وہ تیزی سے تعلیمی مدارج طے کرتی رہی وہ انگلش میں ایم اے کر رہی تھی عام طلبہ کی طرح وہ بس میں نہیں بلکہ اپنی کار ایک شان بے نیازی کے ساتھ ڈرائیو کرتی ہوئی یونیورسٹی جاتی تھی اس کی ساتھی لڑکیاں اس کی پھولوں جیسی زندگی کو بے انتہا رشک کی نظر سے دیکھتی تھیں عام مشرقی گھرانوں کی طرح شہوار کے مقصد سے گھر سے نکلنے میں لڑکیوں پر سختی نہیں کی جاتی تھی اس لئے شہوار پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی وہ ہر جگہ آ جا سکتی تھی صرف اپنی امی کو اطلاع دینا اس کا کام تھا اجازت کسے کہتے ہیں وہ نہیں جانتی تھی۔

بلکہ بعض اوقات تو اسے یہ لفظ بالکل بے معنی لگتا تھا اسے بڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا اگر وہ سنتی کہ اس کی فلاں سہیلی کو پکچر یا کسی اور جگہ پر جانے کی اجازت نہ ملی اس روز بھی یہی ہوا تھا جب یونیورسٹی پہنچ کر اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ کا صدر پاکستان ٹور پر جانے والے لڑکے اور لڑکیوں کی فہرست بنا رہا ہے وہ خوش خوش اپنا نام لکھوانے آگے بڑھی مگر اگلے ہی لمحے اس کی ساری خوشی بھک سے اڑ گئی جب اسے پتہ چلا کہ اس کی سہیلی کو گھر سے ٹور پر جانے کی اجازت نہیں ملی اس نے بھی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا مگر اپنی امی پر بے انتہا پیار آیا جو اس پر مکمل اعتماد کرتی تھیں اور اس کی خوشی کا خیال رکھتی تھیں۔

اسی طرح کے بہت سے واقعات روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہے جو اس کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے کہ "ماں" صرف "ماں" ہوتی ہے سگی اور سوتیلی کی کوئی تمیز نہیں۔

اس کی ماں بھی تو سوتیلی ہے مگر اتنا چاہتی ہے کہ کیا کوئی سگی ماں اپنی بیٹی کو چاہے گی۔

یہ خیال جب بھی اسے آتا اس کے دل میں بھی اپنی ماں کی چاہت شدید ہو جاتی اور وہ دل ہی دل میں اپنی ماں کی عظمت کو سراہتی۔

زندگی کا کارواں وقت کے سہارے تھوڑا اور آگے بڑھ گیا۔

اور شہوار ایم اے کر کے گھر بیٹھ گئی اب اس کی امی کو اس کی شادی کی فکر ہوئی اور تب ہی کئی رشتوں میں سے انہوں نے چند مناسب رشتوں کے بارے میں شہوار کو تفصیلات بتا دیں اور ساتھ ہی تصویریں بھی دے دیں تاکہ وہ انتخاب کر سکے تب شہوار نے اقبال کا انتخاب کیا جن کی پہلی بیوی وفات پا چکی تھیں اور اپنی نشانی ہمایوں کی صورت میں چھوڑ گئی تھیں اقبال کو اپنے ہمایوں کے لئے ایک ماں چاہیے تھی جو اسے صحیح تربیت دے سکے اور اقبال کی امی شہوار کے لئے اسی لئے آئی تھیں کہ اس نے بھی ایک سوتیلی ماں کے ہاتھوں پرورش پائی تھی اور صورت و سیرت دونوں میں یکتا تھی اخلاق و تعلیم کے زیور سے آراستہ تھی اور ان کو امید تھی کہ وہ ہمایوں کی پرورش بھی اسی انداز میں کرے گی۔

اور یوں شہوار وداع ہو کر اقبال کے گھر آ گئی جہاں نئی زندگی اس کی منتظر تھی اور قدم قدم پر نئے امتحان تھے مگر اس نے تو جان بوجھ کر خود کو اس آزمائش میں ڈالا تھا اس لئے ذرا گھبرائی ہوئی نہ تھی اس نے ہمایوں کو حقیقی ماں کا پیار دیا اور اقبال کی رفاقت کا حق بھی بخوبی ادا کیا۔ اقبال اسے پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہو جاتا جو حسن میں چاند تھی تو عظمت میں سورج۔

ان ہی دنوں ایک شب شہوار نے اقبال کو بتایا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے اقبال نے اس خبر کو سن کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگا ہمایوں اب بھی شہوار کے دل کا چین تھا اور اب بھی اسے بہت پیارا تھا وہ خوش خوش زندگی کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی کہ وقت کے ظالم ہاتھ نے اسے اس نشہ سے بیدار کر دیا اور اس کی خوشیاں چھین لیں اقبال جو اسے خدا حافظ کہہ کر صبح آفس گیا تھا اسے خبر نہ تھی کہ اسے خدا کے حوالے کر کے ہمیشہ

کے لئے اس سے دور جا رہا ہے وہاں جہاں جا کے کوئی واپس نہیں آتا چاہے کوئی بین کر کر کے مر جائے اقبال بھی شہوار، ہمایوں اور آنے والے بچے کو خدا کے بھروسے پہ چھوڑ کر قبر کی گہرائیوں میں جا سویا۔

وقت کب کسی کے لئے رکا ہے وقت کا پنچھی ہمیشہ پر پھیلائے مائل بہ پرواز رہتا ہے اور وہ چند مہینوں کے بعد اس کی گود میں نوید کھیل رہا تھا اسے نوید سے بے اندازہ پیار تھا جتنا اس نے شاید ہمایوں سے بھی نہ کیا تھا اقبال کی والدہ بھی بیٹے سے جا ملیں اور یوں شہوار اپنے دو بچوں کا بوجھ لئے تنہا رہ گئی گھر کی گاڑی دھکیلنے کو اس نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی وہ بچوں کے لئے زندہ تھی اسکول سے واپسی کے بعد اس کا سارا وقت بچوں کے ساتھ گزرتا تھا پہلے اس کی محبت کا حقدار صرف ہمایوں تھا مگر اب محبت تقسیم ہو گئی تھی نوید بھی اس پیار میں شامل تھا اور شاید شہوار بھی اسے ہمایوں سے زیادہ پیار کرتی تھی لیکن ہمایوں نے یہ کب دیکھا تھا وہ لاشعوری طور پر نوید سے جلنے لگا اور اسے جب بھی موقع ملتا وہ نوید کو مارنے سے نہ چوکتا اور جواباً شہوار اسے مارتی۔ اور یونہی چھوٹی موٹی جھڑپوں میں ڈھیر سارے دن بیت گئے۔

شہوار کی محدود آمدنی میں گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ اس کے بچے بھی اب بڑے ہو گئے تھے اور ظاہر ہے کہ تعلیمی اخراجات کے لئے خاصی موٹی رقم چاہیے تھی اپنی آمدنی کے پیش نظر شہوار نے دونوں کو ایک معمولی اسکول میں داخل کرا دیا جہاں پر ٹیوشن فیس صرف پچیس روپیہ تھی اس کا دل چاہتا وہ اپنے نوید کو کسی اچھے اسکول میں داخل کرائے صرف امیروں کے بچے پڑھتے ہوں لیکن ایسے اسکولوں کی فیس پچاس روپیہ سے کسی طرح کم نہ تھی پھر کتابیں کاپیاں اور دیگر اخراجات شہوار کی محدود آمدنی میں یہ سب کچھ ممکن نہ تھا۔

اور

یہی وہ لمحہ تھا جب ہمایوں اسے نوید کے بہتر مستقبل کی راہ میں رکاوٹ نظر آیا وہ سوچنے لگی کہ اگر ہمایوں نہ ہوتا تو وہ نوید کو کسی اچھے اسکول میں تعلیم دلوا سکتی تھی۔

دوسرے ہی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا ہمایوں کو یتیم خانے میں داخل کرانے کا فیصلہ۔ اور اسی فیصلہ کے ساتھ ہی اس کو اپنے بچپن کے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

میں کبھی نہ بھولوں گی

شرمندگی

یہ شاید ہم کبھی نہ بھول سکیں کہ ہمارے کیبن کے نیچے تین کیبن اور ہیں جن میں اچھے خاصے لوگ رہتے ہیں ہم نے اور ہمارے شوہر نامدار نے یہ طے کیا کہ رات کو کھانے کے بعد اپنے کیبن ہی میں ٹہلا ضرور کریں گے باہر برف باری ہو رہی تھی۔ اچانک انہیں ٹہلتے ٹہلتے ایک دن جانے دل میں کیا خیال آیا کہنے لگے دیکھو پکچرز میں جب کسی کو فکر میں ڈوبا یا پریشان دکھاتے ہیں تو وہ یوں ٹہلتا ہے اور فرضی سگریٹ ہاتھ میں لے کر ٹہلنے لگے ہم نے دیکھا تو کہا یوں تھوڑی ایسے ٹہلتے ہیں۔ ہم لوگ جلدی جلدی ٹہل ٹہل کر ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔ پھر ہم دونوں کی ٹکر ہونے والی تھی تو ہم بھاگ کر ڈرے روم میں آ گئے پھر انہوں نے کہا کہ اس طرح سگریٹ ہاتھ میں لیا جاتا ہے اور پھر جوتے تلے کچل دیا جاتا ہے پھر ہم لوگ مختلف لوگوں کی مختلف اوقات میں چلنے کے اندازوں کی نقل بنانے لگے ابھی ہم لوگ یہی کر رہے تھے کہ نیچے والے دو صاحبان گھبراتے ہوئے اوپر پہنچے اور کہنے لگے کیوں صاحب خیر تو ہے، ایک صاحب گھبرا گھبرا کر بولے کہ خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی تو نہیں ہو گئی ہے۔ جو آپ لوگ سامان ادھر ادھر گھسیٹ رہے ہیں کبھی اٹھا رہے ہیں کبھی رکھ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا شرمندگی ہوئی وہ الگ لیکن جب ان لوگوں کو بتایا تو سب مل کر اتنا ہنسے کہ مزید ہنسنے کا دم بھی نہیں رہا تھا۔

شہلا پرویز۔ ہانگ کانگ

نصیحت

یوں تو دنیا میں کئی واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو کہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں میری ایک عادت ہے جو کہ باوجود ختم کرنے کے ختم نہیں ہوتی ہے وہ یہ کہ مجھے گھر میں چوری چھپے گھر کی چیزیں کھانے کی عادت ہے۔ گھر میں جو چیز آئے گی میرا حصّہ تو مجھے مل جائے گا۔ مگر بعد میں وہاں سے وہی چیز میں چوری سے کھا لوں گی۔ یہاں تک کہ اپنے چھوٹے بھائی نونی کی ملائی بھی ہضم کر لوں گی اپنے بھائی کی تو بات الگ ہے اگر کسی بچے کے ہاتھ میں بسکٹ بھی ہو تو وہ چھین کر منہ میں لے جاتی ہوں۔ اُبلتی ہوئی ہانڈی میں بھی ضرور ہاتھ ماروں گی۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے ہمارے گھر گوشت پکا اور امی کسی کام سے باہر نکل گئیں میں نے موقع جانا اور جلدی سے گرم گرم ہانڈی سے گوشت کی بوٹی نکال کر منہ میں ڈال لی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے منہ میں چھالے پڑ گئے اور میں کھانے کے لئے منہ کھولتی تھی تو تکلیف سے کراہ اٹھتی تھی اس دن کے بعد میں نے چوری چھپے چیزیں کھانا چھوڑ دی ہیں۔

زرینہ بلوچ کوئٹہ۔

احترام

ماہِ رمضان میں میرا ڈاکٹر کے یہاں جانا ہوا وہاں ایک پارسی عورت اپنی بیٹی کو لے کر آئی ہوئی تھی جو کہ سخت بیمار تھی اور بار بار اپنی ماں سے پانی مانگ رہی تھی پہلے تو وہ انکار کرتی رہی لیکن جب لڑکی کا اصرار بڑھا تو تنگ آ کر وہ بولی کہ یہاں سب عورتیں روزہ دار ہیں تم ان کے سامنے پانی پیو گی۔ روزہ کا احترام کرنا چاہیے اس کے منہ سے یہ سُن کر میں چونک گئی کہ ایک پارسی عورت کے یہ خیالات ہیں اور ہم مسلمان ہو کر روزے کی اہمیت پر کوئی توجہ نہیں دیتے ایک دوسرے کے سامنے کھانا پینا کوئی معیوب نہیں سمجھتے میں نے اور دوسری عورتوں نے اُسے سمجھایا کہ ہمارے مذہب میں اتنی سختی نہیں ہے آپ اُسے پانی پلائیں تب جا کر اس عورت نے اپنی بیٹی کو پانی پلایا اگر ہم مسلمان بہن بھائی اس واقعہ کو غور سے پڑھیں تو یہ واقعہ ہمارے لئے بڑا ہی سبق آموز ہے اور میں تو کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔

کوثر پروین نصیر حیدرآباد

ہائے رے فیشن

ہم لوگ حیدرآباد گئے ہوئے تھے ایک دن بھائی جان نے کہا چلو تم لوگوں کو پکچر دکھاؤں ہم لوگ جھٹ تیار ہو گئے میں اور میری کزنز ہم سب لوگ بھائی جان کے ہمراہ کو فوراً پکچر ہاؤس پہنچ گئے بھائی جان نے ہم سے کہا تم لوگ ایک طرف کھڑی ہو جاؤ میں ابھی ٹکٹ لے کر آتا ہوں کیونکہ ادھر رش بہت ہے ہم لوگ ایک کارنر میں کھڑے ہو کر باتوں میں مصروف ہو گئے جب گھڑی پر نظر دوڑائی تو بھائی جان کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اور پکچر شروع ہونے میں بھی چند منٹ باقی تھے۔ اب تو ہم بڑے پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں۔ بھائی جان نجانے کہاں چلے گئے اسی پریشانی کے عالم میں ہم نے نظریں ادھر اُدھر دوڑانی شروع کیں یکایک میری نظر ایک جگہ جا کر ٹک گئی کیونکہ وہ تو بھائی جان تھے جو ہم سے کچھ ہی فاصلے پر پیٹھ موڑے کھڑے تھے وہی بلیک پینٹ اور لائٹنگ شرٹ میں ملبوس یہ یقیناً بھائی جان ہی تھے۔ مگر ان کے ساتھ ایک لانبی سی لڑکی گلابی میکسی میں ملبوس کھڑی تھی۔ اب تو ہم بڑے پریشان یا الٰہی یہ لڑکی کون ہے جو اس قدر بے تکلفی کیسا تھ کھڑی ہے۔ ہم لوگ اللہ کا نام لے کر چل پڑے قریب پہنچتے ہی شگفتہ نے جلدی سے کہا تو بہ ہے بھائی جان آپ یہاں کھڑے ہیں اور ٹکٹ کا کیا بنا۔ ؟ ابھی الفاظ پورے بھی نہ ہونے پائے کہ وہ دونوں ہماری طرف مڑیں۔ جی ہاں وہ دونوں لڑکیاں تھیں جسے ہم بھائی جان سمجھے تھے۔ وہ محترمہ تھیں جو بالکل وہی لباس بلیک پینٹ اور لائٹنگ شرٹ میں ملبوس تھیں ہم لوگ بہت نادم ہوئے۔ اور ان سے معذرت کر لی۔ اور دل ہی دل میں فیشن کو بے نقطہ سنا ڈالیں اسی فیشن سے آج کل لڑکے اور لڑکی کی تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے ہم لوگ ہنستے ہوئے واپس آ گئے اتنے میں بھائی جان آتے دکھائی دیئے ہم نے انہیں بھی سارا قصہ سنایا وہ بھی خوب ہنسے اب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

آنسہ شفق رحمٰن بہاولپور

قانون کے محافظ

یہ واقعہ ہمارے ایک عزیزہ کے ساتھ پیش آیا آپ ان کی زبانی سنیئے گرمی کی شدت اب کم ہو رہی تھی شام کے تقریباً چار بجے تھے مجھے کچھ چیزیں خریدنی تھیں اس لئے میں بازار چل پڑا رکشہ لیا اور شہر روانہ ہو گیا ابھی آدھا فاصلہ ہی طے کر پایا تھا کہ ایک موڑ پہ کافی ہجوم لگا دیکھا کچھ لوگوں سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ٹانگے والے کے گھوڑے بگڑ گئے ہیں آگے جاتے ہیں نہ پیچھے بیچارا ٹانگے والا بڑا پریشان ہو رہا تھا آخر کیا کرے اتنے میں ایک پولیس انسپکٹر اسکوٹر پر آیا اور جب اس نے دیکھا کہ ایک غریب ٹانگے والے کی وجہ سے ساری ٹریفک رکی ہوئی ہے تو اسے بڑا غصہ آیا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چابک لے کر غریب ٹانگے والے کو خوب مارا وہ بار بار کہتا صاحب میرا کیا قصور جانور ہے بگڑ گیا مگر اس نے ایک نہ سنی مجھے بڑا غصہ آیا میں نے بڑھ کر چابک چھین تو اُسے غصے سے کہا آخر تم کون ہوتے ہو چابک چھیننے والے میں نے کہا میں انسان ۔ اور انسان یہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تم بھی ایک انسان ہو اور یہ غریب ٹانگے والا بھی فرق صرف اتنا ہے کہ یہ ایک غریب شہری ہے اور تم قانون کے محافظ اس پر وہ مجھے تھانے لے گیا تقریباً دو گھنٹے کے بعد اس نے مجھے چھوڑ دیا مگر میں آج تک سوچتی ہوں کہ اگر قانون کے محافظ ہی ایسا ظلم کرنے لگے تو غریب شہری کا کیا حال ہوگا۔ یہ واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

صبیحہ صبا

ترتیب: شگفتہ محمود

رنگا رنگ

کچھ شعر، لطیفے، واقعات، اقتباسات

غم مشترک

میرے باغ میں دو پنجرے ہیں ایک میں ایک شیر قید ہے جسے میرے باپ کے غلام نینوا کے جنگل سے پکڑ کر لائے تھے دوسرے پنجرے میں ایک چڑیا ہے جو گانا نہیں جانتی یہ چڑیا ہر صبح کو بیدار ہوتے ہی شیر سے کہتی ہے۔
"قیدی بھیا، صبح بخیر۔"

تخلیق خلیل جبران

ارم گل۔ بہاولنگر

واقعہ

مشہور سائنسدان آئن اسٹائن ایک دفعہ بس میں سفر کر رہے تھے وہ کچھ ضروری کاغذات بس میں پڑھنا چاہتے تھے کاغذات نکالے تو انہیں یاد آیا کہ عینک تو گھر پر ہی بھول آئے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے مسافر سے درخواست کی کہ از راہ کرم یہ کاغذ پڑھ دیں۔
اس پر مسافر نے جل کے کہا۔ "معاف کیجئے"
"میں بھی آپ ہی کی طرح جاہل مطلق ہوں۔"

زاہدہ لاج فیصل آباد

فیشن

افریقہ میں لڑکیاں عجیب و غریب فیشن کرتی ہیں وہ سامنے کے دو دانت تر شوا کر نوکیلے بنوا لیتی ہیں آنکھوں کے گرد حلقے بنا لیتی ہیں اور چہرے پر گول اور چوکور دائرے بنا لیتی ہیں جو ان کو بہترین طور پر تخیل تک پہنچاتی ہیں وہ زیادہ "خوبصورت" اور "فیشن ایبل" تصور کی جاتی ہیں۔

آنسہ شفق رحمٰن بہاولپور

قدرتی گھڑی

ہندوستان میں دریائے گنگا کے کنارے ایک پودا ہے جس کے پتے باقاعدگی سے ایک ایک منٹ میں ۶۰ مرتبہ حرکت کرتے ہیں گویا یہ پودا ایک قدرتی گھڑی ہے جو بغیر کسی کمی بیشی کے خاموشی سے ٹھیک ٹھیک وقت بتاتی ہے اس پر نہ موسم کا اثر ہوتا ہے اور نہ ہوا کی تیزی سے اس کی مقررہ حرکت میں کوئی فرق آتا ہے۔

شمیم مصطفیٰ لانڈھی

دنیا کے سات عجائبات

اہرام مصر:۔ مصر میں واقع چار مینار ہیں جو آج سے چھ ہزار سال قبل تعمیر کئے گئے تھے۔
تاج محل:۔ آگرہ میں واقع ہے شاہ جہاں نے سترھویں صدی میں تعمیر کروایا تھا۔
مقبرہ مسولیس:۔ یونان میں ۳۵۰ قبل مسیح بنایا گیا۔
جوپیٹر کا مجسمہ:۔ ۵۰۰ ھ یونان میں اولمپیا کے مقام پر واقع ہے ۵۰ ھ قبل مسیح تعمیر کیا گیا۔
بابل کے معلق باغات:۔ اٹلی میں ۳۲۵ فٹ اونچی اور ۵۰ فٹ چوڑی دیوار پر ۶۰۰ قبل مسیح بنایا گیا۔
ڈویا تا دیوی کا مندر:۔ سنگ مرمر سے تعمیر شدہ مندر جو ایشیائے کوچک میں واقع ہے ۳۳۶ ئیں بنایا گیا۔
روڈز کا مجسمہ:۔ سورج دیوتا کا اپالو مجسمہ تھا جو بحیرۂ روم میں بندرگاہ پر بنا ہوا تھا۔ زلزلے سے تباہ ہو گیا۔

عینی طفیل کراچی

واقعہ

کسی گھوڑ دوڑ میں ایک مصری نے کہا "واللہ میرا گھوڑا آگے ہے۔" قریب ہی گورنر مصر کا ایک بیٹا بھی گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اس نے مصری کے کہنے پر ایک طمانچہ مارا اور کہا "لو ایک شریف زادہ کا ایک طمانچہ" اس مصری نے مدینے پہنچ کر خلیفہ سے شکایت کی۔ خلیفہ نے گورنر اور اس کے بیٹے کو مدینے طلب کیا۔ جب وہ آ گئے تو مصری کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور کہا۔ "مار اس شریف زادے کو۔" جب وہ لڑکے کو مار چکا تو کہا "اب یہی کوڑا باپ کے سر پر گھما اس لئے کہ اس نے جو طمانچہ مارا تھا وہ محض اپنے باپ کی حکومت کے گھمنڈ میں مارا تھا۔" پھر آپ نے گورنر سے کہا "تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا۔ حالانکہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتے تھے۔"

اہم معلومات

- سورج کی روشنی زمین پر ۸ منٹ میں پہنچتی ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ سونا شمالی افریقہ میں ہوتا ہے
- انقرہ کا قدیم نام انگورہ تھا۔
- ریڈیو ایسی مشین جس کا چلتے وقت کوئی پرزہ حرکت نہیں کرتا۔

روبینہ مریم

ترکیب

ایک ماہر نفسیات کو روتا ہوا بچہ بہلانا پڑا۔ ماہر نفسیات نے بچے کو چپ کرانے کے لئے کتابوں میں سے ترکیب ڈھونڈنی شروع کر دیں۔ بچے کی دادی جو قریب ہی بیٹھی تھی بولی "بیٹا! اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو کتابوں کے بنڈل اٹھانے کی بجائے بچے کو گود میں لے لیتی۔ ماہر نفسیات اتنی سادہ آسان ترکیب سن کر بھونچکا رہ گیا۔

شفق رحمن

آپ کی آنکھوں کی رنگت آپ کے راز افشا کر دیتی ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کی آنکھیں آپ کے متعلق کیا کہتی ہیں۔

دو امریکی ماہرین نے اس سلسلے میں قابل قدر تحقیقات کی ہیں ان کا کہنا ہے کہ آپ کی آنکھوں کی رنگت آپ کی شخصیت کے بارے میں خاطر خواہ معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اور آپ کے راز افشا کر دیتی ہیں۔

- بالکل سیاہ آنکھوں کا مالک گرم مزاج اور من موجی ہوتا ہے۔
- نیلے رنگ کی آنکھوں کے مالک افراد ثابت قدم اور پختہ ارادوں کے مالک ہوتے ہیں۔
- سبزی مائل بھورے رنگ کی آنکھوں کے مالک افراد کی شخصیت انتہائی مستحکم ہوتی ہے اور وہ خاصے ہوشیار ہوتے ہیں۔
- جن افراد کی آنکھیں ہلکے بھورے رنگ کی ہوتی ہیں وہ ملنسار اور قدرے خود غرض ہوتے ہیں۔
- خاکستری (ہلکا بھورا) رنگ کی آنکھوں والے حضرات قوت ارادی کے مالک اور باہمت ہوتے ہیں۔
- گہری بھوری یا سیاہی مائل سرخ رنگت کی آنکھوں والے بات بات پر جھلا جاتے ہیں سلام کرنے پر بھی کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ اپنے ارادوں میں اس قدر ثابت قدم ہوتے ہیں کہ چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے اپنے ارادے میں تبدیلی نہیں ہونے دیتے بہت ہی ضدی ہوتے ہیں۔

جب میں تنہا رہ گیا تو پھر ایثار کس کے لئے؟

دس درویش جنگل میں سفر کر رہے تھے کہ راستہ بھول گئے سفر کٹھن تھا اس لئے کچھ دیر ستانے کے لئے بیٹھے تو پیاس نے ستایا صورت حال یہ تھی کہ ان کے پاس صرف ایک قدح پانی تھا اور دس پیاسے تھے۔ چنانچہ جب ایک کو قدح آب دیا جاتا تو بغیر ایک گھونٹ لئے دوسرے کی طرف بڑھا دیتا۔ اس طرح پیالہ مختلف ہاتھوں میں گھومتا رہا اور پانی کسی نے نہ پیا نتیجہ یہ نکلا کہ شدت پیاس سے نو درویش ہلاک ہو گئے جو درویش بچ گئے تھے انہوں نے جب دیکھا کہ ان کے رفیق خالق حقیقی سے جا ملے ہیں تو وہ قدح پی لیا۔

اور راستہ طے کرنا شروع کر دیا گھومتے گھومتے ایک شہر میں پہنچے جہاں ایک شناسا سے ملے تو پورا واقعہ سنایا۔ شناسا نے کہا "اگر وہ پانی تو بھی نہ پیتا تو بہتر تھا۔" انہوں نے کہا "عقلمند! کیا تجھے نہیں معلوم کہ نو آدمیوں کے مرجانے کے بعد بھی اگر میں وہ پیالہ نہ پیتا تو خودکشی کا مجرم بنتا" وہ کہنے لگا۔ "آپ کے خیال میں وہ نو آدمی بھی خودکشی کے مجرم ہوتے" جواب دیا "نہیں" اس لئے کہ وہ ایثار کر رہے تھے اپنی حاجت کے مقابلے میں دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے یہاں تک کہ ایثار کرتے کرتے ہلاک ہو گئے پھر جب میں تنہا رہ گیا تو کس کے لئے ایثار کرتا۔ اس لئے ایسے موقع پر مجھے وہ پانی پینا واجب تھا۔"

افشاں سہیل اکرام تنکار پور

شمع حیات

"انسانی زندگی مانند حباب ہے پل میں ابھری اور پل میں ڈوبی اس چھوٹے سے عرصے میں انسان چمکدار نگینہ بھی بن سکتا ہے اور سیاہ کوئلہ بھی۔ وہی بارش کا قطرہ جو سیپی میں بند ہونے سے آبدار موتی بن کر نکلتا ہے غلطی سے دلدل میں گر جائے تو کیچڑ بھی بن سکتا ہے۔"

شعر

وہاں تاریک لمحوں کے عوض سورج کو ٹھکرا دو
جہاں اپنا ضمیر اپنے لئے الزام بن جائے

مسرت نیاز زرآنی کوئٹہ

لطیفہ

خاتون دکاندار سے بولیں۔ "کیا یہ روٹی تازہ ہے۔"

دکاندار نے زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے کہا "بے شک ہماری روٹیاں ایسے شفاف اور واٹر پروف کاغذ میں لپیٹی جاتی ہیں کہ برسوں باسی نہیں ہوتیں۔ "خاتون نے اطمینان کا سانس لیا اور بولیں "مہربانی فرما کر یہ کاغذ ایک سیر تول دیں۔ میرے شوہر ہمیشہ تازہ روٹی کھاتے ہیں۔"

شہلا پرویز ہانگ کانگ

اعتراف

کسی گھریلو تنازعہ میں شوہر نے رائے دی۔

"ہمیں یہ مسئلہ عقل سے حل کرنا چاہیئے۔"
بیوی نے جلدی سے کہا،
"نہیں! اس طرح تم جیت جاؤ گے۔"

عینی طفیل۔ کراچی

بجنے والا پتھر

حال ہی میں امریکہ کی ایک وادی وائٹ ہاؤس میں ایک ایسا پتھر پایا گیا جسے لوگ بجنے والا پتھر کہتے ہیں اس پتھر میں ایک کشادہ سوراخ ہے جس میں پھونک مارنے سے زوردار آواز پیدا ہوتی ہے جو دو میل دور تک سنی جا سکتی ہے۔

دنیا کی عجیب و غریب مچھلی۔

پہلوان مچھلیاں تھائی لینڈ برما اور ملایا میں بکثرت پائی جاتی ہے یہ بڑی خوبصورت اور رنگدار ہوتی ہے اگر ان مچھلیوں کے دو نروں کو کسی ایک بڑے سے برتن میں جس میں پانی بھرا ہوا ہو چھوڑ دیا جائے تو ان میں خوب لڑائی ہوتی ہے اور یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ ان دو نروں میں سے ایک نر بے ہوش نہ ہو جائے لیکن مارنے والے نر کے ساتھ ساتھ جیتنے والے نر کا حال بھی خراب ہو جاتا ہے کسی زمانے میں ان مچھلیوں کی کشتیاں حکومت کی سرپرستی میں ہوا کرتی تھیں۔ اور حکومت کو ایسے مقابلوں سے خوب آمدنی ہوتی تھی۔

شہناز فیضی کراچی

نظمیں غزلیں

تم کو اب کوئی شکایت تو نہیں
یہ مگر ترکِ محبت تو نہیں!
میری آنکھوں میں اُترنے والے
ڈوب جانا تیری عادت تو نہیں
تجھ سے یہ گانے کا غم ہے ورنہ
مجھ کو خود اپنی ضرورت تو نہیں
کھل کے رونوں تو ذرا جی بہلے!
مسکرانا ہی مسرت تو نہیں!
تجھ سے فرہاد کا تیشہ نہ اٹھا
اس جنوں پر مجھے حیرت تو نہیں
پھر سے کہہ دے کہ تری منزل شوق
میرا دل ہے میری صورت تو نہیں
تیری پہچان کے لاکھوں انداز
سر جھکانا ہی عبادت تو نہیں!

پروین فنا سید

جب نظر ڈالی کبھی گزرے ہوئے لمحات پر
اک پتھر سا لگا آکر مرے جذبات پر

روز و شب کی کاوشوں کا ہے فقط یہ مدعا
چھوڑ جاؤں نقش کوئی وقت کے صفحات پہ

جس کے سناٹے میں دو پرچھائیاں باہم ہیں
رونقِ عالم نچھاور اُس اندھیری رات پر

مٹ گئی ہیں بدنصیبی کی لکیریں ہاتھ سے
جب سے ہے اک خواب غالب میرے احساسات پر

عمر بھر کی دوستی شہناز قسمت میں ہوئی
رکھ دیا جب میں نے اپنا ہاتھ تیرے ہاتھ پر

ثمینہ شہناز

شفقت بشیر

مجھ سے مل کے وہ پریشان کبھی ایسے تو نہ تھے
یوں مجھ سے گریزاں کبھی ایسے تو نہ تھے!
جانے کیا بات ہے، اب مجبوریاں ہیں پیش نظر
مجھ سے مل کے پشیماں کبھی ایسے تو نہ تھے!
تھے ہر اک ذکر میں شامل ابھی چند روز پہلے!
آج بنتے ہیں انجان کبھی ایسے تو نہ تھے
یہ کس مقام پہ لایا مرا جنون مجھ کو!!
اپنی ہی ذات سے دست و گریباں کبھی ایسے تو نہ تھے
کس غضب کے چلے آتے ہیں وہ شب کی تنہائیوں میں
مرے درد کا درماں کبھی ایسے تو نہ تھے
آج لٹ گیا شفقت کا شانۂ الفت تمام
نیناں تیرے فروزاں کبھی ایسے تو نہ تھے

نسرین حبا

کبھی ملے تھے جو چہرے گلاب کی مانند
انہی کی یاد ہے دل میں عذاب کی مانند
میں کس کے زخم چنوں اور کس کے دکھ بانٹوں
کہ لوگ مجھ سے چھپے ہیں حجاب کی مانند
ازل کی پیاس لئے دوڑتی ہوں صحرا میں
یہاں کی ریت ہے گویا سراب کی مانند
میں اپنے خواب چنوں یا سمیٹ لوں خود کو
میرا وجود بھی بکھرا ہے خواب کی مانند
یہ آرزو ہے کبھی جب حدیثِ غم میں کہوں
خوشی کی کا نام لکھوں!!! انتساب کی مانند
ہر ایک پل ہی حبا ہے اذیتوں کا سفر
گزر رہی ہوں جہاں سے عذاب کی مانند

پکوان

پپیتے کی آئس کریم

اشیاء

دودھ	دو کلو
پپیتا پکا ہوا اور سخت	دو چھٹانک
بادام پستے	دو چھٹانک
خوشبو پسندیدہ	
چینی حسب ذائقہ	

ترکیب: پپیتے کو چھیل کر بالکل باریک کرلیں دودھ کو اُبال
... جب اس میں اُبال آجائے تو اس میں پپیتا شامل کرلیں اور
... پکائیں اس میں باریک کٹے ہوئے بادام پستے بھی شامل
کرلیں جب یہ گاڑھی ہونے لگے تو چینی اور خوشبو بھی شامل
کرلیں جب یہ اچھی طرح گاڑھی ہوجائے تو اتار لیں ٹھنڈی
ہونے کے بعد ایک تہہ جیلی اور ایک تہہ دودھ کہ آمیزے
کی ڈش میں لگادیں آخری تہہ جیلی کی ہو فرج میں رکھ دیں جمنے
کے بعد کھائیں بہت لذیز آئس کریم تیار ہے۔

فرخندہ نسرین خان ٹنڈوالایار

"مرغ کی بریانی" (آزمودہ)

اشیاء

مرغ ایک عدد

چاول	ایک سیر
دہی	آدھا سیر
پیاز	تین پاؤ
ہری مرچ	ایک چھٹانک

ادرک لہسن حسب ذائقہ لیموں دو عدد تھوڑا سا پودینہ
گرم مصالحہ، نمک اور گھی حسب ذائقہ۔

ترکیب: مرغ کو صاف کرکے دھولیں اور بڑے بڑے ٹکڑے کرلیں اور آدھی پیاز الگ نکال لیں۔ باقی پیاز میں لہسن ادرک اور پودینہ کاٹ کر ڈال دیں اور بھون لیں اب مرغ کی پسی ہوئی پیاز میں ڈال کر اچھی طرح بھون لیں اب اس میں دہی ڈال دیں اور آدھ سیر پانی ڈال کر بھون لیجئے۔ جب گوشت گل جائے تو اسے اتار لیں چاول الگ اُبال لیں چاول نتھار کر اس میں گوشت ڈال دیں اور اوپر براؤن کی ہوئی پیاز گھی اور لیموں کا عرق ڈال دیں بعدازاں دم لگالیں۔ لیجئے مرغ کی بریانی تیار ہے۔

ساجدہ جبیں وارثی "جھڈو"

دودھ کی ٹکیاں

اشیاء

دودھ	ایک سیر
انڈے	دو عدد

نمک مرچ اور سبز دھنیا حسب ضرورت انار دانہ۔

ترکیب: دودھ کو ہلکی آنچ پر اتنا ابالیں کہ اس کا رنگ ہلکا بادامی ہوجائے اس میں لیموں کا رس دو تین قطرے نچوڑ دیں تاکہ وہ پھٹ جائے پھر اس کو ایک باریک کپڑے میں ڈال کر نسبتاً اونچی جگہ لٹکا دیں اس کا پانی قطرہ قطرہ ہوکے نچڑ جائے یہاں تک کہ وہ بالکل خشک کھویا بن جائے جب اچھی طرح پانی سوکھ جائے تو اس کو اتار کر ایک برتن میں اچھی طرح گوندھ لیں اور نمک مرچ اس میں ملالیں۔ سبز دھنیے کو باریک باریک کاٹ لیں اور انار دانے کو سیل پر باریک پیس لیں پھر ان چیزوں کو بھی اس کھوے میں ملا کر گوندھیں یہاں تک کہ سب چیزیں یک جان ہوجائیں انڈوں کو پھینٹ کر الگ رکھ لیں پھر کھوے کی ٹکیاں بنا کر انڈے میں سے ڈبو کر توے پر پکاتی جائیں نہایت لذیز ٹکیاں تیار ہیں سہ پہر کی چائے کے ساتھ بہت مزہ دیتی ہیں۔

ساجدہ ایف۔ کے پشاور

خواتین کی محفل

بہنوں کے سوال

سیدہ ناز ہمدانی

س: اگر میں افسانہ بھیجوں تو آپ حوصلہ افزائی کریں گی؟

ج: ضرور۔

س: میں افسانہ کس طرح بھیج سکتی ہوں؟

ج: رجسٹری کر دیجیے۔

شمیم مصطفےٰ قریشی

س: انسان بھلائی کی طاقت رکھتے ہوئے بھی بھلائی کیوں نہیں کرتا؟

ج: محض اپنی کم ہمتی کی وجہ سے۔

فرزانہ کوثر

س: روٹھی ہوئی عزیز ہستی کو منانے کا طریقہ؟

ج: آپ دوستی کی جانب پہلا قدم اٹھالیں۔

شہناز فیضی

س: زندگی سچائی ہے یا فریب؟

ج: سچائی۔

شازیہ تاج

س: عورت دھوکہ کب کھاتی ہے؟

ج: جب وہ خود فریبی میں مبتلا ہوجائے۔

فرحت منصور

س: محبت کی پہچان؟

ج: پرخلوص، بے لوث اور سچائی رہی سچائی۔

س: آپکی محفل میں شریک ہونے کی کوئی رسید؟

ج: دیکھ لیجیے آپ کو بغیر فیس کے ہی شامل کرلیا۔

یاسمین کنول

س: باجی آجکل کے زمانے میں لوگ سچ بات سننا پسند کیوں نہیں کرتے؟

ج۔ حقیقت سے فرار۔

کلثوم فرزانہ

س۔ خوشیاں کیسے حاصل کی جاسکتی ہیں؟

ج۔ جدوجہد کرکے۔

س۔ پریشانیوں سے کیسے نجات مل سکتی ہے؟

ج۔ خدا کو یاد کرکے۔

یاسمین مرزا

س۔ میں آپکی محفل میں پہلی مرتبہ شریک ہو رہی ہوں جگہ دیں گی نا؟

ج۔ بالکل دیں گے۔

وسیمہ عزیز

س۔ آجکل کی دنیا میں سچی محبت، دوستی، خلوص کیوں مٹ گئے ہیں؟

ج۔ آپ کیوں ناامید ہوتی ہیں ابھی تو بہت سے پیارے انسان اور پُرخلوص لوگ دنیا میں موجود ہیں۔

ایک ضروری اطلاع

آئندہ ماہ سے ذوالقرنین سوالوں کے جواب دینے پر تیار ہو گئے اس سے پہلے وہ ماہنامہ "کرن" میں "نہلے پے دہلا" کے عنوان سے بہت کرارے جواب دیتے چلے آرہے ہیں جو بہت پسند کئے جاتے ہیں امید ہے خواتین ڈائجسٹ میں ان کے جواب اسی ذوق وشوق سے پسند کئے جائیں گے۔

ادارہ

میری بیاض سے

رخسانہ علی
شکیب اپنے تعارف کیلئے یہ بات کافی ہے
ہم اُس سے بچ کے چلتے ہیں جو راستہ عام ہو جائے

فرزانہ کوثر
مقامِ عشق سے آگے بڑھے تو کیا نہیں پایا
خود اپنی ذات تھی سب کچھ سمجھتے تھے خدا جس کو

طلعت — بھکر
لے دے کے اپنے پاس اک نظر ہی تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم!

عروج قریشی — لطیف آباد
دل میں کانٹے سے چبھ رہے ہیں عدم
شاید اب موسمِ بہار آئے!

سیدہ نگہت نقوی — فیصل آباد
مطمئن اتنا کہ رہتا ہوں ہجوم شہر میں!!
مضطرب ایسا کہ سائے سے بھی ڈر جاتا ہوں میں

شاہینہ ودود
ذوقِ نظر کے دم سے گوارا ہے رنجِ زیست
خود کو بھی دیکھتے ہیں تماشہ سمجھ کے ہم

ثوبیہ ناہید
ہر دور دورِ پُر آشوب ہی سہی لیکن
زمانہ پہلے بھی کب کس کو سازگار ہوا۔

شفقت بشیر
اِس دورِ پُر فریب میں کس بے بسی کے ساتھ
ہم پتھروں میں کوئی خدا ڈھونڈتے رہے۔

تسنیم سلطانہ — ملتان
یہاں بھی عکس ہیں ٹوٹی ہوئی چٹانوں کی
ندیم ذات کے پاتال میں اُتر کے دیکھو!

نشاط اعجاز
مُڑ کے دیکھا تو دراڑیں تھیں کئی چہروں پر
آئینے میں تو ہر اک شخص حسین لگتا ہے!

مسرت نیازرانی — کوئٹہ
گونجوں گا تیرے ذہن کے گنبد میں رات دن
جس کو نہ تم بھلا سکو وہ گفتگو ہوں میں

فریدہ خان — جام پور
تم سے تمہیں کو مانگتے حوصلہ نہ تھا
خودداریوں نے راہ سے لوٹا دیا مجھے

غزلیا اعوان — میانوالی
کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا۔

بلقیس بھٹی — کراچی
خود بخود رنگ فسانوں کا بدل لیتی ہے
اُڑتے اُڑتے جو اگر بات جہاں تک پہنچے

رفعت قریشی — لطیف آباد
منزل کی تمنا ہے تو درکار ہے جرأت
ٹھوکر سے ہٹا دیتے اِس سنگ گراں کو

ایس زیڈ (بی اے) — مظفر گڑھ
بات کی جب کسی نے تلخ کلامی سے
اُس کی گفتگو کا ڈھب یاد آیا!

ناصرہ طیبہ بٹ — کوٹڑی
عجب حسن ہے تیری اداس آنکھوں میں
سکوت صبح ازل کا خیال آتا ہے۔

مسرت جبیں قادری
ہر اجنبی میں شباہت ہے آشناؤں کی!
بسی ہوئی ہیں نگاہوں میں صورتیں کیا کیا

نزہت انور — لاہور
مقدور بھر جو راہ کا پتھر بنے رہے
وہ لوگ یاد آتے ہیں اکثر دعاؤں میں

رومانہ شمیم
زندگی جس پہ ناز ہے اتنا
چند سانسوں کی اک کہانی ہے

روبینہ بٹ روبی — پشاور
اُمیر اُس کی ہے لامکاں تک رسائی
فرشتے سے بھی کچھ سوا ہے۔ آدمی!

قمر سلطانہ — میرپور خاص
تو میری ذات میری رُوح میرا حسن کلام
دیکھ اب تو نہ بدل گردشِ دوراں کی طرح

عذرا تاج — سکھر
اب اِس سے زیادہ جشنِ طرب اے فصلِ بہاراں کیا ہوگا
آنکھوں سے لہو تو جاری ہے اب اور چراغاں کیا ہوگا

گل سانگہ — سوات
خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی!
اس کے چہرے پہ لکھا تھا لوگو!!
اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا لوگو۔

زاہدہ ساجد — فیصل آباد
مجھے دار حرف پہ کھینچ دو جو میری انا کو کرے فنا
مجھے وہ اماں نہیں چاہیئے کوئی داستاں نہیں چاہیئے
جو ہوائیں چھو کے گزر گئیں انہیں بھول جاؤ کے دم گئیں
دلِ محترم کوئی اور غم غمِ رفتگاں نہیں چاہیئے

عدنان کے مشورے

نفسیاتی الجھنیں اور ازدواجی

ضروری نوٹ : مجھے ہر ماہ خواتین ڈائجسٹ اور حنا کی معرفت جو خطوط موصول ہوتے ہیں۔ ان کے جواب دونوں پرچوں میں دیئے جاتے ہیں۔ بہنوں کو چاہیئے کہ وہ جوابات کے لئے خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ ساتھ حنا بھی دیکھ لیا کریں۔

عدنان

ایک لڑکی میرے پاس آئی۔ اسے اس بات کا گمان تھا کہ زندگی میں کبھی ناکامی نہیں ملی۔ اس نے جو چاہا اسے حاصل کر کے رہی اور تعلیم کے میدان میں بھی ہمیشہ کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ اس نے اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہا اخبار میں ایک آسامی کے لئے اشتہار تھا۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ مجھے اس بات کا سو فی صد امکان تھا کہ ملازمت مجھے مل کر رہے گی اور آپ حیران ہوں گے کہ مجھے اس ملازمت کے لئے تقرری کا پروانہ مل گیا۔ اور آئندہ بھی جو میں چاہوں گی حاصل ہو کر رہے گا۔

میں نے اسے کہا۔ "اے بی بی آپ کی زندگی بہت عذاب سے گزرے گی۔ آپ اپنی زندگی کا ٹمپو نارمل رکھیں. آپ نے اپنی زندگی کی رفتار بہت تیز کر رکھی ہے۔"

مگر اسے ضد تھی، اصرار تھا، وہ مُصر تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے حقیقت یہی ہے۔

میں نے اسے سمجھایا کہ انسان کو زندگی میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیئے۔ کوشش فرض ہے۔ لیکن اپنے طور پر کوئی امید باندھ لینا، کوئی بات فرض کر لینا کسی صورت درست نہیں۔ کیونکہ اگر انسان کسی معاملے میں پوری امید باندھ لے اور خدانخواستہ اس معاملے میں ناکامی ملے تو زندگی بڑے عذاب سے گزرتی ہے۔ اور انسان ذہنی طور پر پریشان ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ہر آدمی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی معاملے میں ناکام ضرور ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ دعوے نہیں کر سکتا کہ وہ ہر لحاظ سے خاطر خواہ اور مکمل ہے جیسے جسمانی صحت میں کوئی شخص کامل نہیں۔ اسی طرح ذہنی صحت میں بھی کوئی آدمی کمال کے دعوے نہیں کر سکتا۔ جسمانی بیماری کی بھی تشخیص ہو جاتی ہے۔ اس طرح ذہنی بیماری کی بھی تشخیص ہے۔ جسمانی بیماری کے انسان کا جسم معمول کے مطابق کام نہیں کرتا اور ذہنی بیماری میں انسان کا ذہن معمول سے ہٹ کر کام کرنا شروع کرتا ہے۔

ذہنی بیماریاں یا تو بہت شدید قسم کی ہوتی ہیں یا معمولی نوعیت کی۔ زیادہ شدید بیماریوں کی صورت میں لوگ علاج کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں۔ لیکن معمولی صورت میں معمولی علاج سے افاقہ ہو جاتا ہے۔ بیماری معمولی ہو تو عام ڈاکٹر بھی علاج کر لیتا ہے۔ لیکن شدت کی صورت میں ماہر سے ہسپتال سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

بعض لوگوں کو بھوک کم لگتی ہے۔ بھوک کم لگنے کی صورت میں غذا یا خوراک کم ہو جاتی ہے۔ غذا یا خوراک

ہیں کمی کی وجہ سے جسم کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جسم کی کمزوری سے ذہنی امراض پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی سی تھی۔ بھوک کی کمی اور بھوک کی کمی کی وجہ سے خوراک کی کمی۔ اس نتیجے میں جسم کا کمزور ہونا ضروری ہے۔

ایک شخص چھ سات دن ملیریے کا شکار رہا۔ چھ دن وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیا بیماری ہے؟"
مریض نے کہا۔ "بخار ہے لیکن بخار کی تو پرواہ نہیں ہے لیکن کمزوری بہت ہے۔ اتنی کمزوری ہے کہ چلنا مشکل ہے۔"
ڈاکٹر نے پوچھا۔ "ان چھ دنوں میں کیا کھایا؟"

مریض نے کہا۔ "کچھ بھی نہیں کچھ کھایا ہی نہیں جاتا۔ کسی چیز کو جی ہی نہیں چاہتا۔"
ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آخر کچھ تو کھایا ہوگا؟"
مریض نے سوچ سوچ کر کہا۔ "ایک دن دو ٹوسٹ کھائے تھے۔ آج صبح ایک کپ چائے۔ ایک دن اور ایک ٹوسٹ کھایا تھا۔ بس کچھ کھایا ہی نہیں جاتا۔ کمزوری بہت ہے۔"
ڈاکٹر نے کہا۔ "بھلے آدمی! جو خوراک تم نے چھ دن میں کھائی یہ کسی ایک تندرست آدمی کو کھلاؤ تو چھ دنوں کے بعد اس سے بھی چلا نہیں جائے گا۔ تم تو بیمار بھی ہو۔ تمہیں تو بخار بھی ہے۔
میرا مشورہ یہ ہے کہ کباب اور بھنا گوشت کھاؤ یا ڈبل روٹی اور دودھ، پھل اور دوسری چیزیں کھاؤ۔ پھر میرے پاس دوائی کے لئے آنا۔
یہ تو تھا معمولی بیماریوں کا تذکرہ۔
شدید ذہنی بیماریوں میں انتہائی پژمردگی کا دور آتا ہے یا دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ بعض اوقات شک کا روگ یا زبردست احساسِ کمتری یا احساسِ برتری کا شکار ہو جاتا ہے۔
ایسی صورت میں ضروری ہے کہ کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کیا جائے کیونکہ تحلیلِ نفسی کے بغیر اصل بیماری کی جڑ کا معلوم ہونا ممکن نہیں۔

نوریں

اچھی بہن! اگر سکون آرام صرف بنگلے، کاریں، ایئر کنڈیشن کمرے ہوتے تو سارا سکون، آرام صرف امیروں کے حصے میں آجاتا۔ اور مکانوں یا کوارٹروں میں رہنے والے لوگوں کے حصے میں خوشیاں نہ آتیں۔ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ خاندان کا اچھا برا ہونا اس بات سے شمار ہوتا ہے کہ کتنے بڑے پلاٹ پر بنگلہ ہے یا کس علاقے میں ہے۔ اصل چیز انسان کا انسان ہونا ہے۔ شرافت بڑی چیز ہے اور پھر انسان ترقی کرتا رہتا ہے۔ آج ایک علاقے میں رہائش ہے کل اس سے بہتر علاقے میں ہو سکتی ہے۔
پھر شکل و صورت کا معاملہ ہے۔ میرے نزدیک شکل و صورت بھی ثانوی چیزیں ہیں۔ اصل چیز انسان کا دل ہے۔ دل کتنا روشن ہے؟ دیکھنے کی چیز یہ ہے اور میرا مشاہدہ یہ ہے کہ زیادہ خوبصورت لوگوں کی زندگی زیادہ آرام سے نہیں گزرتی۔
تو مئی میں شادی ہے میری طرف سے مبارکباد۔

ایک بدنصیب عورت

عدنان بھائی!
السلام علیکم۔ میں بیحد پریشان ہوں۔ میں نے آپ سے اپنا مسئلہ "ایک بدنصیب عورت" کے نام سے لکھا تھا۔ ہم جیسی عورتیں جو کسی سے اپنا دکھ درد بیان نہیں کر سکتیں۔ آپ کو بھائی سمجھ کر سب کچھ بیان کر دیا۔ خدارا آپ

ضرور اپریل کے شمارے میں جواب دیں۔ آپ جو دُکھی دلوں کے لئے ہمدردی کا پھاہا رکھتے ہیں خدا آپ کو اس کی جزا دے گا۔ یہ میرا آپ کو تیسرا خط ہے۔ میں بے حد پریشان ہوں۔
ج۔ پہلے خط سامنے نہیں ہیں۔ بہر حال تفصیل لکھ بھیجیں تو جواب دوں گا۔

ضرورت رشتہ

ایک معزز قریشی مغل متوسط خاندان پنجابی لاہور کی بیوہ بے سہارا مطلقہ لڑکی بغیر اولاد عمر ۲۱-۲۲ سال خوبرو۔ نیک سیرت بلند کردار ویل کلچرڈ خوش لباس بااخلاق سنجیدہ ماہر خانہ داری و دستکاری و پابند صوم صلوٰۃ مہذب اور بڑی سلجھی ہوئی تعلیم میٹرک تک رنگ گندمی قد درمیانہ جسامت پتلی کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ سول یا ملٹری آفیسر ڈاکٹر انجینئر یا اعلیٰ پیمانے کا تاجر کنوارا یا رنڈوا، بغیر اولاد کا موزوں رشتہ درکار ہے فوراً مکمل کوائف معرفت بکس نمبر ۱، خواتین ڈائجسٹ اُردو بازار کراچی ۱ لکھیں۔

یاسمین

جی ہاں سب کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا پہلی پریشانی۔ بازار میں عام جنرل اسٹور ز پر میڈیکل اسٹورز پر کریمیں ملتی ہیں ان میں ہیٹرا یو اور ویٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طریقہ استعمال نہایت آسان ہے اور ہر کریم کے ساتھ لکھا ہوتا ہے۔

اختر

آپ کے خط سے پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے لکھا گیا۔ جب تک شہر یا جگہ کا نام نہ معلوم ہو۔ اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہوں!

شہانہ

شہانہ بہن! زندگی میں بعض اوقات عجیب مقامات آجاتے ہیں لیکن ایسے مقامات پر اگر انسان جذبات میں بہہ جائے تو سخت نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں ایک بات کا اندازہ تو آپ کو ہو گیا کہ آپ کے والد آپ کو چاہتے ہیں لیکن مجبوریوں کی وجہ سے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں نہیں کر پاتے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ تحمل سے کام لیں آپ ایسی کوئی بات نہ کریں جو آپ کے والد کے لئے پریشانی کا باعث بنے لڑکیاں تو یوں بھی پرایا دھن ہوتی ہیں جن کو بہر حال باپ سے دور ہی زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ جب تک وہ کوئی بہتر راستہ، بہتر حل نہیں نکالتے آپ اس وقت تک کے لئے خاموشی اختیار رکھیں۔

ایک غم زدہ بہن

جو شعر آپ نے لکھا ہے وہ بے وزن ہے ان سے کہئے کہ وزن میں شاعری کریں یا کسی سے اصلاح لیا کریں جب وہ شاعری میں اصلاح دیں تو مجھے امید ہے کہ خود ان کی اصلاح ہو جائے گی۔

س۔م۔ پشاور

اس عادت کو ترک کر دیں۔ کسی علاج کی ضرورت نہیں دراصل اگر انسان یہ محسوس کرے کہ اس سے کوئی غیر قدرتی فعل یا گناہ سرزد ہوا ہے تو اس کا اثر اس کے ذہن پر پڑتا ہے۔ ذہنی تکلیفوں اور بیماریوں "چاہے وہ بلا وجہ کی ہوں" کا اثر انسانی جسم پر اور انسانی جسم کمزوری محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ بات اکثر اوقات کچھ نہیں ہوتی یا بہت معمولی ہوتی ہے یا پھر اس کے بارے میں ہم کچھ جانتے نہیں ہوتے۔۔۔ یا کسی سے پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے یا بتانے والے کو خود کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ بہر حال آپ بالکل نارمل ہیں اب تک کوئی خرابی نہیں ہوئی۔ لیکن اس عادت کو ترک کر دیں اگر آپ نے اس عادت کو ترک نہ کیا تو کسی نہ کسی خرابی کے امکانات ضرور ہیں۔

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے

مہناز عبدالعزیز ۔ کراچی

س: پیاری باجی! میری عمر ۱۲ سال ہے۔ قد پانچ فٹ ایک انچ وزن ۹۵ پونڈ، میری کمر ۲۶ انچ ہے کیا میری عمر اور قد کے لحاظ سے میرا وزن ٹھیک ہے۔ کیونکہ گھر میں سب مجھے موٹی کہہ کر پکارتے ہیں اور کیا میری کمر بہت موٹی ہے، اگر ہے تو کوئی ہلکی پھلکی ورزش بتا دیں۔

باجی ایک بات اور ہے وہ یہ کہ میں روزانہ دانت برش کرتی ہوں پھر بھی میرے دانتوں میں پیلا پن اور میرے منہ سے بدبو آتی ہے جس کی وجہ سے میں بات کرتے ہوئے شرماتی ہوں۔

ج: آپ کا عمر کے لحاظ سے وزن وغیرہ سب ٹھیک ہے کمر کے لیے آپ ورزش کریں، کھڑے کھڑے کمر کو گول گھمایا کریں اور دانتوں کے لیے سونے سے پہلے آپ سرسوں کے تیل میں نمک ملا کر دانتوں پر ملا کریں اور دن میں دو تین مرتبہ سونف چبایا کریں جلد ہی دانتوں کی پیلاہٹ اور منہ کی بدبو دور ہو جائے گی۔

بینا ۔ ملتان

س: باجی میرے منہ پر اکثر کیل وغیرہ نکلتے ہیں (STILLMAS) کے استعمال سے اب کیل نکلنا بند ہو گئے ہیں۔ باجی آجکل میں بادام کھا رہی ہوں کیا بادام کھانے سے کیل دوبارہ تو نہیں نکل آئیں گے۔ باجی مجھے جنوری ۱۹۷۸ء کا شمارہ درکار ہے کیا وہ مجھے مل سکتا ہے؟

ج: آپ کسی ڈاکٹر سے رجوع کریں اور ہفتہ میں دو تین مرتبہ کھیری کو میتھی کی سبزی اور پسے ہوئے زیرے میں پکا کر کھائیں اس سے کافی فرق پڑے گا۔

مہاسے کے لیے آپ BATNOVATE-N کریم استعمال کریں۔

جنوری کا شمارہ دفتر کو خط لکھ کر منگوا لیں۔

رفعت خانم ۔

س: باجی میرا وزن کافی بڑھ گیا ہے۔ خاص طور پر کولہے کافی بھاری ہو گئے ہیں۔ میری عمر سولہ سال ہے۔ باجی برائے مہربانی مجھے کوئی ورزش بتا دیں — چاول اور بادی چیزوں سے مکمل پرہیز کر رہی ہوں۔

ج: آپ مندرجہ بالا جواب پر عمل کریں۔

شمع ۔ کراچی

س: باجی آپ سے ایک مشورہ چاہیئے۔ باجی میرے ہونٹ بالکل کالے ہو گئے ہیں۔ میں اس وجہ سے بہت پریشان ہوں باجی آپ میری اس پریشانی کو دور کر دیں اور کوئی آسان سا گھریلو نسخہ بتا دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ اور رنگ صاف کرنے کا بھی کوئی نسخہ بتا دیں۔

ج: آپ لیموں کا چھلکا ہونٹوں پر ملا کریں چند ہی روز میں کالا پن ختم ہو جائے گا۔ رنگ کے لیے آپ کوئی اچھا اُبٹن استعمال کریں۔

شاہین سلیم خان ۔ کوٹ ادو

س: میں بھی آپ کے پاس ایک مسئلہ لے کر آئی ہوں وہ یہ ہے کہ پہلے میرے بال بہت لمبے تھے اور گھنے بھی تھے مگر اب بہت جھڑنے لگے ہیں خشکی بھی بہت ہو گئی ہے۔ اور بال بہت ہی کم ہو گئے ہیں میں نے بہت سے تیل لگائے مگر فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کوئی گھریلو نسخہ بتا کر مشکور فرمائیں۔

ج: بہن! آپ اپنے بالوں کے لیے گلوبرائل منگوا کر اس سے بال دھوئیں تو خشکی بالکل نہیں رہے گی۔ اور بالوں کے گھنے ہونے کے لیے سوہنی ہیئر آئل بذریعہ V-P منگوا کر استعمال کریں۔

شہناز فیضی کراچی

س:۔ باجی میں اپنے بالوں کی وجہ سے سخت پریشان ہوں ایک تو میرے بال گھنے نہیں ہیں بہت کم ہیں اور بہت باریک بال ہیں
دوسرے یہ کہ بال گرنے بہت لگے ہیں۔ کنگھی میں اس قدر بال اترتے ہیں کہ سوچتی ہوں کہ ایک روز ایسا نہ آئے کہ ایک بال بھی نہ رہے سر پر۔ پلیز میرے بالوں کے لیے کوئی اچھا سا مفید مشورہ عنایت کریں تاکہ میری پریشانی دور ہو اور بال گھنے ہو جائیں اور جھڑنے سے رک جائیں۔ شکریہ۔
دوسری بات یہ ہے کہ میرا وزن بہت کم ہے وزن متوازن کرنے کے لیے کوئی دوا یا خوراک بتایئے مشکور ہوں گی۔

ج:۔ شہناز فیضی صاحبہ
آپ بالوں کے لیے سوہنی ہیئر آئل منگائیں انشاء اللہ بال گرنے بند ہو جائیں گے۔ سوہنی ہیئر آئل گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔ بال لمبے، گھنے اور چمکیلے کرتا ہے۔ ملنے کا پتہ بیوٹی بکس نمبر ۷۷۳ کراچی۔

محمد الیاس جعفر۔ بلوچستان

س:۔ عرض یہ ہے کہ ایک عدد سوہنی ہیئر آئل بذریعہ وی پی جلد از جلد روانہ فرمائیں۔ امید کرتا ہوں کہ جلد روانہ فرمائیں گی۔ میں بہت پریشان ہوں میرے بال بہت تیزی سے گرتے ہیں۔ اگر چند مہینے یہی حال رہا تو میں سر کے بالوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ کنگھی کرتے وقت ڈھیروں کے حساب سے بال گرتے ہیں، کیا سوہنی ہیئر آئل اس پریشانی کا حل ہے۔ میری عمر ۱۹ ر سال ہے۔ آپ براہ کرم مجھے سوہنی ہیئر آئل جلد روانہ کریں جتنی قیمت ہو گی ادا کر دوں گا۔ شکریہ۔

ج:۔ محترم! آپ کو ہم بذریعہ وی۔ پی سوہنی ہیئر آئل بھیج دیں گے۔ انشاء اللہ اس کے استعمال سے آپ کو فائدہ ہو گا۔